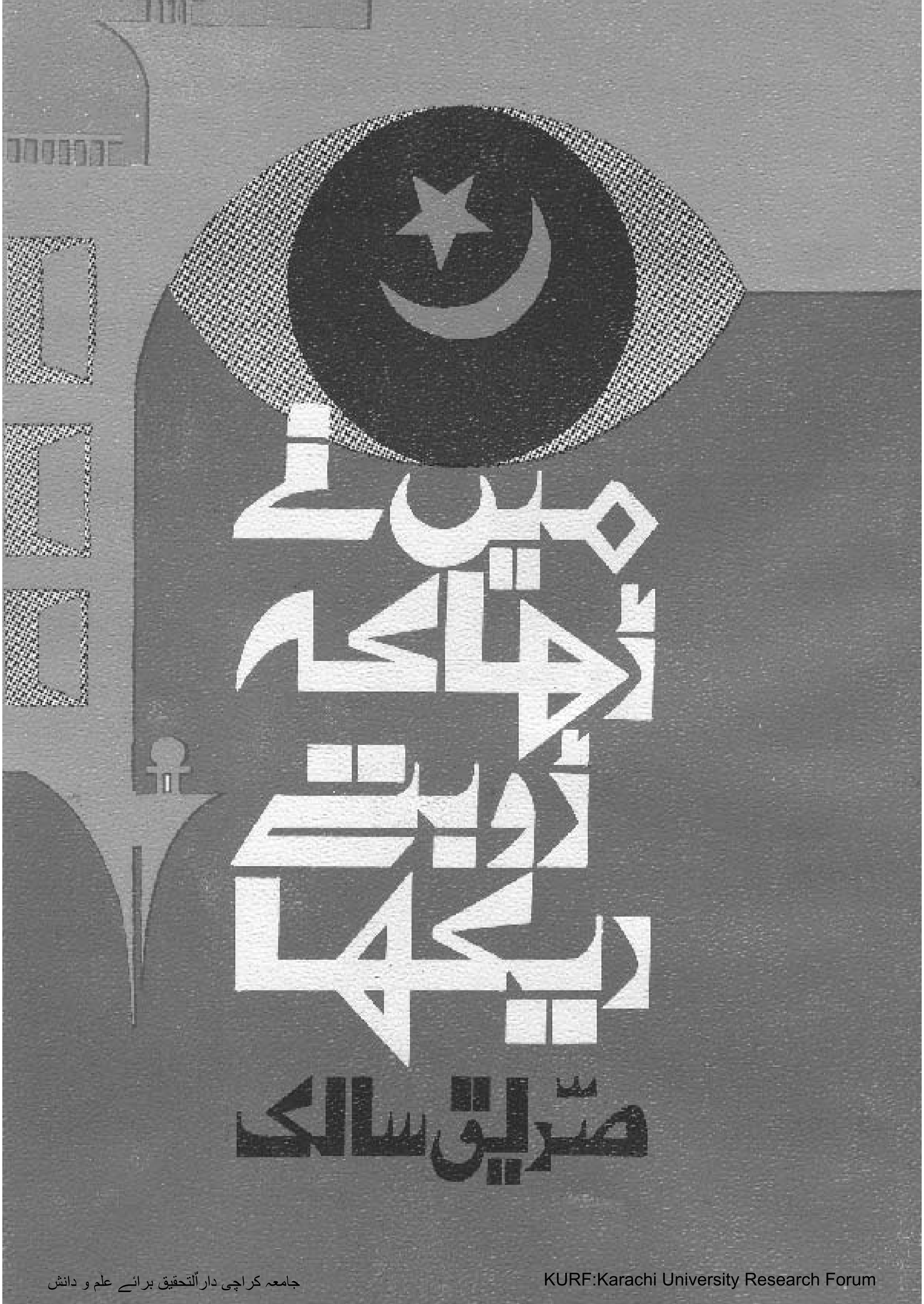

میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا
صدیق سالک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

یہ میری انگریزی کتاب[1] کا اُردو ایڈیشن ہے۔ جب ہماری شکست کی یہ عینی شہادت ۱۹۷۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی، تو کئی حلقوں نے اصرار کیا کہ اس کا اُردو ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اہلِ وطن کو بھی پتہ چل سکے کہ یہ تُند و تیز آندھی کدھر سے آئی، کیسے آئی اور کیوں آئی؟

بعض دوستوں نے مجھے خبردار کیا کہ "ہمہ یاراں دوزخ" کے بعد اُردو میں کوئی کتاب چھاپنے سے احتیاط کرنا؛ ورنہ تمہارا حال بھی اُن ادیبوں جیسا ہوگا جو اپنی پہلی تخلیق سے اپنا نام چمکاتے، مگر دُوسری سے گہنا لیتے ہیں۔ مَیں اس انتباہ کے باوجود یہ کتاب چھاپ رہا ہوں کیونکہ ایک طرف قومی ضرورت ہے اور دُوسری طرف ذاتی شہرت۔ ظاہر ہے کہ اس تناظر میں ذات ہی کو مات ہونی چاہیے۔ دوستانہ مشورے کو نظرانداز کرنے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں قاری بہت ذہین ہوتا ہے، وہ اَدب پارے اور تاریخی مواد میں فرق جانتا ہے۔ وہ کبھی پھولوں کی خوشبو اور اُن کی نباتاتی ساخت کا مقابلہ نہیں کرتا۔

مَیں نے اس کتاب کو اَدب سے دُور اور تاریخ کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ مَیں سمجھتا ہُوں کہ اگر مَیں تاریخی واقعات پر اَدبی خول چڑھانے بیٹھ جاتا، تو خول تو شاید چمک اُٹھتا، مگر حقائق ماند پڑ جاتے، اس لیے مَیں نے ساری رُوداد سیدھے سادے انداز میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کہیں کوئی اَدبی جملہ آ گیا ہے، تو اس کی حیثیت میری نظر میں اندھیری رات میں تنہا ستارے جیسی ہے جو چمکتا تو ہے، مگر اس سے تاریکی کم نہیں ہوتی۔

میری انگریزی کتاب کو اُردو میں منتقل کرنے میں میجر سیّد ضمیر جعفری اور فضلِ عظیم صاحب نے میری مدد کی ہے۔ ان کا طرزِ نگارش اتنا خوبصورت اور منفرد ہے کہ انہوں نے جن جن حصّوں کا ترجمہ کیا، وہ انہی کے رنگ میں رنگا گیا؛ چنانچہ میں نے ساری کتاب کو ایک ہی اسلوب میں ڈھالنے کے لیے ان مہربانوں کے لفظوں کی لڑیوں کو توڑ دیا ہے۔ اس تخریبی کارروائی سے یہ فائدہ ہُوا ہے کہ کتاب اب پہلے صفحے سے لے کر آخر تک سراسر میرے اپنے اسٹائل میں ہے۔

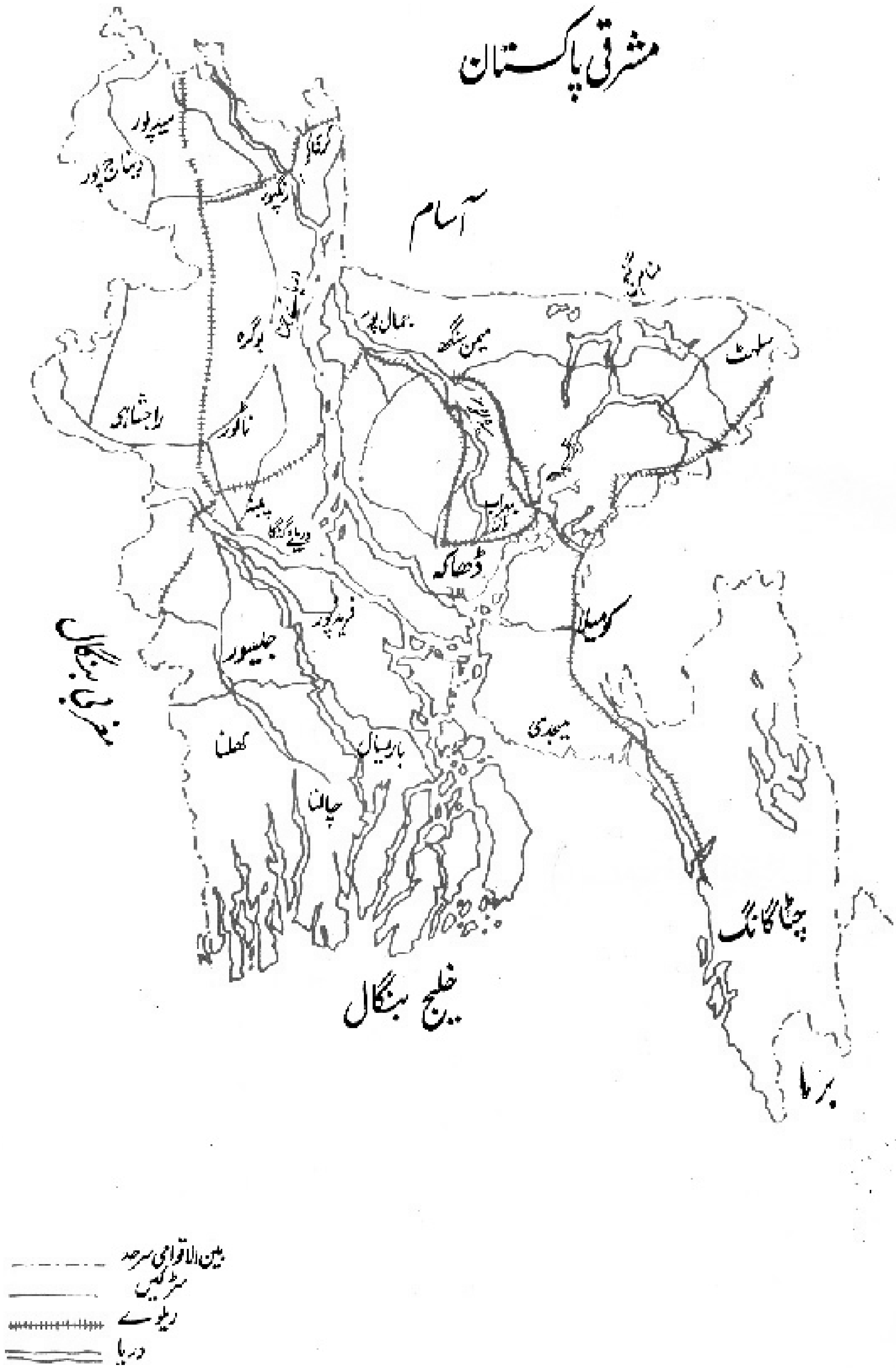
اس کتاب کے چھپنے سے اہلِ وطن کے اُردو داں طبقے کو پہلی دفعہ بعض حقائق کا علم ہوگا لیکن مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں المیۂ مشرقی پاکستان سے متعلق تمام سچائیاں سمو دی گئی ہیں۔ مَیں نے تو حقیقت کا صرف وہ رُخ پیش کیا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اگر کوئی صاحب حقیقت کے دُوسرے رُخوں سے پردہ سرکا سکیں، تو یہ یقیناً قومی خدمت ہوگی۔

صدیق سالک

راولپنڈی

---

[1] Witness to Surrender



مشرقی پاکستان
آسام
سید پور
دیناج پور
رنگپور
بوگرہ
راجشاہی
ناٹور
جمال پور
میمن سنگھ
سلہٹ
ڈھاکہ
کومیلا
فرید پور
جیسور
کھلنا
باریسال
چالنا
میجدی
چٹاگانگ
برما
مغربی بنگال
خلیج بنگال
بین الاقوامی سرحد
سڑکیں
ریلوے
دریا

باب ۱

دو جان یک قالب

پاکستان میں دوسرے ملک گیر مارشل لا کی پہلی سالگرہ تھی[1]۔ شیخ مجیب الرحمٰن ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے صوبے کے اندرونی علاقے میں جا رہے تھے۔ ان کی کھڑکھڑاتی کار کی پچھلی سیٹ پر ان کے ساتھ ایک بنگالی صحافی بیٹھا تھا جو شیخ صاحب کی انتخابی مہم کی خبریں اپنے اخبار کو بھیجتا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں انہیں کسی نازک سیاسی مسئلے پر چھیڑا اور چپکے سے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بعد میں وہ یہ ٹیپ سنا کر دوستوں کی تواضع کیا کرتا تھا۔ اس نے یہ ٹیپ مجھے بھی سنایا۔ مجیب کی جانی پہچانی اور گرجدار آواز صاف سنائی دے رہی تھی :

"ایوب خاں نے مجھے مقبولیت کی ایسی معراج پر پہنچا دیا ہے کہ اب کوئی شخص میری مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا — کوئی شخص مجھے 'نہ' نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ یحییٰ خاں بھی میرے مطالبات کو رد نہیں کر سکتا۔"

مجیب کے مطالبات اور عزائم کیا تھے؟ اس کی نشاندہی ایک اور ٹیپ سے ہوتی ہے جو یحییٰ خاں کے محکمہ سراغرسانی نے چوری چھپے تیار کیا تھا۔ اس میں مجیب کی آواز بند تھی۔ موضوع تھا ایل ایف او[2]۔ یہ قانونی ڈھانچہ عملاً ایک دستوری خاکہ تھا جس میں قومی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کی وہ شقیں جو چھ نکات کی راہ میں حائل ہوتی تھیں مجیب کو سخت ناپسند تھیں۔ اس دستوری خاکے کے متعلق مجیب نے انجانے میں اپنے قریبی حلقوں میں حسب ذیل رائے کا اظہار کیا تھا :

"میرا مقصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل ایف او کو پرزے پرزے کر دوں گا کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ٹک سکے۔"

جب یحییٰ خاں نے یہ الفاظ سنے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا فوری ردعمل یہ تھا : "اگر اس نے مجھے دھوکا دیا تو میں اس کو سیدھا کر دوں گا۔"

مجیب اور یحییٰ کے یہ خیالات بعد کی باتیں ہیں۔ ان کا صحیح پس منظر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بات جنوری ۱۹۷۰ء سے شروع کی جائے جب میں پہلی بار دو سال کے لیے ڈھاکہ گیا۔

میں جب راولپنڈی سے ڈھاکہ روانہ ہوا تو رخت سفر بڑا مختصر تھا، مگر میرے ذہن میں خیالات کا وزن بہت بھاری تھا۔ یہ خیالات

---

[1] تفصیلات اور سیاسی پس منظر کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۱

[2] ایل ایف او LEGAL FRAME WORK ORDER قانونی ڈھانچہ جو آئین کی عدم موجودگی میں جنرل یحییٰ خاں نے ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو جاری کیا۔

ملکی سالمیت سے متعلق تھے مگر اس وقت مجھے اس سلسلے میں ہندوستان کی امکانی جارحیت کی بجائے اندرونی سیاست کے مدّوجزر کا زیادہ احساس تھا کیونکہ مغربی پاکستان میں جہاں میں نے بیس پچیس سال گزارے تھے، یہ تاثر عام تھا کہ مجیب کے چھ نکات "علٰحدگی کی ڈرپ" اسکیم کا دُوسرا نام ہے اور بعض حلقوں میں یہ بات بھی اکثر سُننے میں آئی تھی کہ ۱۹۶۸ء کی اگرتلا سازش بھی اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام تھا۔ ان باتوں میں کہاں تک صداقت تھی اور کہاں تک تعصب، اس کا مجھے علم نہ تھا، مَیں نے سوچا کہ بنگالی بھائیوں سے براہ راست مِلوں گا، تو صورتِ حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

اُن دنوں مشرقی پاکستان میں پچیس ہزار کے لگ بھگ فوجی تعینات تھے۔ مَیں سرکاری فرائض کے سلسلے میں انہی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مگر ۰۰۰,۸۰ کلومیٹر میں پھیلے ہُوئے وسیع ہندوستانی علاقے کے اُوپر پرواز کرتے ہُوئے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ کر دیا، تو کیا یہ پچیس ہزار فوجی مؤثر طور پر مشرقی پاکستان کا دفاع کر سکیں گے؟

مَیں ایک "سچّے" پاکستانی کی طرح ان خیالات سے آنکھیں بچانے کے لیے ماضی کی ان بوسیدہ دلیلوں میں پناہ ڈھونڈھنے لگا کہ "آل انڈیا مُسلم لیگ کی بُنیاد ڈھاکہ ہی میں تو رکھی گئی تھی ... "قراردادِ پاکستان جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہُوئی، ایک بنگالی لیڈر ہی نے تو پیش کی تھی ..." پھر ڈر کا ہے کا؟

انہی خیالات کے جھُرمٹ میں مَیں تیج گاؤں (ڈھاکہ) ایئرپورٹ پر اُترا۔ زمین پر سبزے کے قالین بچھے تھے اور آسمان پر نقرئی بادل مُسکرا رہے تھے۔ بدلیاں تو بہت تھیں مگر بکھری بکھری۔ ان کی اوٹ اتنی گھنی اور گہری نہ تھی کہ ہنستے ہُوئے سُورج کا چہرہ مکمل طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ۔۔۔ فضا معتدل سی اور ماحول سکون آمیز سا!

میرے ساتھ اسی جہاز سے بعض فوجی افسر اترے جو مارشل لا ڈیوٹی سے متعلق تھے۔ وہ کسی اور ہی ہوا میں تھے، دندناتے ہُوئے وی آئی پی لاؤنج میں گئے اور گہرے اور دبیز صوفوں میں سستانے لگے۔ باہر بنگالی قُلی ہانپتے کانپتے ان کا سامان گورنمنٹ ہاؤس کی نقرئی پلیٹوں والی گاڑیوں میں لادنے لگے۔ آناً فاناً وہ باہر نکلے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر ایئرپورٹ سے نکل گئے۔

مَیں دوسرے برآمدے میں کھڑا کسی مناسب سواری کا انتظار کرنے لگا (راستے میں جہاز کی خرابی کی وجہ سے مَیں نے فلائٹ بدل لی تھی مگر اس کی اطلاع ڈھاکہ نہ پہنچا سکا تھا)۔ تھوڑی دیر بعد ایک فوجی جیپ میرے قریب آ کر رُکی۔ حوالدار نے مجھے سمارٹ سا سیلوٹ کیا اور پاس سے گزرتے ہُوئے ایک بنگالی لڑکے کو بھبک دار لہجے میں حکم دیا: "صاحب کا اٹیچی کیس جیپ میں رکھو"

سہمے ہُوئے لڑکے کو یہ بھبک ناگوار تو گزری مگر اپنے "آقا" پر ایک احتجاجی نگاہ ڈالتے ہُوئے حکم بجا لایا۔ اس نے گھُور کر میری طرف بھی دیکھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے چوکھٹے میں سفید سفید آنکھیں وحشت کا احساس لیے ہُوئے تھیں۔ مَیں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند سکّے اس غریب لڑکے کو دینا چاہے، مگر حوالدار نے پُرزور لہجے میں کہا: "سر! ان حرامزادوں کی عادت نہ بگاڑیے۔" مَیں نے مشورہ مان لیا ــــ اور بنگالی لڑکا ایک بار پھر نفرت بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہُوئے وہاں سے چلا گیا۔

ایئرپورٹ کی بلند و بالا عمارت پر پرچم ستارہ و ہلال پُوری آب و تاب سے لہرا رہا تھا۔

مَیں چھاؤنی روانہ ہو گیا۔

جو دوست مجھے ایئرپورٹ پر لینے نہ پہنچ سکے تھے، شام کو آفیسرز میس میں آئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اپنی غیر حاضری کی معافی مانگنے لگے۔ رسمی گفتگو کے بعد مشرقی پاکستان کی صورتِ حال زیرِ بحث آئی تو انہوں نے اس "غیر مناسب" موقع پر جبکہ حالات دگرگوں ہو رہے ہیں، مشرقی پاکستان

میں تقرری پر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ پند و نصائح سے بھی نوازا۔ نمونے کے چند موتی حاضر ہیں:

"یہاں عملی طور پر مارشل لاء کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

"گھرداری کے لیے ہرگز بھاری بھاری چیزیں نہ خریدنا، کیا معلوم کب اور کن حالات میں یہاں سے بستر اگول کرنا پڑے۔"

"اپنا روپیہ پیسہ شہر کے کمرشل بنک کے بجائے چھاؤنی کے نیشنل بنک میں رکھوانا۔"

"اور ہاں! اپنے پیش رو کے فلیٹ ہی میں ٹکے رہنا۔ یہ صندوق نما فلیٹ بڑا محفوظ ہے۔ اس میں کوئی شرپسند آسانی سے بم نہیں لڑھکا سکتا۔"

میرے خیال میں یہ سب وہم تھے ورنہ کسی بنگالی کو کیا پڑی ہے کہ میرے گھر میں بم پھینکے۔ بصورت حال خراب سہی مگر اتنی تو نہیں کہ شعلے اچانک بھڑک اٹھیں۔

میں نے دوستوں کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے "کنبہ" یعنی بیوی بچوں کو بلوانے کے لیے تار بھیج دیا۔ چند روز میں وہ پہنچ گئے تو انہیں اپنے مورچہ نما فلیٹ میں متمکن کر دیا۔ بچوں کے آتے ہی اگلے روز بنگالیوں کا ایک ہجوم ہمارے گھر پر ٹوٹ پڑا، مگر وہ شرپسند نہ تھے محض محنت مزدوری کرنے والی عورتیں تھیں جو "آیا" کے طور پر ملازمت کرنے کی خواہش مند تھیں۔ بنگالی عورتیں مغربی پاکستانیوں کے گھروں میں ملازمت کو ترجیح دیتی تھیں جیسے تقسیم ہند سے پہلے ہندوستانی خانسامے اور بیرے کسی انگریز کے ہاں نوکری کو بہتر سمجھتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ میری بیوی نے دو نوکرانیاں ملازم رکھ لی ہیں۔ بظاہر یہ سراسر فضول خرچی تھی مگر جب بیوی سے جواب طلبی کی تو وہ کہنے لگی "فکر نہ کیجیے ان دونوں کی تنخواہ ہمارے راولپنڈی والے واحد ملازم کی تنخواہ سے کم ہوگی۔" میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا۔

گھر آباد کرنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پڑی تو میں ڈھاکہ سے ۱۴ کلومیٹر دور ٹونگی میں پاکستان سرامک انڈسٹریز گیا۔ راستے میں افلاس اور ناداری کے ایسے ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ ملازمت کے لیے ماری ماری پھرتی "آیاؤں" کی بے چینی سمجھ میں آگئی۔ راستے میں جو عورتیں نظر آئیں ان کے پاس ستر پوشی کے لیے چند چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مرد دکھائی دیے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ تھے۔ ان کی سیاہ جلد میں منڈھی ہوئی پسلیاں چلتی گاڑی سے بھی گنی جا سکتی تھیں۔ بچوں کی حالت بڑوں سے بدتر تھی۔ ان کی ہڈیاں کمزور اور جسم نحیف تھے۔ کمزور ٹانگوں کے اوپر ابھری ہوئی توندیں باہر کو امڈ رہی تھیں۔ بعض بچوں کی کمر کے گرد ننھا سا دھاگا بندھا تھا جس سے ایک گھنٹی لٹک رہی تھی یہ ان کا واحد کھلونا تھا۔

راستے میں جہاں جہاں رکا بھک منگوں کے غول کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی معاشی بدحالی کے بارے میں سنی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا ___ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔

مجھے خیال ہونے لگا کہ چند روز پہلے میرے دوست شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کیونکہ اگر یہ بھوکے ننگے لوگ انبوہ در انبوہ مشتعل ہو جائیں تو واقعی بازار لوٹ سکتے ہیں، چھاؤنی پر ہلہ بول سکتے ہیں ___ اور میرے گھر میں بم بھی پھینک سکتے ہیں۔

فیکٹری کے دروازے پر ایک لمبا تڑنگا آدمی ملا۔ وہ کوٹ پتلون پہنے تھا اور وضع قطع سے پنجابی لگتا تھا۔ اس نے بھی میرے خدوخال سے میرے علاقائی تعلق کا اندازہ لگا لیا۔ وہ مسٹر نیازی تھا جو فیکٹری میں سیکورٹی اسسٹنٹ کا کام کرتا تھا۔ بڑے تپاک اور محرمانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔ جب میں نے وہاں آنے کا مقصد بتایا تو کہنے لگا: "میری مانیے تو برتنوں کا آرڈر خود نہ دیجیے، یہاں کے بنگالی مزدور مغربی پاکستان کے افسروں سے کد رکھتے ہیں۔ ان کے آرڈر کے برتن بھی جان بوجھ کر خراب کر دیتے ہیں۔ آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجیے ___"

ڈھاکہ واپس پہنچ کر میں نے دن بھر کے تجربات ایک پرانے پنجابی دوست سے بیان کیے — خاص طور پر غربت کے دردناک مناظر کا ذکر بڑے پُراثر انداز میں کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اُلٹا بنگالیوں کو ان کی کاہلی اور نااہلی کے لیے کوسنے لگا۔ اس نے نفرت آمیز انداز میں کہا "یہ صرف ایک کام میں طاق ہیں — اور وہ ہے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی بے دریغ خلاف ورزی! ... آپ ان کی غربت کا اتنا اثر نہ لیں، میں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کسی دن شہر (ڈھاکہ) لے چلوں گا۔"

کیپٹن چودھری واقعی اپنی پہلی فرصت میں مجھے گاڑی پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ پہلے ہم شہر کے شاندار علاقوں میں گھومتے رہے جن میں اسٹیٹ بنک، گورنمنٹ ہاؤس، ہائی کورٹ، انجینیئرز انسٹیٹیوٹ، ریلوے اسٹیشن، یونیورسٹی کیمپس، بیت المکرم، اسٹیڈیم، نیو مارکیٹ اور ایسی ہی بارُعب عمارتیں شامل تھیں — ان عمارتوں کا چکر لگانے کے بعد کیپٹن صاحب نے اہانت آمیز لہجے میں کہا: "پہلے یہاں کچھ بھی نہیں تھا، یہ سب کچھ ۱۹۴۷ء کے بعد بنا — اور وہ بھی سالانہ سیلابوں، سمندری طوفانوں اور قیامت خیز سائیکلونوں کے باوجود! ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص زرمبادلہ کے آمد و خرچ کے اعداد و شمار جمع کرے اور مجیب کی طرف سے عائد کردہ اقتصادی استحصال کے الزامات کی قلعی کھول دے۔"

میں کیپٹن چودھری کی باتیں سُن کر سوچنے لگا کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے اور حقائق مجیب کے خلاف ہیں تو پھر ڈر کس بات کا؟ اس کے علاوہ مجیب کا توڑ مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی تو ہیں جو ایک بااثر اور متوازی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں — اور ہاں! دائیں بازو کی کئی جماعتیں بھی تو مجیب کے خلاف ہیں جو اکثر و بیشتر ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی رہتی ہیں۔ بھلا ان حالات میں مجیب کس طرح من مانی کر سکتا ہے۔ اگر اس کا سب سے بڑا ہتھیار رائے عامہ ہے تو اس کا اندازہ تو انتخابات کے بعد ہی ہوگا۔ دیکھیے انتخابات میں کیا ہوتا ہے۔

انتخابات کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر سے یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے پابندی اُٹھالی گئی۔ سالِ نو کا خیر مقدم بائیں بازو کے طلبہ کی جماعت نے آدھی رات کو مشعل بردار جلوس نکال کر کیا جس میں انہوں نے "سُرخ انقلاب" کے نعرے لگائے۔ ان کی حریف جماعت ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ نے (جس کا الحاق عوامی لیگ سے تھا) اگلے روز ایک جلسۂ عام میں یہ اعلان کیا کہ "ہماری نجات کا راز چھ نکات میں ہے — صرف چھ نکات میں"۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طالب علموں نے اپنا کوئی زور نہ دکھایا۔

سیاسی جماعتوں میں عوامی لیگ، جماعتِ اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) بہت سرگرم تھیں۔ عوامی لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ۱۱ جنوری کو پلٹن میدان میں ایک عظیم الشان جلسے سے کیا۔ یہ جلسہ تنظیم اور تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اخباری اصطلاح میں وہاں لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ تعداد کے علاوہ گفتار و افکار کے لحاظ سے بھی یہ اجتماع یادگار تھا۔ اس سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ بنگالیوں نے ۱۹۵۶ء کے دستور میں برابری (PARITY) کے اصول کو تسلیم کر کے سخت غلطی کی تھی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر "بنگلہ دیش" پر یہ اصول دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی اور عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔[1]

بعد میں بنگال کے ممتاز سیاست دان مرحوم تفضل حسین عرف مانک میاں[2] کے سپوت بیرسٹر معین الحسین نے مجھ سے کہا: "میرے والد کی

---

[1] انگریزی روزنامہ آبزرور ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء

[2] مشرقی پاکستان کے مقبول ترین روزنامہ "اتفاق" کے مالک اور حسین شہید سہروردی کے قریبی رفیق، مانک میاں کا انتقال ۳۰ مئی ۱۹۶۹ء کو ہوا۔

زندگی میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو بنگالیوں کے لیے قابلِ قبول بنانا ممکن تھا، مگر اب گاڑی چھوٹ چکی ہے۔" میں نے اس دعوے کی تصدیق بعض بزرگ سیاست دانوں سے چاہی تو انھوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا: "جی ہاں حسین شہید سہروردی[1] کی موت کے بعد اگر کسی کا اثر و رسوخ مجیب پر تھا تو وہ مانک میاں ہی تھے۔"

ایک ہفتے بعد جماعتِ اسلامی نے اسی پلٹن میدان میں اپنا جلسہ منعقد کیا جہاں عوامی لیگ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ جماعتِ اسلامی نے بھی اپنے اجتماع کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ جلسہ ہلڑ بازی کا شکار ہو گیا۔ نوبت مارکٹائی تک پہنچی جس میں دو آدمی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں سے پچیس کی حالت تشویشناک تھی۔ امیر جماعتِ اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو جلسے سے خطاب کرنے خاص طور پر لاہور سے ڈھاکہ پہنچے تھے، تقریر کیے بغیر جلسہ گاہ سے واپس آ گئے۔

اس خوں ریز جھڑپ میں جماعتِ اسلامی ایک مظلوم اور ستم رسیدہ جماعت بن کر نکلی۔ جماعت نے خون خرابے کی ذمہ داری عوامی لیگ پر ڈالی کیونکہ جلسہ گاہ کے ایک حصے سے "جوائے بنگلہ" (بنگلہ دیش زندہ باد) کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ عوامی لیگ یہ کہہ کر اس الزام کی بھرپور تردید کرتی تھی کہ تشدد اس کے مفاد میں نہیں کیونکہ اس سے انتخابات التوا کا شکار ہو سکتے تھے۔

فریقین میں یہ بحث اپنی جگہ بجا، مگر سوال یہ ہے کہ اس گڑبڑ کو روکنے کے لیے انتظامیہ نے کیا کیا۔ خوں ریز جھڑپوں کے دوران پولیس کہاں تھی؟ اس نے بروقت اور مؤثر مداخلت کر کے امن و امان بحال کیوں نہ کیا؟ میں نے یہ سوال مارشل لا انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اُٹھایا تو اس نے کہا: "حکومت نے جماعتِ اسلامی کو ضروری تحفظ کی پیش کش کی تھی، مگر جماعت نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمارے پاس انتظام ہے۔" اس سے انتظامیہ یہ سمجھی کہ غالباً جماعت یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ اگر عوامی لیگ اپنے بل بوتے پر اتنا شاندار جلسہ کر سکتی ہے تو ہم بھی کسی سے کم نہیں، کیونکہ حکومت کی پناہ تو ہمیشہ کمزور جماعتیں ہی ڈھونڈتی ہیں۔" میں نے جب یہ بات جماعت کے ایک ہمدرد سے کہی تو اس نے جواب دیا: "نہیں، یہ سراسر جھوٹ ہے، جماعت نے کوئی پیش کش نہیں ٹھکرائی۔ درحقیقت حکومت اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے کے لیے سربام بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔"

جنوری ۱۹۷۰ء کا تیسرا اہم سیاسی واقعہ "سنتوش" میں کسانوں کی "ریلی" تھی جس کا اہتمام مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے کیا تھا۔ اس میں شرکت کے دعوت نامے ان تمام پارٹیوں کو دیے گئے جو سوشلزم میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ حکومت نے اس "ریلی" کو کامیاب بنانے کے لیے خصوصی گاڑیاں چلائیں اور جلسہ گاہ تک بجلی پہنچانے کے انتظامات کیے، کیونکہ گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھنے والے بعض سیاسی پنڈتوں کا خیال تھا کہ مجیب الرحمٰن کا اثر زائل کرنے کے لیے نیپ (بھاشانی) کو کامیاب اور فعال بنانا ضروری ہے۔

اس کے باوجود "ریلی" ناکام ہو گئی۔ ناکامی کی وجہ کسی حریف جماعت کی دخل اندازی کے بجائے اس کا اپنا اندرونی انتشار تھا۔ کئی دنوں کے شور شرابے کے بعد اگر اس تقریب سے کچھ برآمد ہوا تو چند نعرے تھے:

"خون اور آگ —— آگ! آگ!! آگ!!!
"پرچی یا گولی —— گولی! گولی!! گولی!!!

نیپ (بھاشانی) کا انتہا پسند گروپ جس کی قیادت پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسٹر طٰہٰ کے ہاتھوں میں تھی، سرے سے انتخابات میں یقین

---

[1] مجیب الرحمٰن کے سیاسی گرو اور پاکستان کے سابق وزیرِ اعظم۔ ان کا انتقال دسمبر ۱۹۶۳ء میں بیروت کے ایک ہوٹل میں ہوا۔

[illegible] تھا کہ انتخابات سے حکومت تو بدل سکتی ہے مگر سماجی و اقتصادی تبدیلی نہیں آسکتی [illegible]
ہے۔

ایک شام ایک اخبار کے دفتر میں میری ملاقات مسٹر طہٰ سے ہو گئی وہ نیپ (بھاشانی) سے تازہ تازہ الگ ہوئے تھے۔ اپنی علٰحدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میں نے پہلے عوامی لیگ کو اس لیے چھوڑا تھا کہ اس میں کوئی انقلابی شعلہ باقی نہیں رہا تھا؛ چنانچہ میں نے انقلابی نصب العین حاصل کرنے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی مگر اب یہ پارٹی بھی اپنے نصب العین سے بھٹک گئی ہے۔ اب اس میں بھی عوامی لیگ کی طرح کوئی چنگاری باقی نہیں رہی۔۔۔ میں اپنا آئندہ کا لائحۂ عمل انتخابات کے بعد وضع کروں گا۔"

ان تین سیاسی پارٹیوں کے علاوہ چند اور سیاسی جماعتیں اور گروہ بھی تھے جن میں کرشک سرامک پارٹی، پاکستان نیشنل لیگ، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان اور مسلم لیگ (تین گروہ) شامل ہیں۔ یہ سب سیاسی اکھاڑے میں اترے مگر افتاں و خیزاں ——— ان میں سے کسی نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دیا جس سے سیاسی ہلچل مچ سکتی۔ البتہ ان نسبتاً چھوٹی جماعتوں میں پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جناب محمد نور الامین کا ذکر ضروری ہے کیونکہ انتہا پسندی کے اس جذباتی ماحول میں انہوں نے اعتدال، رواداری اور انصاف کی آواز بلند کی۔ یہ بہت بڑی بات تھی، کیونکہ تاریک آندھی میں چراغ جلانا بے شک نتائج کے لحاظ سے بے سود ہو مگر جذبے اور نیت کے اعتبار سے قابلِ ستائش ———

مسٹر نور الامین کی یہ آواز بے اثر ثابت ہوئی کیونکہ ماحول بدل چکا تھا۔ قدریں روندی جارہی تھیں، قومی سالمیت کے منافی نعرہ بازی روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ اس آندھی کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ حکومت کی گدی پر بیٹھنے والے اس آندھی سے بے خبر تھے یا دیدہ و دانستہ اسے نظر انداز کر رہے تھے۔

سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اقتصادیات کے وڈیروں اور بنگال کے دانش وروں کی طرف متوجہ ہوا، کیونکہ میرے خیال میں یہ دو طبقے کسی ملک کی سیاسی تقدیر بدلنے میں خاموش مگر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تجارتی حلقوں میں مسٹر رحمٰن، مسٹر احمد، مسٹر بھوئیاں اور چند دوسرے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا زورِ بیان اس بات پر ٹوٹتا تھا کہ جناب، مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ عوامی لیگ کی زیرِ سرپرستی چھپنے والے لٹریچر کا اکثر حوالہ دیتے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصّہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے مگر اس پر قومی آمدنی کا صرف بیس فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف چالیس فیصد کماتا ہے مگر کُل آمدنی کا پچھتر فیصد کھا جاتا ہے۔

اعداد و شمار کے علاوہ یہ حضرات بعض عملی دشواریوں کا بھی اکثر ذکر کرتے اور روزمرہ زندگی سے ایسی مثالیں دیتے کہ سارا تجارتی نظام مضحکہ خیز نظر آتا۔ مثلاً وہ کہتے کہ ایک جہاز جو مشرقی وسطیٰ سے ربڑ وغیرہ لے کر چٹا گانگ روانہ ہوتا ہے، پہلے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ پھر کراچی سے چٹاگانگ آتا ہے جس سے کرایہ بھی بڑھتا ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے، اسی طرح فوج کے استعمال میں آنے والی جھل جالیاں (CAMOUFLAGE NETS) عموماً پٹ سن سے بنتی ہیں۔ پٹ سن کی فیکٹریاں یہاں ہیں، مگر پہلے یہ تیار شدہ مال رنگائی کے بہانے مغربی پاکستان بھیجا جاتا ہے اور پھر واپس منگوا کر یہاں کے یونٹوں کو دیا جاتا ہے ——— معلوم ہوتا ہے کوئی چیز اس وقت تک مشرقی پاکستان کے لیے مناسب نہیں سمجھی جاتی جب تک اس پر مغربی پاکستان کی قبولیت کی مُہر ثبت نہ ہو جائے۔ خواہ یہ تجارتی مال ہو، سیاست دان ہوں یا انتظامیہ کے افسر ———

ذہنی اور فکری محاذ پر بھی کیفیت تشویشناک تھی۔ چند ذاتی تجربے پیش کرتا ہوں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا وہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکہ شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ میری خواہش پر مجھے سنٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔ چلتے چلتے "آرٹ سیکشن" کے سامنے رک گئے۔ شیلف سے ایک اعلیٰ طباعت والی خوبصورت کتاب نکالی اور بنگالی لہجے اور نفرت سے کہنے لگے: "ذرا ملاحظہ ہو راولپنڈی سے ہمارا ہیڈ آفس ہمیں کیا بھیج رہا ہے؟ یہ قومی دولت کا سراسر ضیاع نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں بھی اس پائے کی کوئی کتاب شائع کی ہے؟" ان کی برہمی کا باعث "مرقع چغتائی" تھا جس میں یکتائے روزگار شاعر اسد اللہ خاں غالب کے منتخب اشعار کی مصورانہ ترجمانی کی گئی تھی۔

لائبریری کے اسی چکر میں وہ ایک جگہ اور رکے اور شیلف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: "یہ سارا شیلف تمہارے قائداعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔" زور "تمہارے" پر تھا جس کی چبھن مجھے محسوس ہوئی اور میں اسے دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔

چند روز بعد مجھے فلم سنسر بورڈ ڈھاکہ کی میٹنگ میں ایک اور یادگار تجربہ ہوا۔ یہ میٹنگ بلانے کا مقصد چربہ فلموں کی روک تھام تھا جن کا اکثر مواد فلموں اور ناولوں کی شکل میں کلکتہ سے آتا۔ اس اجلاس میں ڈھاکہ کی فلمی صنعت کے تمام نمائندے یعنی پروڈیوسر، ڈائریکٹر، فن کار اور قلم کار موجود تھے۔ صدرِ مجلس نے ابتدائی کلمات میں قومی وقار اور اخلاقی اقدار کے نام پر "سرقہ" اور "چربہ" کی لعنت ختم کرنے پر زور دیا اور تمام حاضرین سے تعاون کی اپیل کی۔ اس پر فلم انڈسٹری کے با اثر ڈائریکٹر جو خود اچھے فلمکار بھی تھے اپنے ساتھیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فرمایا:

"پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ پہلے بھی یہاں منعقد ہوا تھا جس میں یہاں کی فلمی صنعت کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت اس کی نشوونما کے روایتی سرچشموں میں مداخلت نہیں کرے گی۔ میں مارشل لا انتظامیہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ حکومت کے اس فیصلے پر قائم رہے اور کی طرف ہمارا دروازہ کھلا رکھے۔ سوچیے تو سہی آخر ہم اپنے ثقافتی کعبے سے کیسے پیٹھ موڑ سکتے ہیں؟"

جلسے کے بنگالی صدر نے جس کی اپنی وفاداری مشکوک تھی میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بنگالی دانشور کی نکتہ آفرینی پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اجلاس برخاست کر دیا۔

مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بنگالی بھائیوں سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع ذہنی خلیج حائل ہو چکی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا یہ خلیج پاٹی جا سکے گی یا اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا۔ معاً میرا ذہن ۹۳ ہزار فوجیوں کی طرف گیا جن کو مشرقی پاکستان میں قومی سالمیت کی حتمی گارنٹی سمجھا جاتا تھا۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ ان فوجیوں کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟

باب ۲

ریڑھ کا سرطان

اگر ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں سیاست دان، تاجر اور دانشور مغربی پاکستان سے ذہنی رابطہ توڑ چکے تھے تو کیا بنگالی سپاہی اس وبا سے محفوظ تھے؟ کیا کسی اندرونی شورش کو فرو کرنے کے لیے ان پر بھروسا کیا جا سکتا تھا؟ کیا ہندوستانی جارحیت کی صورت میں ان کا طرزِ عمل محبِ وطن سپاہیوں جیسا ہوگا؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ ذہنی اور جذباتی طور پر باقی فوج سے ہم آہنگ تھے؟

مَیں پہلا شخص نہ تھا جس کے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہے تھے۔ مجھ سے پہلے بھی کئی افراد اس تشویش کا شکار بن چکے تھے۔ ان میں سے ایک میجر جنرل خادم حسین راجہ تھے جو مشرقی پاکستان میں متعیّن واحد ڈویژن (۱۴) کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے۔ زیرِ کمان سپاہیوں کی نفسیاتی الجھنوں سے باخبر رہنا ان کا سرکاری فرض بھی تھا۔ ان کے دل میں شبہات کا کیڑا اس وقت پیدا ہوا جب ۱۹۶۹ء کے آخر میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور بنگالی سپاہیوں کو اسے فرو کرنے کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ اس نازک مرحلے پر بنگالی سپاہیوں کا نظم و ضبط بظاہر قائم رہا مگر انہوں نے مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ یُوں پتہ چلتا تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہیں۔

خطرے کو بھانپتے ہوئے جنرل راجہ نے انہی دنوں جنرل ہیڈ کوارٹرز (جی۔ ایچ۔ کیو) کو ایک چِٹھی لکھی جس میں مقامی صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے بعد سفارش کی گئی کہ علیحدہ علیحدہ بنگالی اور غیر بنگالی یونٹوں کا فرق ختم کیا جائے اور بنگالی نفری کو غیر بنگالی پلٹنوں میں ضم کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مشرقی پاکستان کی نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر وہاں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے یونٹوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

جنرل راجہ کی تجاویز صدرِ پاکستان جنرل یحییٰ خاں کی اس تقریر کی رُوح سے متصادم تھیں جو انہوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو قوم کے نام نشر کی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ افواجِ پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد دُگنی کر دی جائے گی — اور یہ کارروائی بنگالیوں کی شکایات دُور کرنے کی طرف پہلا قدم ہوگا۔

صدرِ پاکستان نے جو فوج کے کمانڈر انچیف بھی تھے یہ فیصلہ کرتے وقت مشرقی پاکستان کی صورتِ حال کو کیوں پیشِ نظر نہ رکھا؟ اس کی دو ہی وُجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو انہیں بنگالی سپاہیوں کی نفسیاتی کیفیت کا احساس نہ تھا اور یا وہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت اس سے پہلو تہی کر رہے تھے۔

صدرِ پاکستان اور جنرل راجہ کی سوچ میں اس تضاد کے باوجود مؤخر الذکر کو اپنی تجاویز کی صحت اور افادیت پر اتنا یقین تھا کہ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور جی ایچ کیو پر متواتر زور دیتے رہے۔ کچھ عرصے بعد ایک سہانی صبح کو جی ایچ کیو سے ایک خفیہ خط موصول ہوا۔ جنرل صاحب سمجھے کہ ان کی اُمیدوں کی کلی کھلنے لگی ہے۔ انہوں نے پُر اشتیاق بے تابی سے خاکی لفافہ کھولا۔ لفافے کے اندر ایک اور

لفافہ تھا' اسے چاک کیا۔ خط کا متن پڑھا' تو اس میں کچھ اور ہی نکلا۔ اس خط کے ذریعے جنرل راجہ کو کمانڈر انچیف کا یہ حکم پہنچایا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں دو مزید (خالص) بنگالی پلٹنیں کھڑی کی جائیں ــــ پہلے سے موجود بنگالی پلٹنوں کی تعداد سات تھی جن میں سے چار مشرقی پاکستان میں موجود تھیں' گویا اب اس صوبے میں خالص بنگالی پلٹنوں کی تعداد چھ ہو جائے گی۔ (یاد رہے ان دنوں مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی پلٹنوں[1] کی تعداد آٹھ تھی)

جی او سی کے لیے یہ حکم تشویش کا باعث ہُوا۔ انہوں نے اس مسئلے پر مزید سوچا اور طے کیا کہ اس سلسلے میں مزید خط و کتابت بے اثر ہو گی' اس لیے خود جا کر اس حکم کے خطرناک مضمرات سے جی ایچ کیو کو آگاہ کرنا ضروری ہے' چنانچہ وہ راولپنڈی پہنچے اور متعلقہ حکام کو بتایا: "اگر آپ کا مقصد ایک الگ بنگالی آرمی کھڑی کرنا ہے تو بیشک نئی سے نئی بنگالی پلٹنیں کھڑی کرتے جائیں' لیکن اگر آپ فوج ـــ اور مُلک ـــ کو متحد رکھنا چاہتے ہیں' تو از راہِ مہربانی موجودہ بنگالی پلٹنوں کو باقی فوج میں ضم کر دیجیے"۔

جب یہ نقطۂ نظر صدرِ پاکستان کو پیش کیا گیا' تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ایک طرف سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ فوج میں بنگالی نمائندگی کو بڑھایا جائے اور دوسری طرف مقامی کمانڈر مشورہ دے رہا تھا کہ موجودہ بنگالی پلٹنوں کا وجود بھی ختم کر دیا جائے۔ فیصلے کی اس مشکل ساعت میں جنرل یحییٰ نے وہی کیا جو تذبذب کے شکار کمانڈر عموماً کیا کرتے ہیں۔ جنرل یحییٰ نے ایک بین بین راستہ تلاش کیا اور فیصلہ دیا کہ نئی پلٹنیں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ بنگالی پلٹنوں کو غیر بنگالی پلٹنوں میں ضم کرنے کی کارروائی کا آغاز کیا جائے۔

اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ۱۹ ایف ایف میں بنگالی سپاہیوں کی ایک کمپنی شامل کر دی گئی' بعد میں ۲۵ پنجاب میں ایک بنگالی کمپنی ضم کرنے کا پروگرام تھا۔ خیال تھا کہ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا' تو ضم کرنے کی اس سکیم کو آگے بڑھایا جائے گا۔ ۱۹ ایف ایف میں بنگالی نفری کی شمولیت کے موقع پر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو فورٹریس اسٹیڈیم ڈھاکہ میں ایک تقریبی پریڈ ہوئی جو بخیر و خوبی انجام پائی' البتہ جی او سی کے ذہن میں یہ کانٹا برابر کھٹکتا رہا کہ اگر ۱۹ ایف ایف میں ضم شدہ بنگالیوں نے کسی بہانے مثلاً ہم گندم کی بجائے چاول کھائیں گے شورش برپا کر دی' تو یہ تجربہ مہنگا پڑے گا۔

جی او سی کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہُوا۔ ۱۹ ایف ایف بنگالی نفری سمیت مشرقی پاکستان میں اپنے فرائض انجام دیتی رہی اور بعد ازاں اپنی باری پر مغربی پاکستان منتقل ہو گئی ـــ بخیر گزشت!

اس کامیاب تجربے کے باوجود "ضم کرنے کی سکیم" آگے نہ بڑھ سکی' کیونکہ اس بارے میں صدرِ مملکت نے زبانی "آہستہ روی" کا حکم دے رکھا تھا۔

یہ تو تھی رُوداد ادغام کی پالیسی کی' اب ذرا بنگالی نفری کو دُگنا کرنے کے حکم کا حال بھی سُن لیجیے۔ اس حکم پر بڑے زور شور سے کارروائی شروع ہوئی۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع کو اس کی تشہیر کے لیے خصوصی احکام جاری ہوئے۔ لڑھکتے لڑھکتے ایک حکم مجھ تک بھی پہنچا' کیونکہ میں بھی اشتہاری مشینری کا ایک ادنیٰ سا پرزہ تھا۔ حکم ہُوا اس مہم کو مقبول بنانے کے لیے ایک اخباری مضمون لکھو۔

میں اس حکم کو پلّے باندھے چٹا گانگ پہنچا جہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کا سنٹر تھا۔ ضروری کوائف وہیں سے مل سکتے تھے۔ وہاں پہنچا' سنٹر کمانڈنٹ اپنے دفتر کے باہر پُر بہار چمنستان میں دھوپ سینک رہے تھے جن کو اپنی بنگالی قومیت کا احساس اور محبِّ الوطنی کے

[1] پلٹن کی منظور شدہ نفری تقریباً آٹھ سو ہوتی ہے جن میں سے چھ سو کے قریب لڑائی میں مؤثر کردار ادا کرتے تھے۔

والی قربت پر بہت فخر تھا۔ وہ لان میں بار بار پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو اُوپر کی طرف کھینچتے۔ بظاہر یہ جسمانی ورزش کی عمدہ عادت تھی لیکن شاید اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی اُلجھن تھی جو میری موجودگی (۶ فٹ قد) میں اور شدید ہو گئی تھی۔

کرنل صاحب نے میری آمد کا مقصد جانتے ہی دو ٹوک کہا: "بنگالیوں کا کوٹہ دُگنا کرنے کا کیا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتے ہو؟ چھوڑو اس کو کیونکہ اگر صدر کے حکم پر سو فیصد عمل ہو جائے تو بھی افواجِ پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد بمشکل پندرہ فیصد ہو جائے گی؛ حالانکہ وہ قومی آبادی کا ۵۵ فی صد ہیں۔"

کرنل موجمدار سے کوئی آدھ پون گھنٹہ "بصیرت" حاصل کرنے کے بعد میں ان کے دفتر سے نکلا اور ایک اور (مغربی پاکستانی) دوست کے ہاں گیا۔ دوپہر کے کھانے پر میزبان نے سنٹر کمانڈنٹ کا از خود ذکر چھیڑا اور بتایا کہ چند ماہ پہلے بنگالی رنگروٹوں کا ایک دستہ سنٹر میں اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد کراچی روانہ ہونے لگا تو کرنل صاحب نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "تم اب خوددار بنگالی سپاہی ہو، تم وہاں پنجابی افسروں کے بوٹ پالش کرنے نہیں جا رہے ـــ وقت آنے والا ہے کہ وہ تمہارے جوتے پالش کیا کریں گے۔"

کرنل موجمدار بنگالی سپاہیوں کے واحد سرپرست اور بہی خواہ نہیں تھے۔ انہیں ایک حاضر نوکری والے بنگالی لیفٹیننٹ جنرل اور ریٹائرڈ کرنل کی اعانت بھی حاصل تھی۔ میں ان دونوں سے ملا ہوں۔

فروری میں ڈھاکہ کے شمال میں جو دیب پور کے مقام پر ایک تقریب ہونے والی تھی۔ اس کے مہمانِ خصوصی لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین تھے۔ انہیں وہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری بٹالین (جونیئر ٹائیگرز) کو رجمنٹل کلر عطا کرنا تھا۔ جنرل وصی الدین اس رجمنٹ کے کرنل کمانڈنٹ (اعزازی سرپرست) تھے لیکن اس کے اصل سرپرست کرنل ایم اے۔ جی عثمانی تھے جو فوج سے ریٹائر ہو کر عوامی لیگ کی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ (بعد میں وہ عوامی لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مجیب کی کابینہ میں وزیر بنے)

جنرل وصی الدین اس تقریب کے سلسلے میں مغربی پاکستان سے ڈھاکہ پہنچے تو ۱۴ ڈویژن کے آفیسرز میس میں ٹھہرے۔ انہوں نے مجھے طلب فرمایا۔ کرنل عثمانی بھی موجود تھے۔ جنرل صاحب نے اپنی تقریر کا مسودہ مجھے دیا تاکہ تقریب سے پہلے اس کی نقلیں بنوالی جائیں۔ میں تقریر لے کر واپس آ گیا۔ اگلے روز پھر بلایا گیا اور اس بار ایک نئی تقریر میرے حوالے کی گئی۔ حکم ہوا کہ پہلی تقریر منسوخ، نئی تقریر طبع کرائی جائے۔ میں نے دونوں تقریروں کا موازنہ کیا، پتہ چلا کہ دوسری تقریر میں کرنل عثمانی کی خدمات کو زیادہ صراحت سے سراہا گیا ہے اور تمام بنگالی سپاہیوں سے کہا گیا ہے کہ آڑے وقت میں ان کی رہنمائی پر بھروسا کریں۔ تقریب کے بعد اس تقریر کی چھپی ہوئی نقلیں ملک کے دونوں بازوؤں میں تمام بنگالی فوجیوں میں تقسیم کی گئیں۔

کرنل عثمانی منحنی جسم، پست قامت، سن خوردہ شخص تھے۔ ان کے سیاہ چہرے پر سفیدی کا واحد نشان مونچھوں کا گچھا تھا جو ان کے رخساروں کے غالب حصے پر پھیلا ہوا تھا۔ کرنل صاحب کے دیرینہ دوست مذاق سے کہا کرتے کہ مونچھوں سے لٹکا ہوا شخص دیکھنا ہو تو عثمانی کو دیکھ لو۔ (بحران میں کرنل عثمانی کے کردار کے بارے میں مفصل ذکر آگے آئے گا)۔

کرنل (ریٹائرڈ) عثمانی، کرنل موجمدار اور جنرل وصی الدین بنگالی سپاہیوں اور افسروں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ میجر جنرل خادم راجا اس صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنگالی سپاہی اب ایسی ذہنی کیفیت میں ہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کے سیاسی حالات نظر انداز نہیں کر سکتے ـــ جنرل صاحب کے سامنے یہ مثال موجود تھی کہ تحریکِ پاکستان کے دوران متحدہ ہندوستان میں مسلمان فوجی قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ان کی ہمدردیاں آزادی کے پروانوں کے ساتھ تھیں۔ اگر اس سیاسی احساس کے باوجود آزادی ملنے تک

ان کا دِہان تمام رہا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سیاسی مدوجزر کے باوجود بنگالی سپاہیوں کا نظم و ضبط غیر معتبر رہتے کی بات تمام رہ گئے تھا۔

جنرل راجہ کے اندیشوں کی ایک بُنیاد اگرتلا سازش تھی جس میں ایک فوجی پلان بھی شامل تھا۔ جنرل راجہ کے مطابق اس پلان کے تین حصّے تھے۔ تمام یونٹوں کے اسلحہ خانے (KOTES) لُوٹنا ــــ غیر بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنا ــــ اور چھاؤنیوں پر قبضہ جمانا۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے جنرل راجہ نے کسی سرکاری کام کے بہانے اپنے بریگیڈ کمانڈروں کو (جو اتّفاق سے غیر بنگالی تھے) ڈھاکہ طلب کیا۔ انہیں امکانی خطرے کے بارے میں اعتماد میں لیا اور ہدایت کی کہ وہ احتیاطاً اپنی یونٹوں کا کچھ اسلحہ بیرکوں میں رکھیں تاکہ اُڑے وقت کام آسکے۔" جنرل راجہ نے مجھے بتایا "یہ مسئلہ اتنا نازک تھا کہ میں اسے احاطۂ تحریر میں نہ لا سکا۔"

جی او سی کے ان خدشات میں حقیقت کا کوئی عنصر تھا یا وہ محض ایک پنجابی جرنیل کے دماغ کا فتور تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنرل صاحب کے دِل میں پیدا ہونے والے وسوسے خدشات کو جنم دے رہے تھے؟ کیونکہ ہم حالات کے ایسے بھنور میں گھرے ہُوئے تھے جہاں واقعات کا منطقی تجزیہ مشکل تھا۔ مثلاً ایک دن یونہی میں اپنے دفتر سے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا ایک بنگالی افسر کے دفتر چلا گیا۔ وہاں ایک اور بنگالی بیٹھا تھا۔ دونوں محوِ گفتگو تھے، مگر مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے چند ناگوار لمحے انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا:

"کہیئے جناب کیا ہو رہا ہے؟"

میزبان بولا:

"... دراصل ... دراصل ہم اگلے اتوار کو مچھلی کے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے۔"

"تو کیا میں بھی چلوں؟"

"... نہیں نہیں ... میرا مطلب ہے ابھی پروگرام فائنل نہیں ہُوا۔"

بات ختم ہو گئی مگر جوابوں کے انداز سے مجھے شک گزرا کہ وہ درحقیقت مجیب کے بنگلہ دیش کی باتیں کر رہے تھے اور مجھے دیکھ کر مچھلی کا ذکر لے بیٹھے، حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی شکار کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ حقیقت اور وہم کو جُدا کرنا واقعی ناممکن تھا۔

اس اندھیرے میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے میں نے لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں سے ملاقات کی اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید بنگالی اور غیر بنگالی افسروں کے درمیان اعتماد کا پُل ٹوٹ چُکا ہے ــــ جنرل یعقوب جو مجھ سے زیادہ باخبر اور دانشمند تھے اپنے ردِّعمل کو پی گئے ــــ انہوں نے مجھے بٹھایا اور ایک پُرمغز فلسفیانہ خطبے سے میری تواضع کی۔ میں اپنے وسوسے لیے واپس چلا آیا۔

شاید جنرل یعقوب اور میں فوجی افسروں کے دو طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ مجھ جیسے جونیئر افسروں کو اپنے کم تجربے اور محدود معلومات کی بنا پر رائی بھی پہاڑ نظر آتی تھی اور جنرل صاحب جیسے ذہن رسا رکھنے والوں کو پہاڑ بھی رائی لگتا ــــ حقیقت تک پہنچنے میں ایک دُشواری یہ بھی تھی کہ ہر چیز بظاہر ڈسپلن کے بھاری خول میں لپٹی ہُوئی تھی۔ یہ خول ابھی قائم تھا۔ اس میں شگاف ڈالنے کے لیے عوامی لیگ کے پاس انتخابی سرگرمیوں کے آٹھ مہینے باقی تھے۔

باب ۳

مجیب کا عروج

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی وبا تیز ہوتی جا رہی تھی اور شہری اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید ہوا دینے کے لیے عوامی لیگ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اُس تقریب سے سرد مہری اور بیگانگی برتتی جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اُس موقعے کو اہمیت دیتی جس سے صوبائی عصبیت کو فروغ حاصل ہوتا۔ مثلاً جب بھی یوم پاکستان (۲۳ مارچ) یوم آزادی (۱۴ اگست) یوم دفاع (۶ ستمبر) اور قائدِ اعظم کا یوم ولادت (۲۵ دسمبر) یا یوم وفات (۱۱ ستمبر) آیا، عوامی لیگ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن اس کے برعکس سارجنٹ ظہور الحق کی برسی، لسانی فسادات کے شہیدوں کی یاد اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جنم اشٹمی کو ہمیشہ دھوم دھڑکے سے منایا۔

سارجنٹ ظہور الحق ۱۹۶۸ء کی اگرتلا سازش میں مجیب کے ساتھ ماخوذ تھا۔ وہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں فوجی حراست میں ہلاک ہو گیا۔ ۱۵ فروری کو اس کی پہلی برسی مشرقی پاکستان کے اُنیس میں سے سترہ اضلاع میں شان و شوکت سے منائی گئی۔ ان تقریبات میں عوامی لیگ پیش پیش تھی۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے اہم روزناموں نے سارجنٹ کی تصویروں اور حالاتِ زندگی کو جلی سُرخیوں کے ساتھ پہلے صفحات کی زینت بنایا۔ کئی مقامات پر مختلف جلسوں میں ظہور الحق کے جذبۂ قربانی کو فراخدلانہ خراج پیش کیا گیا اور اس عزم کا عہد کیا گیا کہ مرحوم کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔[۱] خود شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "سارجنٹ ظہور الحق کا نام ہمیشہ تیتو میر اور سرج سین جیسے عظیم محبِ وطنوں کے ساتھ لیا جائے گا۔[۲]"

اگلے ہفتے ۱۹۵۲ء کے لسانی فسادات میں "شہید" ہونے والوں کی برسی تھی۔ یہ دن بنگالیوں کے لیے بالعموم اور عوامی لیگ کے لیے بالخصوص جذباتی اہمیت رکھتا تھا۔ اس روز بے پناہ ولولے اور جوش کا مظاہرہ کیا گیا۔ اخبارات نے خاص نمبر چھاپ کر "شہداء" کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ سارا دن عظیم پورہ قبرستان میں "شہداء" کی قبروں پر لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ فنونِ لطیفہ کے کالج کے طلبہ و طالبات نے مرکزی "شہید مینار" سے عظیم پورہ قبرستان تک ساری سڑک کو مصورانہ نقش و نگار سے آراستہ کیا اور خود شیخ مجیب الرحمٰن نے آدھی رات کو "شہید مینار" پر حاضری دے کر ذاتی طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اسی روز ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب نے مطالبہ کیا: "حکومت کے تمام دفاتر، اداروں میں ہر سطح پر بنگلہ زبان رائج کی جائے۔[۳]"

۱۔ پاکستان آبزرور۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۷۰ء

۲۔ مارننگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء

۳۔ مارننگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء

باب ۳

مجیب کا عروج

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی وبا تیز ہوتی جا رہی تھی اور شہری اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید ہوا دینے کے لیے عوامی لیگ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اس تقریب سے سرد مہری اور بیگانگی برتتی جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اس موقعے کو اہمیت دیتی جس سے صوبائی عصبیت کو فروغ حاصل ہوتا۔ مثلاً جب بھی یوم پاکستان (۲۳ مارچ) یوم آزادی (۱۴ اگست) یوم دفاع (۶ ستمبر) اور قائد اعظم کا یوم ولادت (۲۵ دسمبر) یا یوم وفات (۱۱ ستمبر) آیا، عوامی لیگ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن اس کے برعکس سارجنٹ ظہور الحق کی برسی، لسانی فسادات کے شہیدوں کی یاد اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جنم اشٹمی کو ہمیشہ دھوم دھڑکے سے منایا۔

سارجنٹ ظہور الحق ۱۹۶۸ء کی اگرتلا سازش میں مجیب کے ساتھ ماخوذ تھا۔ وہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں فوجی حراست میں ہلاک ہو گیا۔ ۱۵ فروری کو اس کی پہلی برسی مشرقی پاکستان کے انیس میں سے سترہ اضلاع میں شان و شوکت سے منائی گئی۔ ان تقریبات میں عوامی لیگ پیش پیش تھی۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے اہم روزناموں نے سارجنٹ کی تصویریں اور حالاتِ زندگی جلی سرخیوں کے ساتھ پہلے صفحات کی زینت بنایا۔ کئی مقامات پر مختلف جلسوں میں ظہور الحق کے جذبۂ قربانی کو فراخدلانہ خراج پیش کیا گیا اور اس عزم کا عہد کیا گیا کہ مرحوم کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔[۱] خود شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "سارجنٹ ظہور الحق کا نام ہمیشہ ٹیٹو میر اور سورج سین جیسے عظیم محبّ وطنوں کے ساتھ لیا جائے گا۔"[۲]

اگلے ہفتے ۱۹۵۲ء کے لسانی فسادات میں "شہید" ہونے والوں کی برسی تھی۔ یہ دن بنگالیوں کے لیے بالعموم اور عوامی لیگ کے لیے بالخصوص جذباتی اہمیت رکھتا تھا۔ اس روز بے پناہ ولولے اور جوش کا مظاہرہ کیا گیا۔ اخبارات نے خاص نمبر چھاپ کر "شہداء" کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ سارا دن عظیم پورہ قبرستان میں "شہداء" کی قبروں پر لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ فنونِ لطیفہ کے کالج کے طلبہ و طالبات نے "مرکزی شہید مینار" سے عظیم پورہ قبرستان تک ساری سڑک کو مصورانہ نقش و نگار سے آراستہ کیا اور خود شیخ مجیب الرحمٰن نے آدھی رات کو "شہید مینار" پر حاضری دے کر ذاتی طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اسی روز ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب نے مطالبہ کیا: "حکومت کے تمام دفاتر اداروں میں ہر سطح پر بنگلہ زبان رائج کی جائے۔"[۳]

۱۔ پاکستان آبزرور۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۷۰ء

۲۔ مارننگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء

۳۔ مارننگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء

پھر ۸ مئی کو بنگلہ زبان کے شاعر ٹیگور کا ایک سو نواں جنم دن تھا۔ ٹیگور کے سیکولر خیالات کی بنا پر حکومت نے ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اُس کی شاعری کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا رکھی تھی؛ مگر حکومت کے اس فیصلے کا بنگالیوں پر کوئی اثر نہیں ہُوا تھا۔ وہ اب بھی اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سمجھتے تھے؛ چنانچہ اخبارات نے اُس کے جنم دن پر اُس کی بڑی بڑی تصویریں، اس کی عظمت کے بارے میں مضامین اور اس کی نظموں کے تراجم (انگریزی اخبارات میں) نمایاں طور پر شائع کیے۔ بنگالی لڑکوں اور لڑکیوں نے ٹیگور کی نظمیں گائیں اور اس کے گیتوں پر مبنی سنگیت سبھاؤں کا اہتمام کیا ــــ خود مجیب جلوت و خلوت میں ٹیگور کے شعر اور مصرعے گنگنایا کرتے تھے۔

بنگالی قومیت کو فروغ دینے اور بین الصوبائی رابطوں کو کمزور کرنے کے لیے عوامی لیگ کی مہم کی ایک اور مثال دو درسی کتابیں ہیں۔ ایک کتاب تھی "دیش و کرشتی" (دھرتی اور لوگ)۔ حکومت نے یہ کتاب ثانوی درجے کے نصاب میں شامل کردی تاکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نظریاتی رشتوں کو اُجاگر کیا جاسکے۔ یہی بات عوامی لیگ کی اُمنگوں کے خلاف تھی؛ چنانچہ اس کے ایما پر طلبہ نے اس کتاب کو نصاب سے خارج کرانے کے لیے زبردست مہم چلائی اور بہانہ یہ بنایا کہ اس کے الفاظ بوجھل ہیں اور طلبہ کو سمجھنے میں دُشواری پیش آتی ہے ــــ حالانکہ درحقیقت اسلامی رشتے کا ذکر ان کو بوجھل لگتا تھا اور اسے ہضم کرنے میں دُشواری پیش آتی تھی ــــ اس کے برعکس قمرالدین کی کتاب "سوشل ہسٹری" (سماجی تاریخ) تھی جس میں مشرقی پاکستان کا ثقافتی رشتہ کلکتہ سے ملایا گیا۔ اس پر حکومت نے پابندی لگادی تھی، مگر طلبہ نے اس پابندی کے خلاف ایک پُرزور تحریک چلائی اور صوبے کے ممتاز شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ خود مجیب نے اس کی حمایت میں یہ بیان دیا: "بنگالی زبان کے لیے ۱۹۵۲ء کی تحریک کو کچلا نہ جاسکا ــــ ہم اب بھی بنگالیوں کے تہذیبی ورثے پر اس حملے کی پُرزور مزاحمت کریں گے۔"[1]

دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ عوامی لیگ کے رویّے کی بنیادی قدر بھی یہی تھی کہ آیا وہ دونوں صوبوں کے درمیان یگانگت پھیلاتی ہیں یا منافرت! جنوری میں اس نے جماعتِ اسلامی کے جلسے کو مبینہ طور پر اس لیے درہم برہم کیا تھا کہ یہ دونوں صوبوں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی تھی ــــ اس ابتدائی واقعہ سے عوامی لیگ نے جماعت پر ایسی کاٹھی ڈالی کہ آئندہ انتخابی مہم کے دوران بھی اس نے اپنا غلبہ قائم رکھا اور جماعت دب کر رہ گئی ــــ اس کے علاوہ عوامی لیگ نے پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے جلسوں میں یکم فروری، ۲۸ فروری اور ۷ مارچ کو بالترتیب ڈھاکہ، چاٹگانگ اور سید پور میں گڑبڑ کی اور ۱۰ مارچ، ۱۵ مارچ اور ۱۲ اپریل کو کومیلا، باریسال اور ڈھاکہ میں کنونشن مُسلم لیگ کے جلسوں کو ناکام بنایا۔ اسی طرح کئی اور مقامات پر اس نے اپنے سیاسی حریفوں کے قدم جمنے نہ دیے۔

مجیب کے بڑے بڑے حریف مثلاً فضل القادر چودھری، خان عبدالصبور خان، مسٹر نورالامین، پروفیسر غلام اعظم اور مولوی فرید احمد وغیرہم سیاسی دنگل میں مجیب کو براہِ راست چیلنج کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اپنے اپنے حلقے میں اثر و رسوخ تھا، مگر صوبائی سطح پر مجیب سے ٹکر لینا ان کے بس میں نہ تھا؛ البتہ مولانا عبدالحمید بھاشانی اس پوزیشن میں تھے کہ پلٹن میدان میں کھلے عام مجیب کی سی گھن گرج کے ساتھ چنگھاڑ سکتے تھے۔ وہ کئی بار سامنے آئے، خوب گرجے برسے مگر پھر مطلع صاف، کیونکہ مولانا کسی سیاسی مقصد کے لیے کوئی مربوط، مسلسل یا منظم مہم چلانے کا ملکہ نہ رکھتے تھے۔ وہ ایک بار گرجتے پھر مدھم پڑ جاتے۔ ایک دفعہ آگے بڑھتے پھر پیچھے ہٹ جاتے اور جب چاہتے اپنا موقف

---

[1] پاکستان آبزرور، ڈھاکہ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء

بآسانی تبدیل کر لیتے، مثلاً انہوں نے عوام کے مسائل حل کرانے کے لیے یکم اگست کو عوامی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ یکم اگست قریب آنے لگا تو اسے ۸ ستمبر تک ملتوی کر دیا۔ جب نئی تاریخ قریب پہنچی تو ۲۰ اکتوبر بتادی اور آخر میں کچھ بھی نہ ہُوا ۔ ٹائیں ٹائیں فش ! ایسی حرکتوں سے مشرقی پاکستان کی سیاست میں ان کی اہمیت بتدریج کم ہوتی گئی۔

مشرقی پاکستان کی سیاست کا یہ عروج و زوال — یعنی عروج مجیب کا اور زوال اس کے حریفوں کا — دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں آنے والے دُھندلے دَور کی تصویر واضح ہوتی گئی اور ہمیں احساس ہونے لگا کہ آئندہ انتخابات میں عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائے گی، مگر سوال یہ تھا کہ اگر ایسا ہُوا، تو پاکستان کا کیا بنے گا ؟ اس خطرے کو روکنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے ؟

یہ مسئلہ ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس میں بھی اُٹھایا گیا جس کی صدارت خود جنرل یحییٰ خاں کر رہے تھے۔ یہ کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہُوئی تھی اور تمام صوبوں کے گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں نے شرکت کی تھی۔ وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن (گورنر مشرقی پاکستان) کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس کانفرنس میں یہ نکتہ اُٹھایا تھا "مزید بحث کرنے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت چاہتا ہُوں کہ آیا چھ نکات کا پرچار کرنا مارشل لا ریگولیشن نمبر ۱۶ کی خلاف ورزی ہے جو قومی سالمیت کے خلاف کوئی بات کہنے کی ممانعت کرتا ہے ؟" — ایڈمرل احسن کا ارشاد ہے کہ انہیں یہ کہہ کر خاموش کرا دیا گیا "آپ فکر نہ کریں —"

البتہ مُلک میں ایسے بے شمار لوگ تھے جو اس بارے میں فکرمند تھے۔ غالباً انہی کے خدشات دُور کرنے کے لیے جنرل یحییٰ خاں نے ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر نشریاتی اداروں کے ذریعے قوم کو یقین دلایا تھا "میں ایسی کوئی بات قبول نہیں کروں گا جو ہماری قومی سالمیت کے منافی ہو۔" اس یقین دہانی کے اگلے روز قانونی ڈھانچا (ایل ایف او) بھی جاری کر دیا گیا جس کی بنیادی شقیں دو تھیں یعنی مملکت کا اسلامی کردار اور قومی سالمیت کی گارنٹی[1] — مجھے یہ دونوں خصوصیات پڑھ کر بہت اطمینان ہُوا، کیونکہ اس سے عوامی لیگ کے سیاسی موقف کی نفی ہوتی تھی جس کے ذریعے ایک طرف مُلک میں سیکولر نقطۂ نظر پھیلایا جا رہا تھا اور دوسری طرف عملاً دو صوبائی وحدتوں کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی۔

یہ قانونی ڈھانچہ مجیب کو بہت ناگوار گزرا، خاص کر اس کی دفعات ۲۵ اور ۲۷ جن میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ کوئی آئین اس وقت تک قابلِ نفاذ نہیں ہو گا جب تک کہ اس پر (صدرِ مملکت کی) مُہر تصدیق ثبت نہیں ہو جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجیب الرحمٰن قومی اسمبلی میں (جو ابتدائی ۹۰ دنوں کے لیے قانون ساز اسمبلی تھی) اکثریت حاصل کر بھی لیتے تو بھی چھ نکات پر مبنی آئین کو نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا تاآنکہ یحییٰ خاں اس پر صاد نہ کریں۔ اسی قدغن سے مشتعل ہو کر مجیب الرحمٰن نے کہا تھا "میں انتخابات ختم ہوتے ہی ایل ایف او کے پُرزے کر دوں گا۔"

گویا جنرل یحییٰ خاں راولپنڈی میں بیٹھے کچھ اور اعلان کر رہے تھے اور مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان میں کچھ اور کرنے کے درپے تھے۔ یہ تضاد دُور کرنے اور حالات کا خود جائزہ لینے کے لیے صدرِ مملکت ڈھاکہ تشریف لائے اور ۴ اپریل کو مجیب کو طلب فرمایا۔ جب مجیب وہاں پہنچے تو میں بھی موجود تھا۔ صدر یحییٰ خاں نے بڑی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، جب وہ مسائل سے دست و گریباں ہونے لگے تو میں باہر نکل آیا — کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے ڈھونڈ کر ایک دوست کے گھر سے بُلوایا گیا، کیونکہ کیبنٹ ڈویژن کی جانب سے ایک سرکاری اعلامیہ

---

[1] پاکستان ٹائمز، راولپنڈی - ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء

جاری کرنا تھا جس کے ذریعے ایل ایف او کی "قابلِ اعتراض" دفعات (۲۵ اور ۲۷) میں ترمیم مقصود تھی۔ میں نے مسودہ تیار کر کے دے دیا اور چلا آیا۔ خوش قسمتی سے یہ اعلامیہ روک لیا گیا کیونکہ دریں اثنا کسی نے یحییٰ خاں کو مشورہ دیا تھا "حضور! سیاست دانوں کے سامنے اپنے آپ کو یوں بے دست و پا نہ کیجیے۔"

۱۰ اپریل کو یحییٰ خاں مغربی پاکستان روانہ ہوئے۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا اور ایل ایف او کی نزاعی دفعات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ ایک صحافی نے صدر کی "مہرِ تصدیق" سے متعلق دفعہ پر عوامی لیگ کے اعتراض کی طرف توجہ دلائی، یحییٰ خاں نے کہا: "یہ تو محض ضابطے کی خانہ پُری ہے، ورنہ میں ان اختیارات کو استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" یہ سُن کر عوامی لیگ کے حامی ایک صحافی نے میرے کان میں کہا: "صدر نے مجیب کو یقین دلایا ہے کہ یہ اختیارات استعمال کے لیے نہیں ہیں، ان کی حیثیت برطانوی آئین کے تحت ملکہ یا بادشاہ کے اختیارات سے زیادہ نہیں۔"

مجھے اندازہ نہیں اس یقین دہانی کے بدلے یحییٰ خاں کو کیا ملا؛ البتہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس سے مجیب کا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ وہ واقعی ہردلعزیزی کی اُس معراج پر ہے جہاں یحییٰ خاں بھی اس کی خواہشوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یحییٰ خاں اور مجیب کی مفاہمت کو بمشکل دو مہینے گزرے ہوں گے کہ جنابِ مجیب نے پھر پُر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ انہوں نے ۴ر جون کو اعلان کیا: "میری پارٹی آئندہ انتخابات کو چھ نکات پر ریفرنڈم سمجھتی ہے۔"[۳۰] یہ ایک خطرناک اعلان تھا جس کا مسٹر نورالامین نے فوراً نوٹس لیا اور کہا: "اگر آئندہ انتخابات کو چھ نکاتی پروگرام پر ریفرنڈم تسلیم کر لیا گیا اور مغربی پاکستان نے اس کی حمایت نہ کی تو دونوں صوبے الگ ہو جائیں گے۔"[۳۱] اس پر مجیب اور برہم ہوئے اور چیلنج کے انداز میں بولے "ہم نے گاندھی نہرو اور ان کے انگریز سرپرستوں کی مخالفت کے باوجود ۱۹۴۶ء کا ریفرنڈم جیت لیا تھا اور اس مرتبہ بھی نورالامین اور ان کے سرپرستوں (مغربی پاکستان) کی مخالفت کے باوجود فتح ہماری ہوگی۔"[۳۲]

یہ مثال کوئی نیک شگون نہ تھی کیونکہ بانیٔ پاکستان نے ۱۹۴۶ء کے ریفرنڈم کو قیامِ پاکستان کی تمہید بنایا تھا۔ کیا مجیب الرحمٰن بھی کوئی نئی مملکت بنانے کے درپے تھے؟ یحییٰ خاں کے ایک معتمد نے ڈھاکہ میں مجیب سے اس کی وضاحت چاہی تو وہ صاف مُکر گئے۔ کہنے لگے: "نہیں نہیں، میرا تو ایسا کوئی منشا نہیں۔" یہ مجیب کی پہلی قلابازی تھی نہ آخری۔ یہ دراصل ان کے کردار کا لازمی جزو تھا۔ مجھے کئی ایسے واقعات یاد ہیں جب وہ سرِعام شیر کی طرح گرجتے مگر اندر خانے حکام کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔ اس دوعملی کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف عوام مجیب کی طرف کھنچے آتے تھے اور دوسری طرف حکام بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اسی حکمتِ عملی کے ذریعے وہ سیاست کے اوجِ ثریا کی طرف مائل بہ پرواز رہے۔

---

۳۰ پاکستان آبزرور ڈھاکہ۔ ۵ر جون ۱۹۷۰ء ۳۱ پاکستان آبزرور ڈھاکہ۔ ۶ر جون ۱۹۷۰ء ۳۲ پاکستان آبزرور ڈھاکہ۔ ۷ر جون ۱۹۷۰ء



جنرل آغا محمدؐ یحییٰ خاں
صدرِ پاکستان

باب ۴

مارشل لا کا تمسخر

حکومت اس سیاسی مدوجزر کا تماشا دیکھتی رہی ۔ "مد" عوامی لیگ کا اور "جزر" اس کے حریفوں کا ۔ سول یا فوجی انتظامیہ نے واقعات کے بہاؤ میں کوئی مداخلت نہ کی اور اگر اس نے چند اقدام کیے بھی تو ان کا فائدہ مجیب ہی کو پہنچا ۔ وہ انتخابی مہم کے دوران بتدریج عوام کی خاموش اکثریت کو خوف زدہ کر کے اپنی حمایت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ شاید صوبائی حکومت یحییٰ خاں کے نرم رویئے کی یہی توضیح سمجھتی تھی ۔

جنرل یحییٰ خاں نے مجیب کی طرف نرم رویّہ کیوں اختیار کیا؟ آخر ایک ڈکٹیٹر کو کیا پڑی تھی کہ ایک سیاسی لیڈر کے مطالبات پر مطالبات مانتا جائے (مثلاً ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول' ون یونٹ کی تنسیخ) اور وہ بھی ایسے شخص کے جس پر اس کے پیش رو (فیلڈ مارشل ایوب خاں) نے غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا تھا ۔ عام قیاس یہ تھا کہ یحییٰ خاں' مارشل لاء اٹھ جانے کے بعد بھی ملک کا صدر رہنا چاہتے ہیں ۔ یہ ایسی خواہش تھی جس کی تکمیل مجیب الرحمٰن کی تائید کے بغیر ممکن نہ تھی ۔ پتہ نہیں اس قیاس میں حقیقت کتنی تھی ۔ میں نے تو جنرل یحییٰ کی زبانی اس نرمی کی وجہ یہی سُنی : "مجھے پاکستان کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کو ساتھ لے کر چلنا ہے ۔ اگر مجیب اس کی نمائندگی نہیں کرتا ' تو کون کرتا ہے ؟"

امورِ مملکت کو بیشک خسرواں ہی بہتر سمجھتے ہیں ۔ یحییٰ خاں کی مجبوریاں بھی انہی کو معلوم ہوں گی ۔ مجھے تو اتنا علم ہے کہ عوامی لیگ نے اس نرم پالیسی سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا اور وہ اس میں کامیاب ہُوئی ۔ گورنمنٹ ہاؤس یا مارشل لاء ہیڈ کوارٹر نے اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کی کوئی کوشش کی نہ دوسرے سیاسی گھوڑوں کو ریس جیتنے کے لیے تھپکی دی ۔ وہ غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھے سرِبام کھڑے تماشا دیکھتے رہے ۔

یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو جب وائس ایڈمرل ایس ایم احسن مشرقی پاکستان کے گورنر بنے ' صوبائی نظم و نسق کی ذمہ داری یُوں تقسیم کی گئی کہ امن و امان قائم رکھنا سول انتظامیہ کا کام ہو گا اور مارشل لاء مشینری جس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں تھے اسی وقت حرکت میں آئے گی جب سول انتظامیہ بے دست و پا ہو جائے یا حالات اسے بے اثر کر دیں ۔ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب دونوں ہی اپنے اپنے شعبوں کے حاکمِ اعلیٰ تھے ۔ ایک دوسرے کے آگے جواب دہ نہ تھا ۔ دونوں براہِ راست جنرل یحییٰ کے ماتحت تھے جو بیک وقت چار عہدوں پر فائز تھے ۔ صدر' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر' افواجِ پاکستان کے سپریم کمانڈر اور برّی فوج کے کمانڈر انچیف ۔

جنرل یعقوب اپنے منکسرانہ ذہن' ملائم طبیعت اور شائستہ اخلاق کے لیے مشہور تھے ۔ وہ مسائل کو سمجھنے اور آنے والے طوفان کا قبل از وقت

اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے جس سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُن میں بدرجہ اتم موجود تھی ۔ ایڈمرل احسن کو ان کی مرضی کے خلاف ٹیوی کی سربراہی سے ہٹا کر گورنری کی گدی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان میں ڈپلومیٹ کی گوشہ نشینی، عالم کا حلم اور سفیر کی ضابطہ پسندی جیسی نادر خصوصیات تھیں۔ یہ اوصاف جو کسی اور عہدے کے لیے قیمتی سرمایہ ہو سکتے تھے ان بحرانی حالات میں زنجیر پا ثابت ہوئے۔ گورنر کی سرکاری ذمہ داریاں کسی اور طرح کی خوبیوں کا تقاضا کرتی تھیں۔ مثلاً غیر معمولی سیاسی بصیرت، بہترین انتظامی مہارت، مجلسی مزاج اور قابلِ عمل نظریات ——

گورنر احسن کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ انہیں صدر کا اعتماد حاصل تھا نہ فوج کی کمان میسر تھی؛ حالانکہ ان دونوں طاقت کے یہی دو سرچشمے تھے۔ صدر کے ساتھ ان کے مراسم محض رسمی تھے۔ سربراہِ مملکت جب ڈھاکہ تشریف لاتے تو تقریباتی ضابطے کے مطابق ایڈمرل احسن ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کرتے۔ انہیں لے کر ایوانِ صدر پہنچاتے اور خود گورنمنٹ ہاؤس کی آماجگاہ میں چلے جاتے، پھر شاذ و نادر ہی صدر سے ملنے آتے سوائے اس کے کہ انہیں وہاں طلب کیا جائے یا کسی فوری کام کا تقاضا ہو۔

جب عسکری حلقوں سے ایڈمرل احسن کو ملنے والی حمایت کا یہ عالم تھا، تو انہیں مجبوراً اپنے بنگالی چیف سیکرٹری مسٹر شفیع الاعظم کا سہارا لینا پڑا۔ یہ بنگالی بیوروکریٹ بڑے کائیاں تھے۔ عوامی لیگ کا کھیل کھیلنے کے باوجود بیک وقت گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو خوش رکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہ صاحب ایک سخت جلد رکھنے والے کچھوے کی مانند تھے جو حسبِ ضرورت اپنی گردن آگے بڑھانے اور بروقت اسے اندر کھینچ لینے میں طاق تھا۔ وہ ان حربوں کے ذریعے خوب جانتے تھے کہ عوامی لیگ کو جرنیلوں کے مقابلے میں کس طرح کامیاب کرانا ہے۔ عوامی لیگ خوش تھی کہ یہ حضرت اس کلیدی آسامی پر فائز ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جنرل یحییٰ خاں نے انہیں عوامی لیگ کے کہنے پر یہ مقام دے رکھا ہے۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان پر انتظامیہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مارشل لا عام قانون سے بھی زیادہ غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔ گورنر احسن نے بعد میں اپنی کمزوری کا یہ جواز پیش کیا کہ بڑے بڑے جرائم مارشل لا ضابطوں کی زد میں آتے تھے جنہیں نافذ کرنے کا اختیار صرف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر (جنرل یعقوب) کو تھا اور وہ صرف یحییٰ خاں کو جواب دہ تھے، مجھے نہیں ۔

انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری اور عوامی لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ امن و امان کی حالت خراب ہو گئی۔ صنعتی، تجارتی اور تعلیمی زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی۔ ہر شعبۂ زندگی میں غیر یقینی، افراتفری اور بے راہ روی در آئی۔ اس کا سب سے بڑا اثر فیکٹریوں اور کارخانوں پر پڑا۔ آئے دن ہڑتال، کام بندی اور تالا بندی۔ بعض اوقات تو فیکٹریاں یوں کھٹا کھٹ بند ہونے لگتیں جیسے ان کے پیچھے کوئی طلسماتی ہاتھ کام کر رہا ہو۔

آدم جی جوٹ مل، نشتر جوٹ مل، کھلنا جوٹ مل، چٹاگانگ اسٹیل مل، ڈرکم اسٹیل مل اور پیپر مل جیسے اہم ادارے طویل عرصے کے لیے بند رہتے اور جب کبھی کھلتے، تو میدانِ کارزار بن جاتے۔ کبھی مزدوروں کے اپنے گروہوں میں لڑائی اور کبھی آجروں اور مزدوروں کے درمیان معرکہ آرائی۔ مارشل لا انتظامیہ حسبِ توفیق چیدہ چیدہ شرپسندوں کو جیل میں ڈالتی رہی مگر اس سے کوئی خاص افاقہ نہ ہوا، بلکہ اُلٹا اشتعال بڑھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۹ اور ۳۰ مئی کو تقریباً دس ہزار مزدوروں نے کھلنا جیل کے دروازے توڑ کر اپنے مقید ساتھیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی۔

اس سے ایک ہفتہ پہلے مزدوروں کے ایک اور مشتعل ہجوم نے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (مسٹر فضل الرحمٰن چوہدری)

اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھتے تھے ـــ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے جس سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُن میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایڈمرل احسن کو ان کی مرضی کے خلاف ٹیوی کی سربراہی سے ہٹا کر گورنری کی گدی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان میں ڈپلومیٹ کی گوشہ نشینی، عالم کا حلم اور سفیر کی ضابطہ پسندی جیسی نادر خصوصیات تھیں۔ یہ اوصاف جو کسی اور عہدے کے لیے قیمتی سرمایہ ہو سکتے تھے ان بحرانی حالات میں زنجیر پا ثابت ہوئے۔ گورنر کی سرکاری ذمہ داریاں کسی اور طرح کی خوبیوں کا تقاضا کرتی تھیں۔ مثلاً غیر معمولی سیاسی بصیرت، بہترین انتظامی مہارت، مجلسی مزاج اور قابل عمل نظریات ـــ

گورنر احسن کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ انہیں صدر کا اعتماد حاصل تھا نہ فوج کی کمان میسر تھی؛ حالانکہ ان دونوں طاقت کے یہی دو سرچشمے تھے۔ صدر کے ساتھ ان کے مراسم محض رسمی تھے۔ سربراہ مملکت جب ڈھاکہ تشریف لاتے، تو تقریباتی ضابطے کے مطابق ایڈمرل احسن ایرپورٹ پر ان کا استقبال کرتے۔ انہیں لے کر ایوان صدر پہنچاتے اور خود گورنمنٹ ہاؤس کی آماجگاہ میں چلے جاتے، پھر شاذو نادر ہی صدر سے ملنے آتے سوائے اس کے کہ انہیں وہاں طلب کیا جائے یا کسی فوری کام کا تقاضا ہو۔

جب عسکری حلقوں سے ایڈمرل احسن کو ملنے والی حمایت کا یہ عالم تھا، تو انہیں مجبوراً اپنے بنگالی چیف سیکرٹری مسٹر شفیع الاعظم کا سہارا لینا پڑا۔ یہ بنگالی بیوروکریٹ بڑے کائیاں تھے۔ عوامی لیگ کا کھیل کھیلنے کے باوجود بیک وقت گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو خوش رکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہ صاحب ایک سخت جلد رکھنے والے کچھوے کی مانند تھے جو حسب ضرورت اپنی گردن آگے بڑھانے اور بروقت اسے اندر کھینچ لینے میں طاق تھا۔ وہ ان حربوں کے ذریعے خوب جانتے تھے کہ عوامی لیگ کو جرنیلوں کے مقابلے میں کس طرح کامیاب کرانا ہے۔ عوامی لیگ خوش تھی کہ یہ حضرت اس کلیدی آسامی پر فائز ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جنرل یحییٰ خاں نے انہیں عوامی لیگ کے کہنے پر یہ مقام دے رکھا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان پر انتظامیہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مارشل لا عام قانون سے بھی زیادہ غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔ گورنر احسن نے بعد میں اپنی کمزوری کا یہ جواز پیش کیا کہ بڑے بڑے جرائم مارشل لا ضابطوں کی زد میں آتے تھے جنہیں نافذ کرنے کا اختیار صرف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر (جنرل یعقوب) کو تھا اور وہ صرف یحییٰ خاں کو جواب دہ تھے مجھے نہیں۔

انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری اور عوامی لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ امن وامان کی حالت خراب ہو گئی۔ صنعتی، تجارتی اور تعلیمی زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی۔ ہر شعبۂ زندگی میں غیر یقینی، افراتفری اور بے راہروی در آئی۔ اس کا سب سے بڑا اثر فیکٹریوں اور کارخانوں پر پڑا۔ آئے دن ہڑتال، کام بندی اور تالا بندی بعض اوقات تو فیکٹریاں یوں کھٹا کھٹ بند ہونے لگیں جیسے ان کے پیچھے کوئی طلسماتی ہاتھ کام کر رہا ہو۔

آدم جی جوٹ مل، نشتر جوٹ مل، کھلنا جوٹ مل، چٹاگانگ اسٹیل مل، کرم اسٹیل مل اور پیپر مل جیسے اہم ادارے طویل عرصے کے لیے بند رہتے اور جب کبھی کھلتے، تو میدان کارزار بن جاتے۔ کبھی مزدوروں کے اپنے گروہوں میں لڑائی اور کبھی آجروں اور مزدوروں کے درمیان معرکہ آرائی۔ مارشل لا انتظامیہ حسب توفیق چیدہ چیدہ شرپسندوں کو جیل میں ڈالتی رہی مگر اس سے کوئی خاص افاقہ نہ ہوا، بلکہ اُلٹا اشتعال بڑھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۹ اور ۳۰ مئی کو تقریباً دس ہزار مزدوروں نے کھلنا جیل کے دروازے توڑ کر اپنے مقید ساتھیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی۔

اس سے ایک ہفتہ پہلے مزدوروں کے ایک اور مشتعل ہجوم نے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (مسٹر فضل الرحمن چودھری)

کو عین اُس وقت ہلاک کر دیا تھا جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکہ بندی ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلوائیوں نے مقتول کی لاش کو گھسیٹا اور مسخ کیا۔ اس بے چارے کا قصور ہجوم کی نظر میں یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان کا "پٹھو" تھا — جناب مجیب جو بنگالی چڑیا بھی مرتی تھی تو دندناتا ہُوا بیان داغ دیتے تھے، ایک فرض شناس پولیس آفیسر کی موت پر خاموش رہے۔

صنعتی افراتفری کے اس دَور میں مَیں اسٹیشن روڈ (ڈھاکہ) پر ایک فرم (ڈھاکہ ڈائنگ) میں کپڑے کی چند مصنوعات خریدنے گیا۔ اس فرم کی جدید مشینری اور خوبصورت پارچات کی بڑی دُھوم تھی۔ مینیجر نے میری وضع قطع سے میرے فوجی ہونے کا اندازہ لگایا اور اپنا دُکھڑا سُنانے لگا۔ اس نے کہا:

"جناب ہم نے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی غیر ملکی مشینری منگوا کر لگائی جس سے سالانہ ساڑھے بارہ کروڑ روپے کی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں۔ ہم نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی مالیت کی چیزیں ملکی ضروریات کے لیے الگ رکھنے کے بعد بعض غیر ملکی فرموں سے برآمدات کا معاہدہ کیا۔ اُدھر معاہدہ ہُوا اور اِدھر ہڑتالوں نے زور پکڑا۔ فیکٹری بند رہنے لگی اور ہم وقت پر اشیاء سپلائی نہ کر سکے۔ اب ایک ہفتے سے سنگاپور کی ایک فرم کا نمائندہ آیا بیٹھا ہے تاکہ اپنی چیزیں اپنے سامنے جہاز پر لدوا سکے۔ مگر میں اس کو کیا جواب دُوں؟ بیشک اس کا رویہ ہمدردانہ ہے اور وہ ہماری مجبوریوں کو سمجھتا ہے مگر اُس کا اصرار ہے کہ مجھے کوئی حتمی تاریخ بتاؤ جب مال دستیاب ہوگا۔ آپ ہی بتائیے مَیں اسے کس طرح کوئی تاریخ بتاؤں جب مجھے یہی پتہ نہیں کہ فیکٹریاں کھلیں گی بھی یا نہیں اور اگر کھلیں گی تو کتنے دنوں کے لیے....؟"

مَیں نے کہا: "آپ نے حکام کو اس صورت حال سے آگاہ نہیں کیا؟"

"جناب! ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ۔ مَیں جب بھی مارشل لا والوں کے پاس جاتا ہُوں تو وہ یہی کہتے ہیں یہ سول کا معاملہ ہے۔ جب سول والوں کے پاس جاتا ہُوں تو وہ میٹھی میٹھی باتوں پر ٹرخا دیتے ہیں لیکن ایکشن نہیں لیتے۔ یُوں معلوم ہوتا ہے یہاں سرے سے کوئی حکومت ہے ہی نہیں۔ کم از کم میرے لیے تو کوئی حکومت نہیں جو میرا مسئلہ حل کر سکے۔"

مزدوروں کے علاوہ طلبہ بھی بدامنی پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ گرمیوں کے آغاز میں انہیں امتحانات نے موقع مہیّا کیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ جن کا بائیکاٹ نہ کیا، ان کے نگرانوں اور ممتحنوں کا گھیراؤ کر کے انہیں زدوکوب کیا۔ بعض مقامات پر چاقو چھریاں بھی چلیں۔ جہاں کہیں وہ ترنگ میں آئے کھڑکیوں کے شیشے، بجلی کے قمقمے اور فرنیچر توڑ پھوڑ دیا یا اسے آگ لگا دی — جب امتحانوں کا زمانہ گزر گیا، تو انہوں نے اپنے دیرینہ "گیارہ نکات" نکال لیے اور انہیں تسلیم کروانے کے لیے تحریک شروع کر دی۔ ان مطالبات کا تعلیمی مسائل سے بہت کم تعلق تھا۔ وہ سراسر سیاسی نوعیت (صوبائی خود مختاری وغیرہ) کے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہی اساتذہ جو امتحانات کے سلسلے میں طلبہ کے ہاتھوں پٹتے تھے، مطالبات منوانے کے لیے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

مزدوروں اور طالب علموں کی پھیلائی ہُوئی یہ وبا سرکاری ملازمین تک بھی پہنچ گئی۔ ماہ جون کے شروع میں کوئی سولہ ہزار سرکاری ملازموں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کر دی۔ حکومت نے اس ہڑتال کو غیر قانونی قرار دے کر دبا دینا چاہا، مگر مجیب الرحمٰن نے ہڑتالیوں کی حمایت میں بیان دے کر اُن کو شیر بنا دیا۔ مجیب نے گورنر کے نام ایک تار بھی دیا کہ ان کے مطالبات فوراً مان لیے جائیں۔[1] سرکاری

---

[1] روزنامہ مارننگ نیوز، ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۰ء۔

ملازموں نے اس سے یہ تاثر لیا کہ ان کی ہمدرد حکومت نہیں، مجیب الرحمٰن ہے۔

ان کی دیکھا دیکھی سنار، صحافی، خاندانی منصوبہ بندی کے عملے، چمڑے کے کارخانوں اور چائے کے باغوں میں کام کرنے والوں نے بھی ہڑتالیں شروع کر دیں۔ ان سب نے اپنے اپنے مطالبات کو باقاعدہ "نکات" کی شکل دی۔ مختلف طبقوں کے نکات کی تعداد مختلف تھی۔ کسی کی تین، کسی کی پانچ اور کسی کی پندرہ ــ یہ رجحان نقطۂ عروج کو اس وقت پہنچا جب ۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کو گداگروں نے بھی ایک انجمن قائم کر کے اپنے مطالبات منوانے کے لیے پلٹن میدان میں ایک جلسہ کر ڈالا۔[1]

ان احتجاجی مظاہروں کے اثر کو دو آتشہ بنانے کے لیے بارودی دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کی ابتداء ۵ مئی کو توپخانہ روڈ پر واقع قومی یکجہتی کونسل سے ہوئی (اس عمارت کے انتخاب کی وجہ اس کے نام سے ظاہر ہے)۔ ۵ مئی کو شام کے ساڑھے سات بجے تھے۔ کونسل کی بالائی منزل پر لائبریری میں بہت سے لوگ مطالعے میں مصروف تھے۔ تین لڑکے اندر داخل ہوئے، انھوں نے حاضرین سے کہا: "یہ لائبریری خالی کر دو، ہم اس میں بم پھینکنے آئے ہیں۔"

لوگوں نے بلا چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی اور باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان صاحبزادوں نے دو بم پھینکے اور اطمینان سے جیپ میں بیٹھ کر چلتے بنے۔ لوگ گلی میں کھڑے آگ میں جلتے فرنیچر کا تماشا دیکھتے رہے۔ کسی شخص نے نہ اس وقت ان شرپسندوں پر ہاتھ ڈالا اور نہ بعد میں آنے والے تحقیقاتی افسروں سے تعاون کیا۔

بموں کے دھماکے پے در پے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے ہوا کرتے۔ جیسے ہی ذرا سکون ہونے لگتا، نیا دھماکہ نیا ارتعاش پھیلا دیتا۔ ان دھماکوں کی خبریں کھلنا، سیتا گانگ، رنگ پور اور دوسرے شہروں سے بھی آ رہی تھیں، مگر ان کا اصل زور اعصابی مرکز ڈھاکہ میں تھا جہاں ان کا اثر زیادہ لیا جاتا تھا۔

انتظامی بدنظمی، صنعتی انتشار اور دہشت گردی نے ہراس اور بے یقینی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ امن پسند شہری گھروں کے اندر رہنا زیادہ محفوظ سمجھتے تھے، کیونکہ گلیاں موت کے کوچے بن گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے انھی دنوں میں ایک مہمان کو لے کر ڈھاکہ کے اردو شاعر ظہور الحق کے گھر گیا ـــــــ ظہور الحق اندرونِ شہر رہتے تھے۔ ہم خاصی دیر ان کے آہنی پھاٹک پر دستک دیتے رہے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ جب ہمت ہارنے لگے، تو ایک ملازم آیا اور پہلے تو اندر سے جھانک کر ہمارا جائزہ لیتا رہا، پھر ہمارا نام وغیرہ پوچھ کر اندر گیا اور خصوصی اجازت ملنے پر اندر لے گیا۔ میزبان نے موسمی مشروب اور تازہ غزل سے ہماری تواضع کی۔ غزل میں حسن و عشق کم اور بلبل کا نالہ زیادہ تھا۔ غزلیں سنانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا: "آپ فوجی لوگ ادھر کا رخ نہیں کرتے، حالانکہ آپ ہماری جان اور ناموس کے نگہبان ہیں۔ سنا ہے آپ نے فوجیوں کے لیے اندرونِ شہر کا علاقہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ ہم پر وقت کی ایک ایک ساعت کس قدر گراں گزرتی ہے۔"

واپسی پر میں ایک روزنامے کے دفتر میں رکا جہاں ایک بنگالی بیرسٹر سے ملاقات ہوئی جو اس اخبار کے لیے قانونی شذرے لکھتا تھا۔ چائے کی پیالی پر قدرتی طور پر حالاتِ حاضرہ زیرِ بحث آئے، اس نے کہا: "لاء کا تمسخر تو نہ اڑائیے خواہ یہ مارشل لاء ہی کیوں نہ ہو ــــ یا تو اسے حقیقی معنوں میں نافذ کیجیے یا اسے اٹھا لیجیے۔"

---

[1] روزنامہ پاکستان آبزرور، ڈھاکہ۔ مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۷۰ء۔

میں نے اپنی اگلی ملاقات میں مارشل لا کے غیر مؤثر ہونے کا ذکر جنرل صاحبزادہ یعقوب سے کیا۔ انہوں نے بات پلّے باندھ لی اور چند روز بعد مقامی ایڈیٹروں سے اپنی ماہانہ گفتگو میں اسے موضوع بنایا۔ انہوں نے مارشل لا کی بے اثری کا یہ جواز پیش کیا:

"پاکستان میں لوگ مارشل لا کو دہشت اور خوف کی علامت سمجھتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ مارشل لا ملک میں جمہوریت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مارشل لا اور جمہوریت متضاد ہیں۔ اگر مارشل لا اپنی روایتی شکل میں نافذ کیا جائے تو وہ جمہوریت کی نفی کرتا ہے مگر ان حالات میں جمہوریت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ مارشل لا کی کاٹ کو ذرا کُند رکھا جائے۔ بعض اوقات جب آپ لوگ سوچتے ہوں گے کہ کارروائی کیوں نہیں کی جا رہی ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کارروائی سے اُلٹا نقصان تو نہیں ہوگا۔ آپ ہوابازی کی اصطلاح میں یُوں سمجھیے کہ کوئی پائلٹ دورانِ پرواز یہ سمجھنے لگے کہ اس کا جہاز ٹیڑھا ہو رہا ہے اور وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے، حالانکہ اگر وہ جہاز کو نہ چھیڑتا تو تنگ وادی کے بیچوں بیچ بخیر و عافیت گزر جاتا۔"

بنگالی ایڈیٹر جنرل یعقوب کے استدلال اور استعارے سے بہت مرعوب ہوئے، مگر اُن کا تاثر اپنی جگہ قائم رہا کہ مملکت کا جہاز تشویشناک طور پر ڈگمگا رہا ہے اور اگر اسے بروقت سنبھالا نہ دیا گیا، تو تباہ ہو جائے گا۔

حکومت نے صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ نظم و نسق کی حالت خراب ہوتی گئی۔ صنعتی زندگی اُجڑ گئی، تعلیمی ادارے تعلیمی مقاصد کے لیے بند اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کے لیے کھلے رہے۔ عوامی لیگ کی ہر دلعزیزی اور دبدبہ روز بروز بڑھتا رہا اور اس کے سیاسی حریف یکے بعد دیگرے میدان چھوڑتے گئے۔

— یہ تھی وہ فضا جس میں دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات ہونے والے تھے۔

باب ۵

شیخ صاحب جیت گئے

عوامی لیگ درحقیقت پولنگ سے پہلے ہی انتخابات جیت چکی تھی۔ ۷ دسمبر اس کی رسمی توثیق کا دن تھا۔ اس کا احساس تقریباً سبھی لوگوں کو ہوچکا تھا اور انہوں نے الیکشن سے پہلے ہی چڑھتے سورج کی پرستش شروع کردی تھی۔ ڈھاکہ ٹیلی وژن کے بنگالی جنرل منیجر نے یکم دسمبر کو مجھ سے کہا: "مجھے شیخ صاحب کے پاس جاکر اس بات کی معذرت کرلینی چاہیے کہ ہم دور افتادہ علاقوں میں ان کے جلسوں کی تشہیر نہ کرسکے کیونکہ ہیڈ کوارٹر (راولپنڈی) سے حکم آیا تھا کہ صرف بڑے بڑے شہروں میں اپنی کیمرہ ٹیمیں بھیجیں۔ شیخ صاحب یقیناً اس پر خفا ہوں گے۔ وہ برسراقتدار آکر ممکن ہے آپ (یا وردی) لوگوں کو کچھ نہ کہیں لیکن مجھے ہرگز نہیں بخشیں گے۔"

ڈھاکہ کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایسے ہی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے ۲۲ مئی کو پوستوگولا میں مجیب کے حامی مزدوروں پر لاٹھی چارج کروایا تھا۔ مزدوروں نے ضرور میرا نام شیخ صاحب کو بتادیا ہوگا اور ان کو یہ واقعہ اب بھی یاد ہوگا۔ وہ مجھے نہیں بخشیں گے۔"

عام شہری کے احساسات کی ترجمانی میرے ایک دوست رحمن نے یوں کی: "ملک بدامنی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اگر عوامی لیگ انتخابات جیت گئی تو وہ حریفوں کی زندگی اجیرن کردے گی اور اگر نہ جیت سکی تو تشدد پر اتر آئے گی تاکہ کوئی اور اقتدار میں نہ آسکے۔ وہ ہر قیمت پر اپنا تسلط قائم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

فوجی حلقوں سے ملٹری انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا "حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے پر اگر شیخ صاحب نے اگرتلا سازش کیس کے کاغذات طلب کیے تو ان کو کئی مقامات پر غداری کا نام نظر آئے گا اور وہ اتنے باظرف اور کشادہ دل انسان نہیں کہ کسی کو معاف کردیں یا ان باتوں کو نظرانداز کردیں۔" فوج کے کئی سینیئر افسر جنہوں نے بظاہر مجیب کو ناراض کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی تھی وہ بھی اس کی حمایت میں زور بیان صرف کررہے تھے، وہ بلند بانگ چھ نکات کے گن گاتے اور عوامی لیگ کے منشور کی برکات گنواتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یوں مستقبل کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرسکیں گے۔

جب کہ فوجی اور غیر فوجی حلقوں کو عوامی لیگ کی فتح یقینی نظر آرہی تھی خود عوامی لیگ عجب ذہنی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کی حالت اس اتھلیٹ سے ملتی جلتی تھی جس نے دوڑ جیتنے کی پوری تیاری کر رکھی ہو لیکن اسے یقین نہ ہو کہ دوڑ ہوگی بھی یا نہیں اور اگر ہوئی تو اس کو اپنی محنت کا ثمر ملے گا یا نہیں۔ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے کئی افراد نے مجھ سے اور دوسرے حضرات سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہی کہ واقعی ۷ دسمبر کو حسب وعدہ الیکشن ہوں گے؟ اس تشویش کا باعث یہ افواہ تھی کہ بری فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل حمید نے جنرل یحییٰ سے اقتدار چھین لیا ہے۔ یحییٰ خاں بے بس ہیں اور حمید کسی وقت انتخابات منسوخ کرکے ایک نئے باب کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اتفاق

سے یہ دونوں جرنیل ان دنوں ڈھاکہ میں مقیم تھے۔

۲۰ دسمبر کو جنرل یحییٰ خاں مغربی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو ایک غیر ملکی صحافی نے خود ان سے پوچھ لیا "مسٹر پریذیڈنٹ! کیا اب بھی ملک کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے؟" صدر نے کہا "ہاں ہاں بالکل بالکل" صحافی بولا "مگر یہاں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ....." یحییٰ خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "سراسر بکواس... لغو" انہوں نے جھنجھلاہٹ میں بائیں جانب گردن موڑی (جہاں میں اور چند افسر کھڑے تھے) اور اپنی بھاری پلکیں تیز تیز جھپکتے ہوئے کہا "کون ہے جو میرے اختیارات میں شریک ہے؟ کون ہے؟؟... جب تک میں زندہ ہوں یہاں کوئی پَر نہیں مار سکتا" یہ کہتے ہی وہ ہونٹ بھینچے ڈنڈا گھماتے بوئنگ میں سوار ہو گئے۔

انتخابات کی تاریخ قریب پہنچی تو کوئی ایک سو غیر ملکی صحافی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ میں نے اس سے پہلے صحافیوں کی اتنی بڑی تعداد وہاں کبھی نہ دیکھی تھی؛ حالانکہ ہم سیلاب اور سائیکلون جیسے قومی سانحوں سے گزر چکے تھے۔ وزارت اطلاعات و نشر و اشاعت نے ان صحافیوں کے اعزاز میں ۶ دسمبر کو پوربانی ہوٹل میں عشائیہ دیا جس میں میں بھی مدعو تھا۔ کھانے کی میز پر میرے ساتھ تین غیر ملکی صحافی تھے۔ گفتگو کا موضوع اگلے روز کے الیکشن تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا:

"میجر، یہ بتاؤ تم اپنا ووٹ کس کو دو گے؟"

میں نے جواب دیا:

"صرف ایک ہی تو پارٹی ہے --- عوامی لیگ"

وہ اس جملے کو سنجیدہ جواب سمجھا اور صاد میں اپنا سر ہلانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں مارشل لا ہیڈکوارٹر گیا جو صوبائی اسمبلی کی عمارت میں واقع تھا۔ وہاں چند افسر بیٹھے غیر رسمی طور پر اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ آیا نظم و ضبط رکھنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ لگا دی جائے جس کے تحت چار یا چار سے زائد افراد کے اجتماع اور اسلحہ لے کر چلنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ جو افسر یہ پابندی لگانے کی حمایت کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر امن و امان بحال رکھنا ناممکن ہوگا اور جو اس کے مخالف تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ الیکشن کے دن یہ تجویز ناقابلِ عمل ہوگی۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک صاحب بلند آواز میں بولے "لیجیے ہمارا رائے عامہ کا "ماہر" آگیا اس سے پوچھتے ہیں" میں نے اپنے اُوپر ماہرانہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا:

"میں رائے عامہ کے متعلق اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اس موقع پر یہ پابندی موزوں نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کشیدہ ماحول میں یہ جلتی پر تیل کا کام کرے گی۔ عوامی لیگ کی جیت یقینی ہے۔ وہ اپنے مفاد میں امن و امان بھی بحال رکھے گی" تعجب کی بات کہ میرے اندازِ فکر کو واقعی ماہرانہ رائے سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا۔ میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔

الیکشن سے چار روز پہلے عساکرِ پاکستان (زیادہ تر بری فوج) کو انتخابات کی نگرانی سونپی گئی تھی۔ نگران کا دائرہ کار متعین کر دیا گیا تھا۔ راولپنڈی سے موصول ہونے والی ہدایات کا نچوڑ یہ تھا:

(ا) پولنگ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

(ب) صرف نازک مقامات (ٹیلیفون ایکسچینج، تار گھر، بنک، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ) پر نگاہ رکھی جائے۔

(ج) سپاہیوں کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے (تاکہ وہ اشتعال کا باعث نہ بنیں)

(د) صرف بلوے کو فرو کرنے کے لیے کارروائی کی جائے۔

ان ہدایات کی روشنی میں انتخابات کی "نگرانی" کرنے کے لیے مارشل لا ہیڈکوارٹر میں ایک "آپریشن روم" قائم کیا گیا۔ ۷ دسمبر کا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہوا۔ متعلقہ افسران نے آپریشن روم میں اپنے فرائض سنبھالے اور جنرل یعقوب ہیلی کاپٹر کے ذریعے پولنگ اسٹیشنوں کا فضائی جائزہ لینے گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ہم نے اوپر سے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے۔ مگر منظم اور پُرامن۔ جنرل صاحب یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

واپس آکر میں آپریشن روم میں بیٹھ گیا کیونکہ جملہ معلومات کا یہی مرکز تھا۔ دن کے ابتدائی حصے میں وہاں پر تعینات فوجی افسر چُپ چُپ اور کسی حد تک تناؤ کا شکار تھے مگر جب دوپہر تک کسی ناخوشگوار واقعے کی خبر نہ پہنچی تو وہ بتدریج نارمل ہونے لگے۔ ماحول میں ملائمت اور ان کے چہروں پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گپ شپ کا ماحول عود کر آیا۔ ہم گپ شپ لگاتے رہے اور ایک صاحب وائرلیس اور ٹیلیفون سے نپٹتے رہے۔ جو کوئی ان سے پوچھتا وہ اس کو پُرامن انتخابات کا مژدہ سنا دیتے۔ ایک دو بار راولپنڈی سے بھی فون آیا، انہیں بھی "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ دے دی گئی۔

پولنگ اسٹیشنوں پر حالت مختلف تھی۔ عوامی لیگ کے غنڈوں نے اکثر مقامات پر دبدبہ جما رکھا تھا۔ وہ مرضی سے ووٹ ڈلوا رہے تھے۔ پولنگ افسران اور پریذائیڈنگ افسروں نے اپنے مستقبل کے حکمرانوں کو من مانی کرنے کی چھٹی دے رکھی تھی۔ حریف جماعتوں کو داد رسی کے لیے فوجی افسروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا مگر وہ اس وقت تک مداخلت کرنے کے مجاز نہ تھے جب تک کہ امن عامہ میں خلل نہ پڑے۔ مثال کے طور پر دو واقعات درج کرتا ہوں:

ضلع نواکھلی میں چومہانی کے مقام پر ایک بارہ سالہ لڑکا "بنگلہ دیش زندہ باد" کے نعرے لگاتا پولنگ بوتھ میں ووٹ ڈالنے آیا۔ عوامی لیگ کا مخالف اُمیدوار اس لڑکے کو پکڑ کر کیپٹن چودھری کے پاس لے گیا جو اپنی پلاٹون سمیت ساتھ والی عمارت میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُمیدوار نے شکایت کی کہ اوّل تو یہ لڑکا عمر کے لحاظ سے ووٹ دینے کا اہل نہیں، دوم یہ پولنگ بوتھ میں نعرے لگا کر قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ کیپٹن صاحب نے عرضداشت ہمدردی سے سُنی مگر یہ کہہ کر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے معذرت کر لی کہ میں اس کا مجاز نہیں آپ پریذائیڈنگ افسر سے شکایت کیجیے۔

دوسرا واقعہ تنگیل سے متعلق ہے جہاں رحمٰن نامی شخص کو میجر خان کے سامنے پیش کیا گیا کیونکہ وہ پولنگ افسر کی ملی بھگت سے پانچویں مرتبہ اپنی پرچی ڈالنے جا رہا تھا۔ میجر صاحب نے شکایت سُننے کے بعد فرمایا: "بندہ نواز! آپ کا ارشاد دُرست۔ مگر یہ میرا دردِ سر نہیں کہ کون کتنی مرتبہ ووٹ ڈالتا ہے۔ مجھے یہ بتایئے کوئی خون خرابہ ہوا ہے یا نہیں؟"

سارا دن یہ تماشا دیکھنے کے بعد جب ۷ دسمبر کا سورج مغربی اُفق میں اپنا مُنہ چھپانے لگا تو جنرل یعقوب میجر جنرل راؤ فرمان علی کے دفتر میں (جو سول معاملات کے انچارج تھے) داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر طمانیت اور فخر کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی کامرانی کے انداز میں کہا: "مجھے خوشی ہے حالات پُرسکون رہے اور انتخابات منصفانہ اور آزادانہ ماحول میں منعقد ہو گئے۔" جنرل فرمان نے کہا: "بیشک — آزاد . . . یکسر آزاد!"

چار روز بعد (۱۱ دسمبر) جنرل یحییٰ خاں نے عساکرِ پاکستان کے تمام افسروں اور جوانوں کو داد و تحسین کا یہ پیغام بھیجا: "پُرامن انتخابات

منعقد کرانے میں عساکرِ پاکستان کے تمام افسروں نے جس غیر جانبداری فرض شناسی اور ضبط کا مظاہرہ کیا ہے وہ داد اور تحسین کا مستحق ہے"[1]

اس "پُرامن" ماحول کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو نشستوں کے سوا ساری سیٹیں عوامی لیگ کی جھولی میں جا پڑیں۔ غیر سرکاری گنتی مکمل ہوتے ہی اس غیر ملکی صحافی نے جس کے ساتھ میں نے ۶ دسمبر کو ایک ہی میز پر کھانا کھایا تھا، اپنے ہوٹل سے مجھے فون کیا: "میجر! بہت بہت مبارکباد آپ کی پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی — بلکہ اس نے گویا جھاڑو ہی پھیر دیا" میرے لیے "یہ مبارکباد" ہضم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جیتنے والے گھوڑے کو کون نہیں اپناتا!

عوامی لیگ نے الیکشن تو جیت لیا۔ اب دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس بھرپور کامیابی سے اس کے رویے میں فراخدلی آتی ہے یا اس کا سر غرور سے اور اکڑ جاتا ہے۔ اس کا کوئی جواب دستیاب نہ تھا۔ مجھے رہ رہ کر شیخ مجیب کے آئینی مشیر ڈاکٹر کمال حسین (جو بعد میں بنگلہ دیش کے وزیرِ خارجہ بنے) سے اپنی ملاقات یاد آ رہی تھی جو ایک ماہ قبل ڈھاکہ انٹر کانٹی نینٹل کے نیم تاریک "بار" میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے دوران میں نے عوامی لیگ کی یقینی کامیابی کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو صوبائی لیڈر کے بجائے قومی قائد کے طور پر پیش کریں اور اگر ممکن ہو تو مغربی پاکستان کا بھی دورہ کریں تاکہ پورے پاکستان کے وزیرِ اعظم کے طور پر قابلِ قبول ہو سکیں۔ انہوں نے میری تجویز کو سراہتے ہوئے کہا تھا: "اس پر ہم انتخابات کے بعد ہی عمل کر سکیں گے کیونکہ ہم آئندہ انتخابات چھ نکات اور بنگالی قومیت کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اس وقت پینترہ بدلا تو کوئی عجب نہیں یہاں بھی الیکشن ہار جائیں — ایک مرتبہ ہم عوام کی حمایت حاصل کر لیں تو چھ نکات میں ایسی ترمیم کر دیں گے کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے بھی قابلِ قبول ہو سکیں"۔

میں الیکشن کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے بے تاب تھا تاکہ اندازہ کر سکوں کہ وہ کہاں تک اپنی بات پر قائم ہیں۔ دسمبر کے وسط میں ان سے پھر ملاقات ہوئی، میں نے سابقہ ملاقات کا حوالہ دیا، مگر وہ مشرقی پاکستان کے متلوّن مزاج موسم کی طرح بدل چکے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "اب چھ نکات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ قوم کی امانت ہیں، ان سے کسی قسم کا انحراف لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہوگا"۔

اسی نقطۂ نظر کا اعلان خود پارٹی کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے الیکشن کے دو روز بعد ان الفاظ میں کر دیا تھا: "بنگلہ دیش کے عوام نے یہ انتخاب "چھ نکات"، "گیارہ نکات" اور "صوبائی خود مختاری" پر ریفرنڈم کی حیثیت سے جیتے ہیں۔ لہٰذا چھ نکات پر مبنی ایسے دستور کی تشکیل ازبس ضروری ہے جس میں مکمل خود مختاری کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہو"[2]۔

اگر مجیب الرحمٰن اس موقف پر سختی سے قائم رہتے ہیں اور اپنی اکثریت کے زور پر چھ نکات پر مبنی آئین پاکستان پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا راستہ کون روک سکتا ہے؟ ایسی صورت میں افواجِ پاکستان کا کردار کیا ہوگا؟ کیا وہ باعزت طریقے سے اقتدار سے الگ ہو کر ملک کی قسمت عوامی لیگ کو سونپ دیں گی؟ اس کا جواب ہمیں ڈھاکہ میں نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ جنرل یحییٰ کے ایک معتمد جنرل ..... دسمبر کے آخر میں وہاں پہنچے اور گورنمنٹ ہاؤس میں ایک ضیافت کے بعد اربابِ حل و عقد کی سوچ سے اتنا پردہ اٹھایا: "آپ فکر نہ کریں ہم ان کالے حرامیوں کو اپنے اوپر ہرگز حکومت نہیں کرنے دیں گے"۔

---

[1] روزنامہ پاکستان آبزرور، ڈھاکہ - ۱۲ دسمبر ۱۹۷۰ء

[2] روزنامہ پاکستان آبزرور، ڈھاکہ - ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء

یہ بات شاید مجیب الرحمٰن تک بھی پہنچ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے حسبِ وعدہ انتخابات کرانے پر جنرل یحییٰ خاں کا شکریہ ادا کیا وہاں یہ انتباہ کرنا بھی ضروری سمجھا کہ جنرل صاحب کے بعض محترم انتخابات کے نتائج کو "سبوتاژ" کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس ٹولے کے بعض سازشی پچھلے دنوں ڈھاکہ آ کر خفیہ اجلاس کرتے رہے ہیں میں صدر کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو لگام دیں، ورنہ انہیں بنگلہ دیش کے لوگوں کی لاٹھیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔[1]"

البتہ محاذ آرائی کے حقیقی عناصر کہیں اور تھے جن کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

[1] پاکستان آبزرور ڈھاکہ۔ ۳ جنوری ۱۹۷۱ء

باب ۶

لاڑکانہ پلان

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں ۱۶۲ میں سے ۱۶۰ نشستیں جیت کر زبردست معرکہ مارا، مگر مغربی پاکستان میں ایک سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں ۱۳۸ میں سے ۸۱ نشستیں جیت کر پورے مغربی بازو میں اکثریت حاصل کر لی مگر مشرقی بازو میں ایک اُمیدوار بھی کھڑا نہ کر سکی۔ اس سے ایک دلچسپ مگر نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔

مَیں پچھلے باب میں الیکشن کے فوراً بعد شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے رفقاء کے سخت رویّے کا ذکر کر چکا ہُوں۔ جہاں تک بھٹو کا تعلق ہے وہ بھی پنجاب اور سندھ میں اپنی جیت سے خوب پھُولے بیٹھے تھے۔ ۲۰ دسمبر کو انہوں نے لاہور میں کہا: "میری جماعت کے تعاون کے بغیر نہ تو کوئی دستور بنایا جا سکتا ہے اور نہ مرکز میں کوئی حکومت چلائی جا سکتی ہے"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پنجاب اور سندھ طاقت کے سرچشمے ہیں جن میں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہے اس لیے مرکز میں قائم ہونے والی کسی بھی حکومت کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہو گا۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ "پی پی پی" اپنے اغراض و مقاصد سے سرِمو انحراف نہیں کرے گی اور وہ اگر برسرِ اقتدار آئی ــــ اور جب بھی آئی ــــ اپنے پروگرام کی ایک ایک شق کو عملی جامہ پہنائے گی[1]۔

ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری مسٹر تاج الدین نے مسٹر بھٹو کے اس بیان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ عوامی لیگ مُلک کا دستور بنانے اور مرکز میں حکومت چلانے کی پُوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم کسی دوسری پارٹی کے تعاون سے ــــ اور اس کے بغیر بھی ــــ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ اب طاقت کا سرچشمہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم بہتر مستقبل کے خواہشمند ہیں تو ہمیں اس قسم کے دعوؤں سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے غیر ضروری اور نقصان دہ بحث چھڑ سکتی ہے[2]۔

دونوں صُوبوں کے درمیان یہ تُو تُو مَیں مَیں یقیناً تشویش کا باعث تھی۔ مَیں نے اس پر بہت سے نوجوان فوجی افسروں کو بھی متفکر دیکھا؛ حالانکہ وہ سیاسی اُلجھاؤ سے عموماً دُور ہی رہتے ہیں۔ ان میں سے وہ جوان دونوں مسٹر بھٹو کو اپنی آرزوؤں کا مظہر سمجھتے تھے، اکثر کہتے: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک صوبہ سارے مُلک پر سواری کرنے لگے"۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ جو مقامی حالات کا پُورا پُورا ادراک رکھتے تھے کہتے: "ہم گزشتہ ۲۳ برسوں سے بنگالیوں پر سواری کر رہے ہیں۔ اب ان کی باری ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ ان پر کاٹھی ڈالے رکھیں"۔

یہ احساسات و جذبات جن میں مَیں بھی سانس لے رہا تھا، اس سطح سے کہیں نیچے تھے جہاں مُلک کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

---

[1] پاکستان آبزرور ڈھاکہ ۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۰ء

[2] پاکستان آبزرور ڈھاکہ ۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۰ء

اور اُونچی سطحیں عموماً برف پوش رہتی ہیں۔ ان دنوں بھی اُونچی سطح پر برف پڑی ہُوئی تھی اور مصالحت کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ۱۹۷۱ء کے ابتدا میں برف پگھلنے کی ایک صورت پیدا ہُوئی۔ دونوں صوبوں میں راہ و رسم کی کچھ ابتدا ہُوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی لیگ سے مذاکرات کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اپنا خصوصی ایلچی ڈھاکہ بھیجا۔ ایلچی کی روانگی سے چند روز قبل فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے مسٹر بھٹو نے کہا: "ہم مشرقی پاکستان کی اکثریت کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہمیں ان پر اعتماد ہے۔"[1]

مجیب الرحمٰن نے بھی اس پیش قدمی پر خوشگوار ردِ عمل کا اظہار کیا۔ انہوں نے ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ کے ایک عظیم اجتماع میں اعلان کیا: "اسمبلی میں اکثریت رکھنے کے باوجود میں یہ نہیں کہتا کہ دستور سازی کے مرحلے میں ہمیں مغربی پاکستان کے تعاون کی ضرورت نہیں — ہمیں یقیناً ان کا تعاون چاہیے۔"[2]

اب حالات کچھ کچھ درست سمت میں چلتے نظر آنے لگے۔ یحییٰ خاں کے ایک حواری نے چپکے چپکے یہ بات پھیلائی کہ یہ سب صدر یحییٰ کا کرشمہ ہے جو اب محض ریفری ہونے کے علاوہ ایک اہم اور بااثر کھلاڑی کا کردار بھی ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں اس سے سروکار نہ تھا کہ اس مفاہمت کا سہرا جنرل یحییٰ خاں کے سر بندھتا ہے یا کسی اور کے، ہمیں اس بات سے دلچسپی تھی کہ دونوں صوبوں کے درمیان یہ خطرناک محاذ آرائی کسی صورت ٹل جائے۔

پھر اچانک ۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو اُمیدوں کا یہ محل گرتا نظر آنے لگا۔ عوامی لیگ نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے تمام اراکین کو (جن کی تعداد ۴۱۷ بنتی تھی) ڈھاکہ میں جمع کیا اور سرِ عام ان سے چھ نکات سے وفاداری کا حلف لیا۔ اس حلف میں انہوں نے اقرار کیا کہ:

— خداوندِ رحیم و قدیر کے نام پر
— ان شہیدوں اور مجاہدوں کے نام پر جنہوں نے جبر کے ہاتھوں مظالم سہے اور جان کی قربانیاں دیں۔
— ان کسانوں، مزدوروں، طالب علموں، محنت کش عوام اور ہر طبقے کے لوگوں کے نام پر —

ہم نو منتخب اراکین اسمبلی اس بات کا حلف اُٹھاتے ہیں کہ ہم چھ نکات اور گیارہ نکات کے وفادار رہیں گے کیونکہ یہ نکات عوام کی امنگوں کے مظہر ہیں۔

یہ اعلان پڑھ کر ایسا نظر آتا تھا کہ ہم جہاں سے چلے تھے پھر لوٹ کر وہیں آ گئے ہیں۔ میرا ذاتی تاثر یہ تھا کہ عوامی لیگ نے یہ حلف لے کر افہام و تفہیم کے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ چند روز بعد مجھے ایک سینیئر صحافی ملا جو مجیب الرحمٰن کے بہت قریب تھا۔ میں نے اس سے عرض کیا: "سال بھر کی انتخابی مہم میں جذبات کا پارہ بہت چڑھ چکا ہے۔ اسمبلی کا اجلاس ہونے میں کچھ وقت باقی ہے، کیوں نہ اس درمیانی عرصے کو بھڑکتے ہُوئے جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ جب آئین سازی کا مرحلہ آئے تو لوگ جذباتیت میں پھنس کر نہ رہ جائیں۔" اس نے کہا: "شیخ صاحب لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیں گے — آپ کے پاس تو بیں اور ٹینک ہیں اور ان کے پاس یہی عوام کے جذبات۔"

حلف والی تقریب کے اگلے روز ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ نے اپنا تیسواں یومِ تاسیس منایا۔ ایک بھرپور جلسہ بھی کیا جس میں

---

[1] روزنامہ ڈان کراچی ۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء

[2] پاکستان آبزرور ڈھاکہ ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۰ء

انہوں نے مجیب الرحمٰن سے بڑھ چڑھ کر اپنی منزل پانے کے لیے بے قراری کا اظہار کیا۔ بعض طالب علم رہنما مجیب کے گھر بھی گئے اور جلد از جلد اقدامات کرنے کے لیے ان پر زور دیا۔ مجیب الرحمٰن نے انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا: "ضرورت پڑنے پر میں خود تمہیں انقلاب برپا کرنے کی دعوت دوں گا، مگر تب تک صبر سے کام لیجیے[1]۔"

بگڑتے حالات کو اگر کوئی شخص سنبھالا دے سکتا تھا تو وہ جنرل یحییٰ خاں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق اور ان کی مصروفیات نے انہیں مہلت دی، تو وہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو بہ نفسِ نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے اور پہلی بار سنجیدگی سے چھ نکات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایوانِ صدر میں مجیب الرحمٰن اور ان کے نصف درجن رفقاء کو طلب کیا گیا۔ اس میٹنگ کے لیے صدرِ مملکت کے دستِ راست اور پرنسپل اسٹاف افسر لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ نے گورنر احسن کو بھی بلا لیا، حالانکہ ماضی میں انہیں مشرقی پاکستان سے متعلق اہم فیصلوں میں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اگرچہ وہ آزردگی سے آئے مگر آ گئے۔ ان کا خیال تھا اب چھ نکات کو سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اگر یہ مشق کرنی ہی تھی تو الیکشن سے بہت پہلے کرنی چاہیے تھی، اب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

جنرل یحییٰ، جنرل پیرزادہ اور ایڈمرل احسن میز کے ایک طرف بیٹھے اور مجیب، خوندکر مشتاق احمد، تاج الدین اور ان کے ساتھی میز کی دوسری جانب۔ عوامی لیگ کی طرف سے زیادہ تر گفتگو مجیب الرحمٰن نے کی۔ وہ ایک ایک نکتہ لیکر چھ نکات کی وضاحت کرتے گئے۔ ہر نکتے کی تشریح کے بعد کہتے: "دیکھا آپ نے اس میں کوئی بات بھی تو قابلِ اعتراض نہیں ہے...؟" "اس میں بھلا کون سی قباحت ہے...؟" "دیکھیے کتنی صاف اور سادہ سی بات ہے...؟" وغیرہ۔ جنرل یحییٰ خاں اور ان کے معاون خاموشی سے سنتے رہے۔ ایک دو مرتبہ جنرل پیرزادہ نے کوئی نکتہ اٹھایا جس کی مجیب نے نہایت تحمل اور شائستگی سے وضاحت کر کے ان کی تشفی کر دی۔ آخر میں جنرل یحییٰ خاں نے کہا: "میرے لیے آپ کے چھ نکات قابلِ قبول ہیں مگر مغربی پاکستان میں ان کے خلاف شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ آپ کو چاہیے وہاں کے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں۔" اس پر مجیب الرحمٰن نے فوراً کہا: "بے شک! بے شک!! ہم مغربی پاکستان کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ ہم ان سے مشورہ کریں گے، ہم دستور بنائیں گے۔ ہم چھ نکات کو اس دستور کی اساس بنائیں گے۔ ہم اس دستور کی ایک نقل آپ کو بھی دکھائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں اس میں کوئی غلط بات نہ ہوگی۔" اس اثنا میں جنرل یحییٰ خاں خاموشی سے اپنی بھاری بھوؤں کو سکیڑتے اور بدیشی سگریٹوں کے کش لگاتے رہے۔

اس باقاعدہ کارروائی کے علاوہ بھی جنرل یحییٰ اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ملاقات ہوئی جس کا احوال پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری کی کتاب[2] سے ملتا ہے۔ وہ وزیرِ مواصلات تھے اور یحییٰ خاں کے ساتھ ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس ملاقات کے بعد جنرل یحییٰ بہت آزردہ تھے۔ انہوں نے یہ ملاقات ختم ہوتے ہی مجھے ایوانِ صدر بلوایا اور کہا: "مجیب نے مجھ سے بدعہدی کی ہے۔ جو لوگ مجھے اس سے محتاط رہنے کی تلقین کرتے تھے، وہ سچے تھے۔ میں نے اس شخص پر اعتماد کر کے غلطی کی۔" میں نے ان سے خاص طور پر پوچھا کہ آپ نے مجیب کو اس کا وہ وعدہ نہیں یاد دلایا جو اس نے انتخابات سے پہلے آپ سے کیا تھا۔ اس کا جواب دیتے وقت جنرل یحییٰ کے لہجے میں دردمندی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے گلے میں پھانس اٹک رہی ہے۔ انہوں نے کہا: "میں اور آپ سیاست دان نہیں ہیں، میرے

---

[1] پاکستان آبزرور ڈھاکہ - ۵ جنوری ۱۹۷۱ء

[2] LAST DAYS OF UNITED PAKISTAN متحدہ پاکستان کے آخری ایام

لیے ان کے اندازِ فکر کو سمجھنا مشکل ہے۔ اب تو ہم بہتر دِنوں کی توقع کرنے ہی پر قناعت کر سکتے ہیں۔"

جنرل یحییٰ خاں اِسی ذہنی تلاطم میں ۱۴ جنوری کو ڈھاکہ سے روانہ ہُوئے۔ روانگی سے قبل ایرپورٹ پر صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جنرل یحییٰ خاں زیادہ پُر اُمید نظر نہیں آ رہے تھے، لیکن ان کے کسی جواب، تبصرے یا اشارے سے ان کے آئندہ عزائم کی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ مستقبل کا انحصار مجیب الرحمٰن کے فیصلوں پر ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "اُن (مجیب) سے پُوچھو، وہ مُلک کے آئندہ وزیرِاعظم ہیں ۔۔۔ جب وہ مُلک کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

جنرل یحییٰ خاں کی روانگی کے بعد ایک بنگالی اخبار نویس نے مجھ سے کہا کہ صدر کے بیان میں کلیدی جملہ یہ تھا کہ "۔۔۔ تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔" اس صحافی کے مطابق عوامی لیگ نے جمہوری نظام میں یحییٰ خاں کو صدر بنانے سے انکار کر دیا تھا تا آنکہ وہ عوامی لیگ کے آئینی مسودے کی تصدیق پر تیار نہیں ہوتے۔

جنرل یحییٰ خاں ایک دن کراچی میں سستانے کے بعد سیدھے لاڑکانہ پہنچے جہاں ذوالفقار علی کے مہمان بنے۔ بھٹو، یحییٰ خاں کے دورۂ ڈھاکہ پر کڑی نظر رکھے ہُوئے تھے۔ وہ کسی ایسی مصالحت کے حامی نہ تھے جس میں انہیں اور ان کی پارٹی کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ بھٹو نے یحییٰ خاں اور ان کے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مُرغابی کا شکار کھلایا۔ اس مہمان نوازی میں چیف آف اسٹاف (آرمی) جنرل عبدالحمید بھی شامل ہُوئے۔ ان کی موجودگی نے ڈھاکہ میں یک لخت شکوک و شبہات پیدا کر دیے۔ عوامی لیگ نے یہ تاثر پھیلانا شروع کر دیا کہ مجیب نے یحییٰ خاں سے جو سخت رویہ اختیار کیا ہے اسے اس کی سزا دینے کے لیے لاڑکانہ میں "سازش" کی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی "سازش" (بقول عوامی لیگ) اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اسے فوج کی اشیرباد حاصل نہ ہو۔

انہی دِنوں ڈھاکہ کے اخبارات میں صفحۂ اوّل پر ایک تصویر چھپی جس میں جنرل یحییٰ خاں اور مسٹر بھٹو کو المرتضٰے کے وسیع اور خوبصورت سبزہ زار میں چہل قدمی کرتے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر نے ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے شبہات کو تقویت بخشی۔ اکثر بنگالیوں نے اس سے تاثر لیا کہ بھٹو اور یحییٰ کی دوستی اور یگانگت مشرقی پاکستان کے لیے اچھی علامت نہیں۔ ایک بنگالی دوست نے مجھ سے کہا: "ذرا اس (یحییٰ) کو دیکھو جب یہاں آتا ہے تو اپنے کسی اسٹاف افسر کے ذریعے (اکثریتی پارٹی کے سربراہ) مجیب الرحمٰن کو ایوانِ صدر میں طلب کرتا ہے اور جب وہاں جاتا ہے تو (اقلیتی پارٹی کے سربراہ) بھٹو کے پاس ٹھہرتا ہے۔ کیا فوج جمہوریت کے لیے یہی جذبۂ احترام رکھتی ہے؟"

لاڑکانہ کی مُلاقات کے متعلق کئی باتیں سُننے میں آئیں۔ کسی نے کہا کہ وہاں بھٹو اور یحییٰ خاں کے درمیان باہمی تعاون کا خفیہ سمجھوتا طے پایا ہے۔ کسی نے کہا کہ یحییٰ خاں نے صدر کی کُرسی سے چمٹے رہنے کے لیے بھٹو کو استعمال کیا اور کسی نے کہا کہ بھٹو نے مجیب کو راستے سے ہٹانے کے لیے یحییٰ کو آمادہ کیا۔ میں ان خبروں کی تائید یا تصدیق کے قابل نہیں ہوں کیونکہ یہ واقعات ڈھاکہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دُور ہو رہے تھے۔ میں ان کا شاہد نہیں۔ ان واقعات کا ایک ہی ریکارڈ دستیاب ہے جو مسٹر بھٹو کی لکھی ہُوئی کتاب "گریٹ ٹریجڈی" (عظیم المیہ) میں ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں: (صفحہ ۲۰)

"صدر نے مجیب سے اپنی گفتگو کے بارے میں مجھے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے مجیب سے کہہ دیا ہے کہ اس کے سامنے تین راستے ہیں (۱)

لے روزنامہ ڈان کراچی - ۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء

وہ مشابی عربی سے پہلے (۲) پی پی پی سے تعاون کرے (۳) پی پی پی کو نظر انداز کر کے مغربی پاکستان کی چھوٹی چھوٹی شکست خوردہ پارٹیوں کی حمایت حاصل کرے۔ اس ضمن میں صدر نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ملک کی دونوں اکثریتی پارٹیوں میں مفاہمت کو ترجیح دیں گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے صدر کو چھ نکات کے مضمرات سے آگاہ کیا اور ان کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تاہم ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہم کوئی قابلِ عمل راستہ تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور عنقریب ڈھاکہ جا کر عوامی لیگ سے بات چیت کریں گے۔"

لاڑکانہ میں "مرغابیوں کا شکار" کھیلنے کے بعد صدر اور ان کے ساتھی راولپنڈی سدھارے اور چند روز بعد (۲۷ جنوری) مسٹر بھٹو اپنے رفقاء سمیت ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے "لاڑکانہ سازش" کے عیب سارے ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ مجھ جیسے افراد جن کا تعلق براہِ راست عوامی لیگ سے تھا نہ پی پی پی سے، یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر بھٹو یحییٰ خاں کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتے تو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ اس "میزبانی" کے جو اثرات ڈھاکہ میں مرتب ہو رہے تھے ان کا یا تو مسٹر بھٹو کو علم نہ تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں افہام و تفہیم کے بجائے شکوک و شبہات کو زیادہ دخل حاصل ہو۔

میرے ایک بنگالی دوست کا کہنا ہے کہ بھٹو کی آمد کو قابلِ قبول بنانے کے لیے عوامی لیگ کو بہت محنت کرنا پڑی۔ اس کی انتظامی کمیٹی کے بعض ارکان اس دورے کے سراسر مخالف تھے، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ اگر یحییٰ خاں ان کی بات نہیں مانتا تو انہیں بھٹو کا تعاون حاصل کرنا چاہیے تاکہ دونوں اکثریتی پارٹیوں کے متفقہ مطالبے کو جنرل یحییٰ خاں نظر انداز نہ کر سکے ــــــ اس ضمن میں غور طلب بات یہ تھی کہ عوامی لیگ کی "غدارانہ شہرت" کے باوجود اگر مسٹر بھٹو نے اس سے تعاون کیا تو مغربی پاکستان میں ان کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

ان حالات میں مسٹر بھٹو اور ان کے رفقاء ڈھاکہ پہنچے۔ انہوں نے عوامی لیگ کی قیادت سے ملاقات کی جس کی تفصیلات صیغۂ راز میں رکھی گئیں۔ اس کی روداد بعد میں عوامی لیگ کے ایک ترجمان مسٹر رحمن سبحان کی زبانی ملتی ہے، وہ ایک غیر ملکی انگریزی جریدے میں لکھتے ہیں:

"مسٹر بھٹو جنوری کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ آئے۔ انہوں نے پہلے مجیب الرحمن سے ملاقات کی اور پھر دونوں پارٹیوں کے آئینی ماہرین نے آپس میں مذاکرات کیے۔ گفتگو جوں جوں آگے بڑھتی رہی یہ بات واضح ہوتی گئی کہ پی پی پی نے ابھی تک کوئی دستوری خاکہ تیار نہیں کیا۔ وہ بھی سرِ دست یحییٰ خاں کی طرح چھ نکات کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس صورتِ حال میں مذاکرات کا جاری رہنا لاحاصل تھا کیونکہ مذاکرات کی غایت یہ ہوتی ہے کہ دو متبادل مجموعۂ تجاویز کو سامنے رکھ کر ان میں مفاہمت کی صورت تلاش کی جائے۔"[1]

یہ روداد مذاکرات کے کوئی چھ ماہ بعد منظرِ عام پر آئی مگر عوامی لیگ کے ذرائع سے ایک تبصرہ جو فوری طور پر مجھے دستیاب ہوا یہ تھا کہ مسٹر بھٹو نے دستوری مسائل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ تمام وقت اقتدار میں شرکت اور قلمدانوں کی تقسیم پر بات کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے پیشِ نظر اقتدار کے سوا کوئی چیز نہیں۔"

پروفیسر جی ڈبلیو چودھری (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسٹر بھٹو اپنے ساتھیوں سمیت ۲۷ جنوری کو ڈھاکہ پہنچے۔ میں بھی مذاکرات کے رُخ کا جائزہ لینے کے لیے ڈھاکہ میں موجود تھا۔ بات چیت تین روز جاری رہی مگر عدمِ اعتماد کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مختلف ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مجیب نے بھٹو سے صاف

---

[1] SOUTH ASIAN REVIW — LONDON شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء

صاف کہہ دیا تھا کہ ہم چھ نکات میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کریں گے۔ جواباً مسٹر بھٹو نے بھی اتنی ہی صفائی سے بتا دیا تھا کہ ہم علیحدگی کی اس درپردہ اسکیم کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔"

انہی دنوں ڈھاکہ میں ہم نے یہ سنا کہ بھٹو نے چھ میں سے ساڑھے پانچ نکات منظور کر لیے ہیں ۔ صرف آدھے نکتے پر اتفاق رائے باقی ہے۔ عوامی لیگ کے حلقوں نے مجھے بتایا کہ درحقیقت انہوں نے سارے نکات مان لیے تھے مگر انہوں نے ان کے لیے مغربی پاکستان میں رائے عامہ ہموار کرنے اور دوسرے سیاست دانوں سے بات چیت کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ عوامی لیگ نے انہیں وقت دینے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔

اسی شام (۲۹ جنوری) کو رات آٹھ بجے کی خبروں میں ریڈیو پاکستان نے مسٹر بھٹو کا بیان نشر کیا کہ "میں اپنی پارٹی اور مغربی پاکستان کے لیڈروں سے مزید مشورہ کروں گا اور (عوامی لیگ سے) مذاکرات جاری رکھوں گا۔" پی پی پی کے سربراہ چار روزہ قیام کے بعد ایسے مغربی پاکستان آئے کہ یہاں آ کر انہوں نے نقشہ ہی بدل دیا۔ اب ان کی توجہ کا مرکز مجیب نہیں یحییٰ خاں تھے جن سے ان کے مفصل مذاکرات لاڑکانہ میں ہو چکے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ یحییٰ خاں کے ساتھ ان کی ملی بھگت کا تذکرہ کیا جائے چند درمیانی کڑیوں کا سلسلہ بھی ملا لیا جائے۔

ڈھاکہ میں مسٹر بھٹو کی آمد پر جتنی امیدیں بندھی تھیں ۳۰ جنوری کو ان کی روانگی سے نہ صرف ختم ہو گئیں بلکہ دونوں صوبوں کے درمیان بُعد پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ اس خلیج کو وسیع تر کرنے میں ہندوستان نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ بظاہر دو کشمیری نوجوان ۳۰ جنوری کو ہندوستان کا ایک فوکر طیارہ اغوا کر کے لاہور لے آئے۔ بعد کی عدالتی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ تو ہندوستان کی گہری سازش تھی۔ اُس نے اِس واقعے کو بہانہ بنا کر ہندوستان کے اُوپر سے جانے والی پی آئی اے کی پروازیں بند کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں صوبوں کے درمیان جو فاصلہ پہلے دو گھنٹوں میں طے ہوتا تھا اب اس کو (براستہ سری لنکا) چھ گھنٹے لگتے تھے۔ میرے پاس اس کی کوئی شہادت تو نہیں مگر میرا تاثر یہ ہے کہ اغوا کی یہ اسکیم ہندوستان نے بہت پہلے تیار کی تھی مگر اس پر عملدرآمد بھٹو اور مجیب کے مذاکرات ناکام ہونے پر کیا۔ میرے اس تاثر کی تصدیق بعد کے حالات سے بھی ہوتی ہے جب ہندوستان نے کھلم کھلا مشرقی پاکستان میں مداخلت شروع کردی۔

جنوری ۷۱ء کے آخر تک عوامی لیگ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور میرے خیال میں یحییٰ اور بھٹو کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کہاں تک اپنے اپنے عزائم میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ مجیب کا اصرار تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ فروری تک قومی اسمبلی کا اجلاس ہو جانا چاہیے جبکہ مسٹر بھٹو اسمبلی سے باہر کسی سمجھوتے کے لیے مزید وقت چاہتے تھے۔ یحییٰ خاں اور ان کے مشیر اپنا الگ لائحہ عمل بنائے بیٹھے تھے۔ سیاسی تکون ۔ یحییٰ، مجیب، بھٹو ۔ روز بروز پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی ۔ روشنی کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔

اس انتہائی تاریکی میں مَیں لیفٹیننٹ جنرل یعقوب علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور چٹکی بھر بصیرت مانگی۔ انہوں نے فرمایا "میری تربیت سپاہ گری کی ہے نہ سیاست کی نہیں۔ فوجی نقل و حرکت پر میرا ذہن بہت چلتا ہے مگر سیاسی چالوں سے تعلق میرے قوا زیادہ حساس نہیں مثلاً جب ہندوستان کشمیر سے ایک پہاڑی ڈویژن مغربی بنگال میں انتخابات کی نگرانی کے لیے بھیجتا ہے تو میں فوراً بھانپ جاتا ہوں اس کا اصل مدعا کیا ہے؟ کیا یہ ڈویژن واقعی انتخابات کے لیے آیا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے؟ یہ اپنا سارا جنگی سامان ساتھ لایا ہے یا صرف ہلکے ہتھیاروں سے لیس ہے؟ اس کو صوبے کے اندر رکھا گیا ہے یا اس کا منہ سرحدوں کی طرف ہے؟ ۔ لیکن جب مجیب الرحمٰن کوئی سیاسی چال چلتا ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہتا کیا ہے اُس کا مقصد کیا ہے؟ وہ مجھ سے ایک بات کرتا ہے اور دوسروں کو کچھ اور بتاتا ہے میں نہیں جانتا کہ اس کی کس بات کا اعتبار کروں۔"

اسی بوجھل خاموشی میں دس دن گزر گئے۔

پھر یکایک مغربی افق پر کچھ حرکت شروع ہوئی جیسے دس دنوں کی خاموشی اپنا اثر دکھانے لگی — اور مختلف واقعات دو دو دن کے مقررہ وقفے کے بعد رونما ہونے لگے جیسے کوئی ٹائم ٹیبل طے کر کے اس کو عملی شکل دی جاتی ہے۔ ۱۱ فروری کو مسٹر بھٹو نے راولپنڈی میں صدرِ مملکت سے طویل ملاقات کی۔ دو روز بعد حکومت نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہوگا۔ دو روز بعد مسٹر بھٹو نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر پی پی پی کو نظر انداز کیا گیا "تو خیبر سے کراچی تک طوفان برپا کر دوں گا"[1]

بھٹو کے اعلان کے بعد صدر یحییٰ نے کابینہ کو برخاست کر دیا اور ملک پھر مکمل طور پر مارشل لا کی گرفت میں آ گیا۔ دو روز بعد صدر نے فوجی گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کا اجلاس ۲۲ فروری کو طلب کر لیا۔ مشرقی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل یعقوب اور وائس ایڈمرل احسن کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے دو روز قبل (۱۹ فروری) جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور حالاتِ حاضرہ پر بات کرنا شروع کی (یہ عنایت وہ پہلے بھی مجھ پر کرتے رہتے تھے) انہوں نے اس ملاقات میں دو باتوں کا بالخصوص ذکر کیا۔ ایک کا تعلق بھٹو سے تھا اور دوسری کا یحییٰ خاں سے۔ مسٹر بھٹو کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے موقف میں اتنی لچک رکھی ہے کہ اگر صدر یا مجیب ان کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ ان کے خیالات کو اہمیت دی جائے گی تو وہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر تیار ہو جائیں گے اور صدر کے پاس قانونی ڈھانچہ (ایل ایف او) کے تحت اتنے اختیارات ہیں کہ وہ اپنی بات (مجیب سے) منوا سکیں — صدر یحییٰ خاں کے بارے میں انہوں نے اپنی دُور رس نگاہوں سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ تعطل جاری رہا اور نتیجۃً فوجی کارروائی ناگزیر ہو گئی تو یہ تباہ کن ہوگا۔ یحییٰ خاں علٰحدگی کے عمل میں تاخیر کرنے کے لیے یہ کارروائی کریں گے تو اس سے علٰحدگی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ہم صرف مفروضوں کی بات کر رہے ہیں، پوچھا کہ اگر حالات ایسا رُخ اختیار کر لیں کہ فوجی کارروائی ناگزیر ہو جائے تو تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔ مَیں نے عرض کیا کہ اگر ایسی صورتِ حال کا سامنا ہو تو میرے خیال میں کارروائی مختصر اور تیز ہونی چاہیے سرجن کے نشتر کی طرح اور اس جراحی کے فوراً بعد زخموں کو مندمل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر سیاسی اور اقتصادی مرہم پٹی ہونی چاہیے۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل جنرل یعقوب اور ایڈمرل احسن شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے۔ شیخ صاحب نے حالات کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ کر انہیں یقین دلایا کہ چھ نکات میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ یہ رہی ایک اور قلابازی۔ غالباً بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنا موقف بدلنے ہی کا نام سیاست ہے۔ بیشک اس کام میں مجیب الرحمٰن بہت طاق تھے۔

راولپنڈی میں اعلیٰ سطحی کانفرنس ۲۲ فروری کو منعقد ہوئی۔ اس میں کیا فیصلے ہوئے اور نئے حالات سے نپٹنے کے لیے کیا اسٹریٹیجی وضع کی گئی ابھی تک صیغۂ راز میں ہے، البتہ اس کی جو گونج ہم تک ڈھاکہ میں پہنچی وہ یہ تھی کہ مجیب الرحمٰن کو اپنی نیک نیتی اور حب الوطنی کا ثبوت دینے کے لیے ایک اور موقع دیا جائے گا اور اگر وہ راہِ راست پر نہ آیا تو مارشل لا اپنے اصل اور روایتی انداز میں (دوبارہ) نافذ کیا جائے گا۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد دونوں محاذوں پر فوراً کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ سیاسی سطح پر ایڈمرل احسن نے شیخ مجیب سے ابتدائی مذاکرات شروع کیے اور چھ نکات کو مغربی پاکستان کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے ان میں ضروری ترمیم پر زور دیا۔ مجیب الرحمٰن نے ترمیم والی بات تو مانی، البتہ

---

[1] روزنامہ ڈان، کراچی۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۷۱ء

قابلِ قبول ہوں گے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ بظاہر عوامی لیگ اپنے موقف پر قائم رہے گی مگر اپنے پروگرام کے ہر نکتے میں ایسی شق کا اضافہ کرے گی کہ اس کا قابلِ اعتراض حصہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا مثلاً :

(الف) بیرونی تجارت صوبائی ذمہ داری ہوگی اور تجارتی وفد متعلقہ صوبے ہی بھیجیں گے اور تجارتی معاہدوں کے لیے غیر ممالک سے مذاکرات بھی وہی کریں گے لیکن مرکز کی توثیق کے بغیر کوئی معاہدہ نافذالعمل نہیں ہوگا۔

(ب) ایک صوبے کی آمدنی خواہ وہ اندرونی وسائل سے حاصل ہو یا بیرونی ذرائع سے صوبائی ریزرو بینک میں جمع ہوگی مگر یہ رقم صرف مرکزی رابطہ کمیٹی کی منظوری سے خرچ کی جاسکے گی جس میں تمام صوبوں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہوگی۔

(ج) محصولات جمع کرنا صوبائی ذمہ داری ہوگی لیکن اگر مرکز یہ کام اپنے ذمہ لینا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

(د) ہم علٰحدہ کرنسی یا موجودہ کرنسی کے علٰحدہ نظام کے مطالبے پر اصرار نہیں کرتے۔

انہوں نے کہا کہ ہم ان باتوں کو تحریری طور پر دینے کے لیے تیار ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کی اتھارٹی کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجیب الرحمٰن کی منظوری سے یہ ساری باتیں کہہ رہے ہیں۔

میں نے ان کی بات حکامِ اعلیٰ تک پہنچانے کا وعدہ کیا لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ اگر مجیب الرحمٰن اب بھی مغربی پاکستان ہو آئیں تو اس سے یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ وضاحت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا "میرے پاس کسی کی کوئی اتھارٹی نہیں لیکن اس ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر شیخ صاحب مغربی پاکستان کا دورہ کرلیں تو قومی سلامتی کے لیے مفید ہوگا"۔ انہوں نے کہا کہ ہم دوپہر کے کھانے پر شیخ صاحب سے بات کریں گے اور پچھلے پہر آپ کو ان کے ردِعمل سے آگاہ کریں گے۔

سہ پہر کو پھر اسی دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مجیب الرحمٰن سے بات ہوئی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ حال ہی میں ایڈمرل احسن سے ان کی دو تین مفصل ملاقاتیں ہوئی ہیں انہوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ صدرِ مملکت راولپنڈی میں میری موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ میں ایک دو روز میں منعقد ہونے والی پارٹی کنونشن کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ واقعی کوئی تازہ صورتِ حال پیدا ہوئی ہے جس پر گفتگو کرنا ضروری ہے میں یہاں سے نہیں نکل سکتا"۔

شام کو جنرل یعقوب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں عوامی لیگ کی خواہش سے حسبِ وعدہ آگاہ کیا ــ انہوں نے مجھے ایک طویل تار کی نقل دکھائی جو انہوں نے صدرِ مملکت کو اسی روز بھیجا تھا اور انہیں جلد از جلد ڈھاکہ پہنچنے کا مشورہ دیا تھا ــ اس سے اندازہ ہوا کہ عوامی لیگ مختلف ذرائع سے وہی بات اوپر پہنچا چکی تھی۔

ہم امید و بیم کی حالت میں صدر کی آمد کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ اب بھی صورتِ حال کو سنبھالا جاسکتا ہے۔ سننے میں آیا کہ صدر یحییٰ خاں تشریف لا رہے ہیں بعض جونیئر افسران کی آمد سے متعلق حفاظتی اقدامات کی جزئیات طے کرنے لگ گئے تاکہ اگر وہ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اچانک آن ہی اتریں تو روایتی انتظامات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

صدرِ مملکت تو تشریف نہ لائے لیکن ان کی جگہ ایک اور شے ڈھاکہ میں نازل ہوئی۔ بھلا بوجھیے تو وہ کیا تھی؟

باب ۷

مجیب کی حکمرانی

۲۸ فروری کو یہ منحوس خبر ڈھاکہ پہنچی کہ ۳ مارچ کو ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ راولپنڈی سے یہ خبر دینے والے صدر یحییٰ خاں کے پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ جی۔ ایم پیرزادہ تھے۔ انہوں نے اس کا جواز یہ پیش کیا کہ اس سے اسمبلی سے باہر کسی آئینی سمجھوتے کے لیے سیاسی جماعتوں کو مزید وقت مل جائے گا۔ یہ فیصلہ ابھی خفیہ تھا۔ گورنر احسن کو قبل از وقت اعتماد میں اس لیے لیا گیا کہ وہ مجیب الرحمٰن کو اس سے آگاہ کریں اور ان کے ممکنہ ردِ عمل سے راولپنڈی کو مطلع فرمائیں، چنانچہ اسی شام مجیب کو گورنمنٹ ہاؤس طلب کیا گیا اور ایڈمرل احسن نے طویل تمہید کے بعد یہ خبر انہیں سنائی۔ تمہید کا مقصد ان کے ردِ عمل کی متوقع شدت کو کم کرنا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ احسن نے بات کہی اور مجیب نے سن لی۔ وہ ذرا بھی برانگیختہ نہ ہوئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا اور وہ بھی نہایت معقولیت سے کہ "میں التوا کو بہانہ بنا کر شور نہیں مچاؤں گا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر التوا کے ساتھ ساتھ اجلاس کی نئی تاریخ کا بھی اعلان ہو جائے تو مجھے جماعت کے انتہا پسند عناصر کو کنٹرول کرنے میں سہولت ہو گی۔ اگر آئندہ تاریخ مارچ میں ہی ہو تو آسانی رہے گی۔ اگر اپریل میں ہو تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اگر اپریل کے بھی بعد ہو تو میرے لیے حالات پر قابو رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔"

مجیب الرحمٰن یہ ردِ عمل بتا کر چلنے لگے تو میجر جنرل راؤ فرمان علی سے کہہ گئے: "آپ مجھے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ صرف ایک بار مجھے ٹیلیفون کر دیجیے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔" مجیب نے اپنی امکانی گرفتاری کا اندازہ کرنے کے لیے خوب دانہ پھینکا، مگر جنرل فرمان خاموش رہے۔

تھوڑی دیر بعد مجیب کی گفتگو کا لبِّ لباب راولپنڈی پہنچا دیا گیا اور مجیب کی تجویز پہنچانے کے علاوہ یہ سفارش بھی کی گئی کہ التوا کے اعلان کے ساتھ نئی تاریخ کا اعلان ضرور کیا جائے۔ راولپنڈی سے جواب ملا: "آپ کا پیغام پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے۔" اس مختصر جواب کی ڈھاکہ میں یہ توضیح کی گئی کہ راولپنڈی نے تجویز کو شرفِ قبولیت بخش دیا ہے، چنانچہ بڑے پُراُمید انداز میں اگلے روز کے اعلان کا انتظار ہونے لگا۔ یہ اعلان مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق یکم مارچ کو ایک بج کر پانچ منٹ پر نشر ہوا۔ ہم اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ریڈیو سیٹوں سے کان لگائے بیٹھے تھے۔ میں عام ریڈیو سیٹ سے ہٹ کر خصوصی شعبے (MONITORING SECTION) میں چلا گیا تاکہ نشریے کا کوئی لفظ شور کی نذر نہ ہو جائے۔ مختصر سا اعلان تھا، چند منٹوں میں ختم ہو گیا، مگر سارے فسانے میں اس بات کا ذکر نہ تھا جس کا ہمیں بیتابی سے انتظار تھا۔ نئی تاریخ کا ذکر نہ تھا

کر میری آنکھوں کے سامنے وحشت ناک مناظر ناچنے لگے۔

اعلان میں ایک اور قابلِ غور بات یہ تھی کہ صدر کی آواز جو کئی غیر اہم موقعوں پر ہماری سماعت کا بار بار امتحان لے چکی تھی آج سُنائی نہ دی۔ ریڈیو کے کسی کارندے نے قوم کی قسمت کا یہ پروانہ کاغذ سے اُٹھا کر ہوا میں بکھیر دیا ــــ لیکن کیوں؟ کیا اِس کا مطلب یہ تھا کہ صدر یحییٰ کی مرضی کے خلاف یا اُن کی اجازت کے بغیر ان کے "انتہا پسند" (HAWKS) جرنیلوں نے یہ اعلان نشر کروا دیا تھا؟ پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری نے جن کا اُوپر ذکر آچکا ہے، اِس بارے میں یہ پُرمعنی فقرہ لکھا ہے کہ "یحییٰ خاں نے تو اس اعلان پر محض دستخط کیے تھے۔" اگر یہ جملہ تاریخی لحاظ سے درست ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس کا اصل مصنّف کون تھا؟ بعض لوگوں نے اِس کا الزام بھٹو پر دھرا ہے اور بعض نے بھٹو کے حامی جرنیلوں پر۔ اصل چہروں سے پردہ اُٹھنا ابھی باقی ہے۔

مَیں اِس منظر سے ہزار میل دُور ہونے کی وجہ سے "اصل مجرموں" کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہُوں، البتّہ سقوطِ ڈھاکہ کی پیچیدہ لڑیوں کو ملاتے وقت جب التوا کے بارے میں اِس نکتے کے متعلّق مَیں نے بعد میں جنرل الف سے پُوچھا تو انہوں نے صرف اِتنا بتایا کہ "اُن دنوں صدر کراچی میں تھے۔ ہم سب نچلی منزل میں تھے اور وہ اُوپر۔ میجر جنرل "ح" اور میجر جنرل "ع" (جو بھٹو کے ذاتی دوست تھے) بار بار سیڑھیاں چڑھ اُتر رہے تھے۔ انہوں نے اوپر جاکر حالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ صدر کو پہلے سے تیّار کردہ مسوّدے پر دستخط کرنے پڑے۔" کیا اِس وضاحت کو جنرل یحییٰ خاں کی معصومیّت کا ناقابلِ یقین ثبوت مان لیا جائے؟ میرے خیال میں مستقبل کے مؤرّخ کو یہ نازک گتھّی سُلجھانے کے لیے بڑی محنت کرنا ہوگی۔

اگر یحییٰ خاں پر اپنے انتہا پسند (HAWK) جرنیلوں کا زور تھا، مجیب پر اپنے انتہا پسند رفقائے کار کا دباؤ تھا اور بھٹو مغربی پاکستان کی رائے عامّہ کا غلام تھا ــــ تو ان تینوں میں سے کون تھا جو صحیح معنوں میں لیڈر کہلانے کا مستحق تھا؟ میرے خیال میں لیڈر کی ایک خصوصیّت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نازک سے نازک موقع پر بھی اپنے عمل کی آزادی کسی نہ کسی حد تک اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

التوا کے اعلان کا ڈھاکہ میں فوری ردّعمل ہُوا۔ اِس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجیب کو ایک روز پہلے اِس کی اطلاع مل گئی تھی اور اُس نے اِس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ اگر اجلاس کی نئی تاریخ کا اعلان نہ کیا جائے تو اس کی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار ہوسکے۔ چنانچہ اعلان کے کوئی آدھ گھنٹے بعد لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ بپھرے ہُوئے عوام، گروہ در گروہ بانس کی لاٹھیاں اور لوہے کی سلاخیں اُٹھائے نعرے لگانے لگے۔ اُن کے الفاظ میں نفرت اور انداز میں وحشت تھی۔ اُن کے دُشنام آمیز نعرے سُن کر یُوں لگتا تھا کہ پُورا شہر غُصّے سے کانپ رہا ہے۔ مشتعل ہجوم نے دکانیں (جن میں سے زیادہ تر غیر بنگالیوں کی تھیں) لُوٹ لیں، گاڑیوں کو نقصان پہنچایا اور ہر وہ چیز جو سامنے آئی، اُسے تہس نہس کر دیا حتّٰی کہ سٹیڈیم میں ہونے والے بین الاقوامی کرکٹ میچ کو بھی درہم برہم کر دیا۔ کھلاڑیوں کو بپھرے ہوئے ہجوم کے نرغے سے بمشکل بچا کر ایم۔ این۔ اے ہوسٹل پہنچایا گیا۔

سڑکوں اور بازاروں میں اپنا ردّعمل یُوں ظاہر کرنے کے بعد عوامی لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے شام کو ایک مقامی ہوٹل میں اپنا اجلاس منعقد کیا جس کے بعد مجیب الرحمٰن نے ایک پُرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "ہم اِس



وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن
گورنر مشرقی پاکستان

صُورتِ حال کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہ سکتے"[1] اسی موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ ۲ مارچ کو ڈھاکہ میں اور ۳ مارچ کو سارے صوبے میں مکمّل ہڑتال کی جائے گی اور (حکومت کو غور و خوض کے لیے تین دن کی مہلت دینے کے بعد) ۷ مارچ کو آئندہ لائحۂ عمل کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ بڑی زوردار پریس کانفرنس تھی اور دندنانے والے مجیب کے امیج کے عین مطابق ۔۔۔ مگر مجیب کی شخصیّت کا ایک دُوسرا رُخ بھی تھا جو انہیں اُسی شام گورنمنٹ ہاؤس میں لے آیا۔ وہاں انہوں نے اعلیٰ فوجی حُکّام کے سامنے نہایت عاجزانہ انداز میں اپیل کی: "حضور، اب بھی وقت ہے، مجھے اجلاس کی نئی تاریخ لے دیجیے، میں اب بھی صُورتِ حال پر قابو پا لُوں گا؛ البتّہ اگر غیر معیّنہ عرصے کے لیے تاخیر ہوگئی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

مجیب کے جانے کے بعد مشرقی پاکستان کے حُکّامِ بالا سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ مجیب کی باتوں میں انہیں مصالحت اور حُبّ الوطنی کی بُو آئی۔ انہوں نے نئی تاریخ لینے کے لیے ٹیلیفون پر جنرل یحیٰی خاں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر صرف لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ جی۔ ایم پیرزادہ تک پہنچ سکے۔ پیرزادہ نے بات کو وہ اہمیّت نہ دی جو ڈھاکہ میں محسوس کی جا رہی تھی۔ پیرزادہ سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے جنرل عبدالحمید سے بات کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ذریعے جنرل یحیٰی خاں کو نئی تاریخ مقرّر کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ جنرل حمید بھی نہ مل سکے کیونکہ وہ اُس رات سیالکوٹ چھاؤنی میں تھے۔ وہاں کال ملائی گئی اور اُن سے بات ہوگئی۔ وہ ویسے بھی بولتے کم اور سُنتے زیادہ تھے۔ انہوں نے بڑے تحمّل سے بات سُنی اور جنرل یحیٰی خاں سے بات کرنے کی حامی بھر لی جس سے ڈھاکہ کی انتظامیہ نے اطمینان کا سانس لیا، مگر یہ وعدہ، وعدۂ دلبرانہ سے بہتر ثابت نہ ہُوا۔

وائس ایڈمرل احسن، لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب اور میجر جنرل راؤ فرمان علی گورنمنٹ ہاؤس ہی میں تھے کہ رات گئے جنرل پیرزادہ نے راولپنڈی سے خود ٹیلیفون کیا۔ ایڈمرل احسن نے ریسیور اُٹھایا۔ پیرزادہ نے پُوچھا: "جنرل یعقوب ہیں؟" "جی ہاں، بیٹھے ہیں۔" "فون انہیں دیجیے۔" جنرل یعقوب نے فون سنبھالا تو پیرزادہ نے کہا: "آپ فوراً احسن سے چارج لے لیں۔" ٹیلیفون بند کر کے جنرل یعقوب نے ایڈمرل احسن کو تازہ احکام سے آگاہ کیا اور یُوں ایڈمرل احسن کی گورنری یکایک اختتام کو پہنچی۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء ہمارے المیّے کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس روز نئی تاریخ کے بغیر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا۔ اسی روز عوامی لیگ نے اپنا عوامی ردِّ عمل دکھایا، اسی روز مجیب نے گورنمنٹ ہاؤس میں نرم رویّے کا اظہار کیا اور اسی روز راولپنڈی اور سیالکوٹ ٹیلیفون کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر کو ہٹایا گیا۔

میرے خیال میں یہ مجیب کے رویّے میں بھی ایک اہم موڑ تھا۔ اُس نے یہ کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈھاکہ کی انتظامیہ کا رویّہ ہمدردانہ سہی، لیکن راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے لوگ جو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں، اُس کی ایک نہیں سُنتے۔ شاید وہ "لاڑکانہ پلان" کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ شاید مصالحت کا وقت گزر چکا ہے!

---

[1] پاکستان آبزرور، ڈھاکہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء

چنانچہ اس نے مذاکرات کا راستہ چھوڑ کر عدم تعاون کی "پُر امن" تحریک کا آغاز کر دیا اور کھُلم کھُلا محاذ آرائی کے راستے پر سفر شروع ہُوا۔

عدم تعاون کی ابتدا ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پی آئی اے کے بنگالی عملے کے بائیکاٹ سے ہوئی۔ انہوں نے یکم مارچ کو اُس وقت کام کرنے سے انکار کر دیا جب بوئنگ طیّارے فوجی جوانوں سے لدے ہُوئے اُتر رہے تھے۔ دو بنگالی نوجوانوں نے تو ایک طیّارے کو تباہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر پاکستانی فضائیہ کے عملے نے اسے ناکام بنا دیا۔

فوجی جوانوں کی آمد سے مجیب الرحمٰن بہت بپھرے۔ انہوں نے پُر زور احتجاج کیا کہ جن بوئنگ طیّاروں میں ارکانِ اسمبلی کو آنا چاہیے تھا، اُن میں بنگالی عوام کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کے لیے فوجی جوان لائے جا رہے ہیں۔ مجیب کے اِس احتجاج اور عوام کے پُر آشوب مزاج کو بھانپتے ہوئے جنرل یعقوب نے جی ایچ کیو سے درخواست کی "لِلّٰہ فوجی جوانوں کی مزید روانگی روک لو، ورنہ اُلٹا نقصان ہوگا۔"

مجیب اب شعلے اُگل رہے تھے۔ اُن کے الفاظ نفرت کے گولے بن کر پھٹ رہے تھے اور ہم ڈھاکہ چھاؤنی میں فکرمند بیٹھے تھے کہ پتہ نہیں کب یہ آگ پورے صوبے یا مُلک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

مقامی مارشل لا انتظامیہ نے ان شعلوں پر قابو پانے کی ایک ترکیب سوچی اور مارشل لا آرڈر ۱ جاری کر دیا جس میں مُلکی سالمیت اور حاکمیت کے منافی خبریں اور تصویریں چھاپنے کی ممانعت کی گئی، مگر ماحول میں حدّت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اِس آرڈر کا خاطر خواہ اثر نہ ہُوا یہ حکم کاغذی پروانہ بن کر رہ گیا، کیونکہ اس کی زد میں جو مواد آ تا تھا وہ زیادہ تر عوامی لیگ ہی جاری کر رہی تھی اور مشرقی پاکستان سے چھپنے والے کسی اخبار میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عوامی لیگ کی خبریں بلیک آؤٹ کر سکے۔ عوامی لیگ کے غنڈے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور جو کوئی عوامی لیگ سے تعاون نہیں کرتا تھا، اُسے ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ حکومت کے وسائل اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ معترض صحافیوں یا دوسرے شہریوں کو فرداً فرداً تحفّظ مہیّا کر سکے۔ علاوہ کس کس اخبار کے سامنے اور کس کس صحافی کے گھر پر پہریدار کھڑے کرتی ــــــ نتیجتہً اس مارشل لا آرڈر ۱ کے باوجود عوامی لیگ کا پلڑا بھاری رہا اور عملی طور پر زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر گزشتہ چند دنوں سے چل رہی تھی۔

یہ صورتِ حال چیف سیکرٹری شفیع الاعظم کے لیے بہت زرخیز تھی۔ انہوں نے اس سے پُورا فائدہ اُٹھایا۔ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت (سول امور کے انچارج) میجر جنرل راؤ فرمان علی کو فون کیا: "حالات بدستور بگڑتے جا رہے ہیں آپ فوج کو بُلا لیجیے۔" جنرل فرمان نے جواب دیا: "فوج کو طلب کرنا اتنا آسان نہیں، اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں، بہتر ہوگا آپ قانون نافذ کرنے والے سول اداروں (پولیس، ایسٹ بنگال رائفلز) کو کام پر لگائیں۔" چیف سیکرٹری نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

"نہیں جرنیل صاحب، اِن اداروں کے بس کی بات نہیں رہی، فوج کو تو آنا ہی پڑے گا۔"

شفیع الاعظم کے علاوہ صوبائی ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس نے بھی مارشل لا حکّام کو اسی نوعیّت کے ٹیلیفون کیے اور فوج بلانے پر زور دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک طرف بنگالیوں کو فوج سے اتنی نفرت ہے اور دوسری طرف اس کو بلانے پر اتنا اصرار ہے۔ آخر کیوں؟

تھوڑی دیر بعد شفیع الاعظم نے پھر جنرل فرمان کو فون کیا اور اپنی "درخواست" پر زور دیا۔ جنرل صاحب نے پُوچھا:

"آپ فوج طلب کرتے ہیں، شاید آپ کو اس کی پیچیدگیوں کا احساس نہیں، آپ پہلے شیخ صاحب (مجیب) سے تو بات کر لیں۔" چیف سیکرٹری نے جواب دیا: "میں ان کی منظوری کے بعد ہی آپ سے عرض کر رہا ہوں۔"

مارشل لا انتظامیہ نے یہ درخواست قبول کر لی اور یوں ایک دام میں جا اُلجھی۔ ادھر ۲ مارچ کی شام کو کرفیو لگانے کا اعلان ہُوا اور فوج اسے نافذ کرنے کے لیے شہر میں داخل ہوئی اور اُدھر عوامی لیگ نے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے لیے اپنے کارکن بھیج دیے۔ صُورتِ حال گھمبیر ہو گئی۔ اسی رات ۳۲ پنجاب رجمنٹ کی ایک پلاٹون کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے چھاؤنی سے گورنمنٹ ہاؤس پہنچایا گیا تاکہ اقتدار کی اِس علامت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

فوجیوں کو حکم تھا کہ کرفیو نافذ کرنا ہے مگر گولی نہیں چلانی۔ ادھر عوامی لیگ کے کارکنوں کو یہ ہدایت تھی کہ کرفیو توڑنا ہے خواہ اِس میں جان ہی چلی جائے۔ یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ فوجیوں نے ابتدائی چند گھنٹے بڑے ضبط سے گزارے اور متواتر اشتعال کے باوجود گولی نہ چلائی۔ ڈھاکہ میں کرفیو نافذ کرنے کے انچارج بریگیڈیئر ارباب نے سپاہیوں کو اُن کے متعلقہ افسروں کی کمان میں چھوڑا اور خود رات گئے مارشل لا ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ وہ خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے داخل ہوتے ہی احتجاج کیا کہ "آپ نے میرے ہاتھ باندھ کر مجھے آگ میں دھکیل دیا ہے۔ فوجی جوانوں کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، اُنہیں گالیاں دی جا رہی ہیں اور اِدھر آپ کا حکم ہے کہ گولی ہرگز نہ چلانا۔ ابھی تک سپاہی اِس حکم کے پابند ہیں، مگر یہ نہیں کب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے۔" میں بریگیڈیئر ارباب کو ۱۹۶۵ء کی جنگ سے جانتا ہُوں، وہ عین لڑائی میں بھی کبھی اِتنے مضطرب نہ ہُوئے جتنے آج دکھائی دے رہے تھے۔

آزمائش کے چند گھنٹے اور گزرے۔ پُر اشتعال ہجوم کی اشتعال انگیزیاں اور بڑھیں۔ سپاہیوں کا صبر اور گھٹا اور تصادم ہو کر رہا۔ ہجوم نے پتھر اور اینٹیں پھینکیں اور سپاہیوں نے حکم کے مطابق گولیوں سے جواب دیا۔ چھ بنگالی ڈھیر ہو گئے جن میں سے تین وہ تھے جنھوں نے گورنمنٹ ہاؤس پر حملہ بولا تھا ——— ایک رات میں چھ لاشیں! یہ سراسر شفیع الاعظم اور اُن کے آقاؤں کی جیت تھی۔ فوج کی پوزیشن اور پیچیدہ ہو گئی۔ عوامی لیگ کی تحریک کو نیا ٹانک مل گیا۔

اگلے روز عوامی لیگ نے ان چھ لاشوں کا جلوس نکالا، شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر نعرے لگائے۔ فوج پر لعن طعن کی اور لوگوں کے جذبات اُبھارے۔ خود مجیب نے ان لاشوں کو سامنے رکھ کر اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا اور اشتعال انگیزی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اسی شام مجیب نے چار صفحوں کا ایک تُند و تیز اخباری بیان جاری کیا جس میں سرکاری ملازموں سمیت معاشرے کے تمام طبقوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس "غیر قانونی حکومت" کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور صرف "عوامی نمائندوں" کو طاقت اور اختیارات کا اصل اور قانونی منبع تصوّر کریں۔

۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی رات کو یہ اخباری بیان مجھے گیارہ سوا گیارہ بجے ملا۔ میں یہ بات فوراً افسرانِ بالا کے نوٹس میں لایا جس پر عقل کے ایک اجارہ دار جھٹ بولے: "مت چھپنے دو، اخبار والوں سے کہہ دو، یہ مارشل لا کا حکم ہے۔" عرض کیا: "کہہ تو سکتا ہوں، مگر اس کے نتائج کا ذمّہ دار کون ہو گا۔ عوامی لیگ کے ہتھیار بند کارکن ایسے اخبار والوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے اور مجیب اور زیادہ مشتعل ہو کر کل مارشل لا انتظامیہ پر اور زور سے برسے گا ——— سوچ لیجیے۔"

ساتھ والے دفتر میں جنرل یعقوب نے مجھے بُلایا اور پُوچھا: "یہ اخباری معاملہ ہے، تمہارا کیا مشورہ ہے؟" میں نے جنرل

یعقوب اور مجیب الرحمٰن کے خوشگوار مراسم کے پیشِ نظر تجویز کیا: "آپ مجیب سے بات کر لیں، اگر وہ بیان واپس لے لے یا اسے نرم کر دے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔" انہوں نے کہا: "بیٹھو۔" میں ان کی چمکدار میز کے دوسری جانب جنرل صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے اے ڈی سی سے کہا: "مجھے مجیب الرحمٰن ملاؤ۔" چند لمحے بعد وہ مجیب سے محوِ گفتگو ہو گئے۔ میں بیٹھا سنتا رہا۔ انہوں نے شیخ مجیب سے ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بج کر دس منٹ تک بات کی اور انہیں قائل کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا، کبھی مدبرانہ انداز اختیار کیا اور کبھی مصالحانہ، کبھی ایک دلیل دی، کبھی دوسری، مگر ہر وار بے اثر رہا۔ مثلاً انہوں نے مجیب سے کہا: "شیخ صاحب! آپ خود سیانے ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ حالات کتنے کشیدہ ہیں، آپ کے بیان سے صورتِ حال اور گھمبیر ہو جائے گی۔" مجیب نے جواباً کہا: "جی نہیں، اس میں تو کوئی اشتعال انگیز بات نہیں، یہ تو محض ایک سیاسی بیان ہے۔"

جنرل یعقوب نے ٹیلیفون بند کر دیا اور کہا: "وہ کہہ رہا تھا میں بیان کو نرم نہیں کر سکتا۔ مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ مجھے گرفتار کر لیں، اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں کہنے والا تھا کہ اس سے تمہارا مسئلہ تو حل ہو جائے گا، مگر میرا حل نہیں ہو گا، مگر میں نے سوچا یہ جُملہ بازی کا موقع نہیں . . . . بہر حال یہ تو رہا تمہاری تجویز کا حشر! اب بتاؤ اگلا راستہ کدھر کو نکلتا ہے۔" میں خاموش رہا کیونکہ اخباری معاملہ ختم تھا اور فوجی معاملہ شروع ہو چکا تھا۔

اس کے فوراً بعد جنرل یعقوب نے تین سینیئر افسروں کی میٹنگ بلائی جسے انہوں نے ہلکے پھلکے موڈ میں "منی وار کونسل" (ننھی مُنّی جنگی مجلسِ مشاورت) قرار دیا۔ اس میں میجر جنرل خادم حسین راجہ، میجر جنرل راؤ فرمان علی اور بریگیڈیئر غلام جیلانی شامل تھے۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا گیا ——— صورتِ حال پر از سرِ نو غور کیا گیا اور مجیب الرحمٰن کے سخت رویّے کے پیشِ نظر لائحہ عمل وضع کرنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ صوبے بھر میں متعیّن افواج کو پیشگی اطلاع دی جائے کہ یہ بیان چھپنے والا ہے جس کے ردِّ عمل سے نپٹنے کے لیے وہ تیّار رہیں۔

راتوں رات یہ احکام تمام چھاؤنیوں میں پہنچا دیے گئے۔

اگلی صبح جنرل یعقوب نے راولپنڈی فون کیا اور متعلقہ افسروں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں، صُورتِ احوال سے نپٹنے کے لیے فوری اور حتمی فیصلہ کیا جائے یا ایسا کرنے کا مجھے اختیار دیا جائے۔ صدر یحییٰ خاں کی طرف سے جواب آیا: "مجھے آپ کی صائب رائے پر پورا اعتماد ہے۔ اگر کسی موقع پر ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا، تو اپنی صوابدید کے مطابق ایکشن لیں۔" ——— درحقیقت ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان رابطہ پہلے ہی منقطع ہو چکا تھا، صرف تار اور ریڈیو جیسے مادّی ذرائع باقی رہ گئے تھے۔

راولپنڈی میں کسی کے کان پر جُوں نہ رینگی، وہ اپنی مصروفیات میں محو رہے۔ عوامی لیگ اپنی تحریک کو تیز تر کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کرتی رہی۔ نتیجۃً جگہ جگہ مشتعل ہجوم اور سرکاری عملے (فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس) کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ خون بہتا رہا، جائیداد تباہ ہوتی رہی اور حالات میں کشیدگی بڑھتی رہی۔ تصادم اور ہلاکت کی خبریں ڈھاکہ کے علاوہ چٹاگانگ، جیسور، کھلنا، کومیلا، سلہٹ اور رنگ پور سے بھی موصول ہو رہی تھیں۔ جہاں تصادم کے لیے بنگالیوں کو فوج نظر نہیں آتی تھی، وہ غیر بنگالیوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان میں سے اَن گنت افراد بنگالی بلوائیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، کئی گھروں کے چراغ گُل ہوئے اور کئی خاندانوں کی آبرو خاک میں ملی۔



لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خاں
کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

صورتِ حال سے صدر یحییٰ خاں کو متواتر باخبر رکھا گیا، لیکن ہر نئے تار کے جواب میں خاموشی ـــ عجیب اور ناقابلِ برداشت خاموشی! وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس وقت کا انتظار ہو رہا ہے۔ چند روز بعد جب جنرل یحییٰ خاں کو بظاہر یقین ہو گیا کہ اب صورتِ حال ناقابلِ تلافی حد تک بگڑ چکی ہے، تو انہوں نے ۱۰ مارچ کو ڈھاکہ میں تمام سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس کا اعلان کرنے سے پہلے انہوں نے اپنے نائبین کو ڈھاکہ میں حکم دیا کہ وہ مجیب کو اِس فیصلے سے قبل از وقت آگاہ کریں اور ردِّ عمل انہیں بتائیں۔

جنابِ مجیب کو جب اطلاع دی گئی تو انہوں نے اِس تجویز سے اتفاق کیا۔ حُکّام نے فوراً "رضامندی" کا تار راولپنڈی روانہ کر دیا۔ صدر نے اگلے روز اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس پر فوراً مجیب الرحمٰن چنگھاڑے: "اب کوئی گول میز کانفرنس[1] نہیں ہوگی، اب یہ مذاق نہیں چلے گا۔" مجیب الرحمٰن جب گرج برس چکے، تو ڈھاکہ کے ایک حاکمِ اعلیٰ نے اُن سے اِس قلابازی کی وجہ پوچھی، تو وہ بولے: "مَیں نے کسی گول میز کانفرنس کی تجویز سے کبھی اتفاق نہیں کیا تھا۔ مَیں تو سمجھا تھا کہ یحییٰ خاں ڈھاکہ میں فرداً فرداً یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں سیاستدانوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا تم لوگ ایک ہی میز پر مجھے اُس بھٹو کے ساتھ بٹھانا چاہتے ہو جو میرے لوگوں کا قاتل ہے۔" مجیب الرحمٰن کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو کشت و خون ہو رہا ہے، یہ سب بھٹو کے ایماء پر ہو رہا ہے ـــ واللہ اعلم بالصواب!

گولیوں کا نشانہ بننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ۴ مارچ کو ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال اور مٹفورڈ ہسپتال میں ایک سو پچپن زخمی داخل ہوئے۔ اگلے روز آٹھ مارے گئے۔ چار موقع پر اور چار ہسپتال میں۔ مجیب الرحمٰن خود زخمیوں کی خبرگیری کرنے ہسپتال گئے اور خون کے عطیات کے لیے اپیل کی۔

شفیع الاعظم کی درخواست پر ـــ اور مجیب الرحمٰن کی رضا سے ـــ فوج کو شہر میں داخل ہوئے بمشکل دو دن اور تین راتیں گزری تھیں کہ عوامی لیگ نے اس کی موجودگی کو "عوام کے لیے باعثِ اشتعال" قرار دے کر فوج کو واپس بیرکوں میں بھیجنے کا مطالبہ کر دیا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا مجیب صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ عوامی تحریک کو کچلنے میں فوج کتنی مؤثر (یا غیر مؤثر) ہو سکتی ہے، مگر سوال یہ تھا کہ اگر فوج کو واپس چھاؤنی میں بھیج دیا جائے تو شہر میں امن و امان کون بحال رکھے گا؟ اور عوامی لیگ سے اختلاف رکھنے والے اور دوسرے غیر بنگالیوں کا کیا بنے گا، اُن کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کا ذمہ کون لے گا؟ مجیب نے کہا: "یہ سب مجھ پر چھوڑ دو، مَیں اپنے رضاکاروں کی مدد سے امن و امان بحال رکھوں گا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو انصار[2] سے کام لوں گا۔ اگر بات آگے بڑھی، تو پولیس کو استعمال کروں گا، مگر آپ فوج کو واپس لے جائیے۔ اس کی موجودگی میں امن بحال نہیں ہو سکتا۔"

مجیب کی اس "پیشکش" پر مارشل لا ہیڈکوارٹر میں سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ تاثر غالب رہا کہ امن و امان برقرار رکھنے کی کوئی کوشش اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مجیب کا تعاون حاصل نہ ہو ـــ لیکن مجیب کی تجویز

---

[1] یہ اشارہ صدر ایوب خاں کی گول میز کانفرنس کی طرف تھا جو ۱۰ تا ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء راولپنڈی میں ہوئی تھی۔

[2] نیم فوجی تنظیم جو پولیس کی طرح صوبائی حکومت کے ماتحت تھی اور اس میں زیادہ تر بنگالی نفری تھی۔

پر مقامی سطح پر فیصلہ کرنے کے بجائے راولپنڈی کو تازہ صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔ وہاں سے حکم آیا مجیب الرحمٰن کی "پیشکش" قبول کرلی جائے اور فوج کو واپس بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔

اس طرح حکومت نے رضاکارانہ طور پر مجیب الرحمٰن کو صوبے میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری منتقل کردی اور فوج واپس چھاؤنی بھیج دی۔ اس سے مشرقی پاکستان پر مجیب کی گرفت اور مضبوط ہوگئی جس کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ مجیب کے اس دور میں غیر بنگالیوں کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ وہ ظلم وستم سے تنگ آکر اپنے گھر چھوڑنے اور چھاؤنیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ڈھاکہ چھاؤنی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں پانچ سے لے کر پچاس افراد پناہ گزین نہ ہوں۔ یہ لوگ برآمدوں میں، صحنوں میں گیلریوں میں حتیٰ کہ باورچی خانوں میں سمٹے بیٹھے تھے ـــــ جو لوگ سلامتی کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے وہ مغربی پاکستان پرواز کر گئے، جو بے کس اور بے مایہ تھے، وہیں وار سہتے رہے۔

جنرل یعقوب ایک پڑھے لکھے انسان تھے، انسانی آلام کے بارے میں گہری تشویش رکھتے تھے۔ انہوں نے ۴ مارچ کو جنرل ایس۔جی۔ایم۔ پیرزادہ کو فون کیا اور کہا کہ صدر یحییٰ خاں کو بلاتاخیر ڈھاکہ پہنچنا چاہیے، کیونکہ ہر لمحہ ہمیں مسئلے کے حل سے دُور لیے جارہا ہے۔ جنرل پیرزادہ نے یحییٰ خاں سے بات چیت کرنے کے بعد بتایا کہ صدر جلد ہی ڈھاکہ آئیں گے؛ البتہ قطعی تاریخ کا تعین اس وقت مشکل ہے۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ ابھی ٹیلیفون پر مجیب سے بات کریں گے اور اُن سے کہیں گے کہ وہ حالات کو مزید خراب نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد یحییٰ خاں کو مجیب الرحمٰن کے گھر ایک ایسے ٹیلیفون پر ملادیا گیا جو کسی ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ تھا۔ اس گفتگو کا ریکارڈ کہیں موجود نہیں۔

صدر یحییٰ خاں کی متوقع آمد کی خبر سُن کر جنرل یعقوب اور اُن کے رفقاء کو قدرے اطمینان ہُوا۔ اُڑتی اُڑتی یہ خبر مجھ جیسے جونیئر افسروں تک بھی پہنچی۔ ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بات آگے تو بڑھی۔

اسی رات (۴ اور ۵ مارچ کی درمیانی شب) گورنر احسن کو مغربی پاکستان روانہ ہونا تھا۔ وہ جنرل یعقوب کے گھر ایک الوداعی دعوت میں مدعو تھے۔ جنرل فرمان اور جنرل خادم بھی موجود تھے۔ وائس ایڈمرل احسن کو جہاز پر چڑھانے کے بعد تینوں جرنیل فلیگ سٹاف ہاؤس (جو جنرل یعقوب کا مسکن تھا) پہنچے اور صدر یحییٰ خاں کے متوقع دورے اور اس کے مفید نتائج پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ جب گھڑی پر نو بجکر دس منٹ ہوئے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ کال جنرل یحییٰ خاں کی طرف سے تھی۔ وہ جنرل یعقوب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ جنرل یعقوب نے دل میں کئی وسوسے لیے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ جنرل خادم، جنرل فرمان اور تینوں بیگمات اُمید وبیم کی حالت میں دیکھتی رہیں کہ کیا خبر آتی ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے کہا: "میں نے فی الحال ڈھاکہ آنے کا ارادہ بدل لیا ہے۔" جنرل یعقوب نے حسبِ توقع اُن کے تشریف لانے پر اصرار کیا، مگر یحییٰ خاں نہ مانے، انہوں نے کہا: "نہیں، نہیں، میں نہیں آسکتا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے آنے سے صورتِ حال کو بہتر بنانے میں کوئی مدد نہیں ملے گی" ـــــ انہوں نے یہ فیصلہ سُنا کر فوراً ٹیلی فون بند کردیا۔

تینوں جرنیل سخت مایوس ہوئے۔ صدر نے دوٹوک فیصلہ دے کر اُمید کی آخری کرن بھی بجھا دی تھی۔ اب کیا ہوسکتا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئے۔



لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں   گورنر مشرقی پاکستان



لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ پرنسپل سٹاف افسر، صدر پاکستان

جنرل یعقوب نے آپریٹر سے کہا کہ وہ جنرل پیرزادہ سے ملا دے۔ چشم زدن میں کال مل گئی۔ جنرل یعقوب نے کہا: "پیرا! اگر صدر کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا، تو مجھے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ میں کل صبح استعفیٰ ارسال کر دوں گا۔"

بات ختم ہوئی۔ جنرل یعقوب چہرے پر برہمی کے آثار لیے واپس ڈرائنگ رُوم میں پہنچے۔ جنرل فرمان اور جنرل خادم نے بھی مستعفی ہونے کی پیشکش کی تاکہ کم از کم اب ان دونوں سینیئر افسروں کا موقف یہی ہے۔ اس پر جنرل یعقوب نے ان کی تائید اور حمایت کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "یہ کوئی ٹریڈ یونین نہیں، فوج ہے، اس میں یُوں استعفیٰ دینا مناسب نہیں۔"

رات گئے یہ محفل برخاست ہوئی اور تازہ صُورتِ حال کے پیشِ نظر طے پایا کہ اسی رات جنرل فرمان راولپنڈی چلے جائیں اور بالمشافہ صدر یحییٰ خاں اور جنرل پیرزادہ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کریں ——— جنرل فرمان بلا تاخیر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح جنرل یعقوب نے بذریعہ تار (سگنل) اپنا استعفیٰ راولپنڈی بھیج دیا۔

جنرل یعقوب کا تحریری استعفیٰ ملنے سے پہلے ہی جنرل یحییٰ خاں اگلا قدم اٹھا چکے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور کور کمانڈر جنرل ٹکا خاں کو راولپنڈی طلب کیا تاکہ انہیں جنرل یعقوب کی ذمہ داریاں سونپ سکیں۔

جنرل فرمان اور جنرل ٹکا خاں جو مختلف مقامات سے مختلف جہازوں پر مختلف اوقات میں روانہ ہوئے تھے، اپنی منزل پر تقریباً ایک ہی وقت پہنچے۔ انہوں نے صدر سے الگ الگ ملاقات کی۔ جنرل ٹکا خاں نے فوراً جنرل یحییٰ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ جنرل فرمان نے نسبتاً طویل گفتگو کے دوران صدر کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور بلا تاخیر فیصلوں کی ضرورت پر زور دیا۔ یحییٰ خاں نے یہ رام کہانی سُننے کے بعد کہا: "بچو، مجھے اپنے بیس[1] کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ میں مشرقی پاکستان کے لیے مغربی پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔" یہ عُقدہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ اُن کی مُراد مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو سے تھی، فوجی جرنیلوں سے یا دونوں سے؟

اِس اثنا میں مشرقی پاکستان میں مزید خُون بہتا رہا۔ ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر وہ غیر بنگالی (بہاری اور مغربی پاکستانی) تھے جو عوامی لیگ کے دہشت پسندوں کے خلاف اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے ——— ان کی داستانِ غم اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زیادتیاں صرف بنگالیوں پر ہی نہیں ہوئیں، غیر بنگالیوں پر بھی ہوئی ہیں اور وہ بنگالیوں کے بے انتہا غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہیں۔

ایک دن میں سب سے زیادہ خون جس جگہ بہا وُہ چٹاگانگ کا وہ حصّہ ہے جسے پہاڑتلی کہتے ہیں۔ وہ واقعی ظلم کے پہاڑ تلے آ گیا تھا۔ وہاں ۳ مارچ کو ۱۰۲ غیر بنگالیوں (زیادہ تر بہاریوں) کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر مجمدار نے جنہیں چٹاگانگ کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا تھا، اِس قتل و خون کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی نہ کی۔ یہ وہی بریگیڈیئر ہیں جن سے میں نے فوج میں بنگالیوں کا کوٹا دُگنا کرنے کے سلسلے میں انٹرویو لیا تھا۔ چٹاگانگ کا ذکر صرف نمونے کے طور پر کیا ہے۔ اس طرح کی بہت سی وارداتیں مشرقی پاکستان کے کئی علاقوں میں ہوئیں جہاں عوامی لیگ کے غُنڈوں کو من مانی کرنے کا موقع ملا۔

خود ڈھاکہ میں حالت تشویشناک تھی۔ شہریوں میں احساسِ تحفظ ختم ہو چکا تھا۔ ہر وقت مُوت سَر پر منڈلاتی نظر آتی تھی۔ لوگ

---

[1] BASE: بمعنی بنیاد، یہاں مُراد طاقت کا ستون۔

اپنا گھر بلو ساماں اونے پونے بیچ کر مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ گلشن کالونی اور بانانی کالونی (جو ڈھاکہ کا گلبرگ کہلاتا تھا) کے لوگوں نے پی آئی اے کے ٹکٹ کے عوض (جس کی مالیت صرف ۲۵۰ روپے تھی) اپنی نئی کاریں دے دیں۔ بعض نے اپنا بھرا ہوا گھر دوسرے کو سونپ کر راہِ فرار اختیار کی۔

ہوائی اڈے پر دن رات ٹکٹ کے اُمیدواروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ لوگ رات کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹتے تھے کہ اگلے روز اُن کی باری پیچھے چلی جائے گی۔ یہ نظارہ بڑا رقّت انگیز تھا جیسے سمندر کی بے رحم لہروں نے بحری قزّاقوں کے ہاتھوں لُٹے پِٹے اس بے یار و مددگار قافلے کو ساحل کی یخ بستہ ریت پر پھینک دیا ہے۔ اب اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں، اب اس کا کوئی مددگار نہیں ——

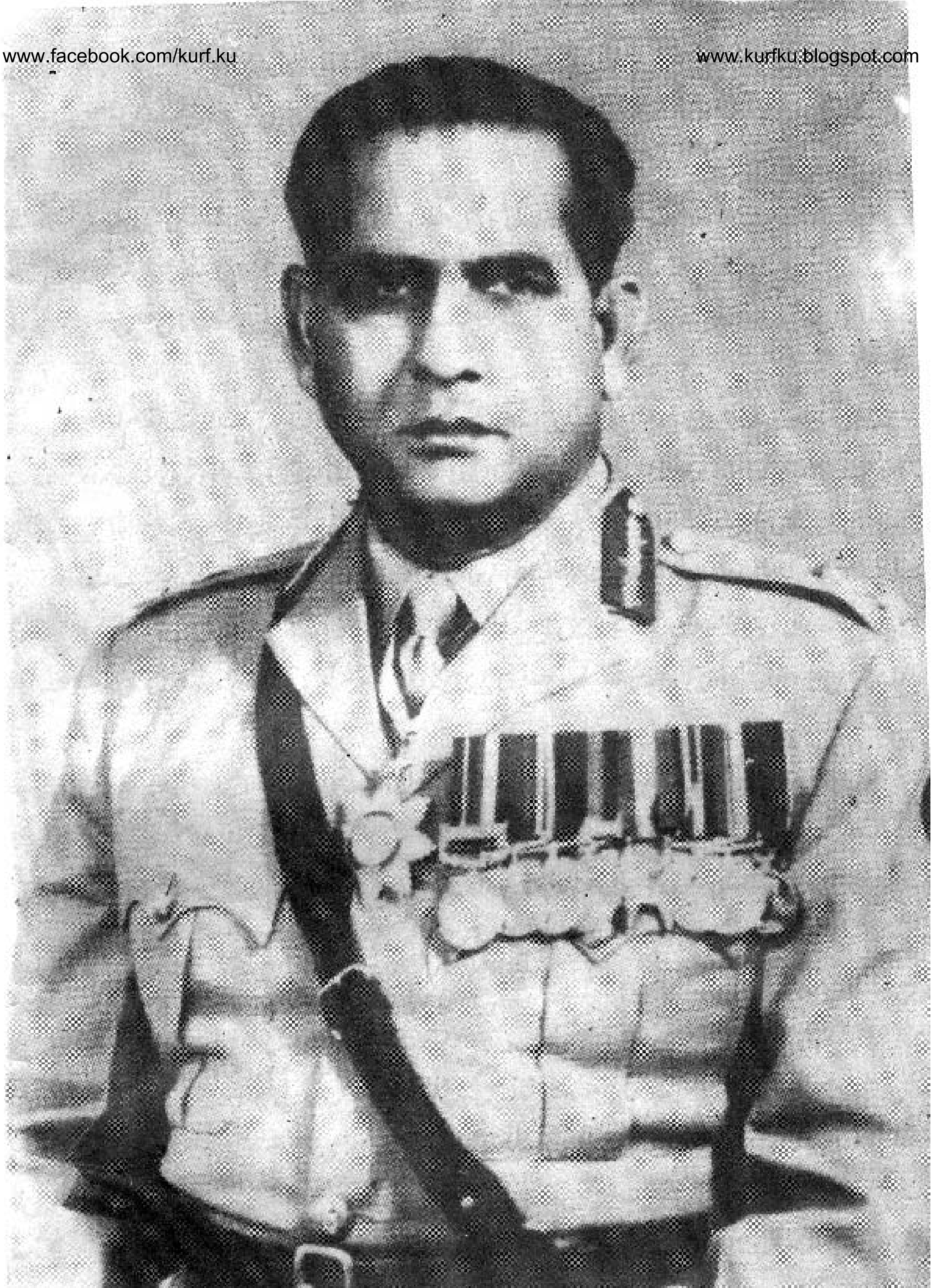
عوامی لیگ کے رضاکاروں نے ہوائی اڈے کی طرف جانے والی تمام سڑکوں پر چوکیاں (چیک پوسٹ) قائم کر رکھی تھیں تاکہ "بنگلہ دیش کی دولت کے انخلاء" کو روکا جا سکے۔ سب سے بڑی چوکی شہر سے ہوائی اڈے کو آنے والی بڑی سڑک پر فارم گیٹ کے قریب واقع تھی جہاں شہر سے آنے والے ہر مسافر کو روکا جاتا اور اس کی تلاشی لی جاتی۔ ایک روز ایک پٹھان رکشا میں سوار وہاں سے گزرنے لگا، تو اُسے بھی روک لیا گیا۔ اُس نے مزاحمت کی، تو وہیں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ایک نالی میں پھینک دی گئی۔ یہ واقعہ دن دہاڑے مارشل لا ہیڈکوارٹر سے صرف چند سو میٹر کے فاصلے پر پیش آیا۔ تھوڑی دیر بعد فوجی جوانوں پر مشتمل ایک ٹولی بھیجی گئی تاکہ وہ میّت لے کر چھاؤنی میں دفنا دیں —— کہ یہی واحد جائے اماں تھی زندہ اور مُردہ محبّ ِ وطنوں کے لیے ——

جُوں جُوں ۷ مارچ کی فیصلہ کُن تاریخ قریب آتی گئی، ڈھاکہ افواہوں اور خدشوں کی لپیٹ میں آتا گیا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب شیخ مجیب الرّحمٰن کو رمنا ریس کورس میں جلسۂ عام سے خطاب کرنا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اس روز وہ بنگلہ دیش کی آزادی کا یک طرفہ اعلان کر دیں گے۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے اُس صورتِ حال کو باضابطہ اعلان نصیب ہو جائے گا جو واقعۃً سارے مشرقی پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ البتّہ یہ کہنا بعید از قیاس تھا کہ مسلّح افواج اِس اعلان پر خاموش بیٹھی رہیں گی، تو کیا وسیع پیمانے پر خانہ جنگی کا وقت آ گیا تھا؟

عوامی لیگ کو بھی اس خونی امکان کا احساس تھا۔ اس کی سنجیدہ قیادت ایسی صورتِ حال ٹالنا چاہتی تھی، مگر انتہا پسند گروہ اعلانِ آزادی میں مزید تاخیر کے خلاف تھا۔ مجیب کا اپنا ذہن کس طرف تھا؟ اِس کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک گروہ کے دباؤ میں کبھی ایک طرف جُھک جاتے اور کبھی دوسرے گروہ کے کہنے پر دوسری طرف۔

کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجیب الرّحمٰن نے ۶ مارچ کو رات کے کھانے کے بعد اپنے رفقاء کا اجلاس بلایا۔ مارشل لا ہیڈکوارٹر بھی منتظر تھا کہ دیکھیے اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آدھی رات کو کسی فیصلے کے بغیر یہ تاریخی اجلاس اگلی صبح تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔

اُس رات دو اور اہم واقعات ہوئے۔ صدر یحییٰ نے مجیب کو اپنی گفتگو کی تائید میں ایک برقی پیغام بھیجا جو آدھی رات کو میری موجودگی میں مارشل لا ہیڈکوارٹر میں موصول ہُوا۔ ایک سینیئر افسر فوراً یہ پیغام لے کر مجیب الرّحمٰن کے گھر چلے گئے۔ اِس پیغام کا لُبِّ لباب یہ تھا:



میجر جنرل خادم حسین راجہ

جی او سی ، ۱۴ ڈویژن

براہِ کرم جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ مَیں جلد ہی ڈھاکہ آؤں گا اور آپ سے مفصّل بات چیت کروں گا۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی آرزوؤں سے بڑھ کر آپ کے (عوام سے) وعدوں کی تکمیل ہوگی۔ میرے ذہن میں ایسا نقشہ ہے جو چھ نکات سے بڑھ کر آپ کو مطمئن کر سکے گا۔
مَیں تاکید کروں گا کہ آپ کوئی عاجلانہ فیصلہ نہ کریں۔"

بریگیڈیئر صاحب پیغام پہنچا کر واپس مارشل لا ہیڈ کوارٹر پہنچے، تو مجیب الرحمٰن کی خوش خُلقی اور تواضع کے گُن گانے لگے۔ انہوں نے بتایا دھان منڈی میں مجیب کے گھر شادی کا سماں ہے۔ باہر بہت سی کاریں کھڑی ہیں اور غیر معمولی روشنیاں ہیں، بیسیوں لوگ بیٹھے ہیں میرے پہنچنے پر شیخ صاحب نے میرا خیر مقدم کیا اور مٹھائی لانے کو کہا۔

بعض غیر مُلکی اخبار نویسوں کا یہ دعویٰ کہ یحییٰ خاں نے مذکورہ بالا پیغام ڈھاکہ کی مارشل لا انتظامیہ کے کہنے پر بھیجا تھا تاکہ فوجی کارروائی کے لیے مزید وقت مل سکے، سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ جنرل یحییٰ خاں کے ذہن میں ایسا کونسا نقشہ تھا جو مجیب کو بھی مطمئن کرتا اور پاکستان بھی بچ جاتا۔

اُسی رات دوسرا اہم واقعہ ڈھاکہ چھاؤنی میں میجر جنرل خادم حسین راجہ جی او سی کے گھر رُونما ہُوا۔ رات کے دو بجے اُن کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ اُنہیں جگا کر اطلاع دی گئی کہ تین آدمی اُن سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے اُن کے نام پُوچھے، تو انہیں بتایا گیا کہ اُن میں سے ایک اُن کے اپنے انٹیلی جنس افسر اور دو سویلین ہیں۔ جنرل راجہ نے انہیں اندر بُلوایا اور آنے کا مُدّعا پُوچھا۔ دو سویلین جو عوامی لیگ کی طرف سے آئے تھے، کہنے لگے: "انتہا پسند عناصر شیخ مجیب پر حد درجہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سہ پہر کو آزادی کا یک طرفہ اعلان کر دیں۔ شیخ صاحب اب تک یہ مطالبہ ٹالتے رہے ہیں، لیکن اب ان میں مزاحمت کی ہمّت نہیں رہی۔ انہوں نے درخواست کی ہے کہ فوج انہیں اپنی تحویل میں لے لے۔"

میجر جنرل خادم حسین راجہ نے جواب دیا: "مجھے یقین ہے کہ مجیب الرحمٰن جیسا مقبول رہنما ضرور جانتا ہوگا کہ دباؤ کو کس طرح ٹالا جا سکتا ہے۔ آپ انہیں میری طرف سے کہہ دیجیے کہ مَیں کل رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں موجود رہوں گا اور انہیں انتہا پسندوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچنے دُوں گا —— لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیجیے کہ اگر انہوں نے پاکستان کی سلامتی کے خلاف کوئی بات کہی، تو مَیں اپنی تمام توپیں، ٹینک اور مشین گنیں لگا کر تمام غدّاروں کو نابود کر دُوں گا اور ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دُوں گا۔ حکومت کرنے کو کوئی بچے گا نہ حکومت کرنے کے لیے کچھ باقی رہے گا۔"

اُدھر ۷ مارچ کا سُورج طلوع ہُوا اور اِدھر پاکستان میں متعیّن امریکی سفیر جناب فارلینڈ، مجیب کے گھر داخل ہوئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر واپس چلے گئے۔ اِن حضرت کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد عوامی لیگ کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ایک اخبار نویس کا مجھے ٹیلیفون آیا: "سالک صاحب، مُبارک ہو، یک طرفہ اعلانِ آزادی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔" پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری، امریکی سفیر کی اس بے وقت مُلاقات کا مُدّعا یُوں بیان کرتے ہیں: "امریکی سفیر فارلینڈ نے مجیب پر امریکی پالیسی واضح کر دی تھی اور کہا تھا کہ علیحدگی کے کھیل میں امریکہ سے کسی امداد کی توقع نہ رکھنا۔" (صفحہ ۱۲۰)

پھر وہ فیصلہ کُن لمحہ آن پہنچا۔ رمنا ریس کورس میں جلسے کا وقت ہوگیا۔ ریڈیو سٹیشن ڈھاکہ نے افسرانِ بالا کی اجازت کے بغیر جلسہ گاہ سے براہِ راست کارروائی نشر کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور ریڈیو اناؤنسر ڈھائی بجے سے سامعین کو رواں تبصرے کی صورت

یہ بتایا جا رہا تھا کہ جلسہ گاہ میں دس لاکھ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر "بنگلہ بندھو" مجیب الرحمٰن کا انتظار کر رہا ہے۔

یہ اعلان راولپنڈی میں بھی کسی نے سُنا اور صدر یحییٰ کے ہیڈ کوارٹر سے ایک بریگیڈیئر نے ڈھاکہ فون کیا کہ یہ بکواس بند کرواؤ۔ جب فون بریگیڈیئر "ج" کو ملا، تو میں اُن کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے مجھے فون دیتے ہوئے کہا: "لو، یہ تمہارے محکمے کی بات ہے تم سنبھالو۔" میں نے احکام موصول ہوتے ہی ریڈیو سٹیشن فون کیا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تقریباً تمام نمبر گھمائے، مگر بے سُود! بالآخر ریڈیو سٹیشن کا ایک ادنیٰ سا افسر اتفاقاً مل گیا۔ میں نے اُس سے کہا: "جلسہ گاہ سے براہِ راست نشریات فوراً بند کی جائیں، یہ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کا حکم ہے، اگر اس کی تعمیل نہ ہوئی تو آپ ذمہ دار ہوں گے۔" اُس نے غصے سے کہا: "اگر ہم ساڑھے سات کروڑ عوام کی آواز نشر نہیں کر سکتے، تو پھر یہاں کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" ٹیلیفون بند ہونے کے چند منٹ بعد ریڈیو سٹیشن خاموش ہو گیا۔[لہ]

شیخ مجیب الرحمٰن پروگرام کے مطابق جلسہ گاہ پہنچے جہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا لاکھوں افراد کا ہجوم اُن کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں آزاد بنگلہ دیش کا قومی پرچم لہرانے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، حالانکہ اسی صبح ان کی موجودگی میں چند طلبہ نے ان کے ذاتی مکان پر یہ "قومی پرچم" لہرا دیا تھا۔ وہ شدّت جذبات سے مغلوب اور حالات سے پریشان ڈائس پر چڑھے اور ہجوم کا جائزہ لیا۔ مجیب نے اپنی تقریر کا آغاز حسبِ معمول گھن گرج سے کیا، مگر آہستہ آہستہ عوام کے جذبات کو آنچ دینے کے بجائے ایک نئی راہ پر ڈالنا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے کی نسبت مختصر تقریر کی اور اعلان آزادی سے اجتناب کیا۔ البتہ انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں (جو نئے اعلان کے مطابق ۲۵ مارچ کو ہونے والا تھا) شرکت کے لیے چار شرطوں کا اعلان کیا:

(ا) مارشل لا اُٹھا لیا جائے۔

(ب) اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔

(ج) فوج کو بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔

(د) حالیہ قتل و غارت کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔

تقریر کے اختتام پر انہوں نے سامعین کو مشورہ دیا کہ وہ پُرامن رہیں اور کسی تخریبی کارروائی میں حصہ نہ لیں؛ چنانچہ جلسہ ختم ہوتے ہی حاضرین خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ عبادت گزاروں کا کوئی مجمع اطمینان بخش وعظ سُن کر چکے سے واپس آ رہا ہے۔

ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی ہے، ورنہ اسی مشتعل ہجوم کو اگر وہ چھاؤنی پر یلغار کرنے کا اشارہ کر دیتے، تو وہ ضرور دھاوا بول دیتا، خواہ اس میں اُسے جان کی بازی لگانا پڑتی۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں بھی اس تقریر کا خوشگوار اثر ہوا اور راولپنڈی سے ٹیلیفون کال کا جواب دیتے ہوئے بریگیڈیئر "ج" نے کہا: "موجودہ حالات میں یہ بہترین تقریر تھی۔"

لہ اس نے اپنی نشریات کا آغاز اگلی صبح کیا جب مجیب الرحمٰن کی تقریر کا ٹیپ نشر کرنے کی اجازت مل گئی۔

آزادی کے یک طرفہ اعلان کا خطرہ ٹل گیا، تو اس کے اسباب پر اظہارِ خیال کیا جانے لگا۔ کسی نے اسے صدر یحییٰ خان کی بروقت مداخلت پر محمول کیا، کسی نے اسے جنرل راجہ کی دھمکی کا اثر بتایا اور کسی نے اس کا سلسلہ فارلینڈ کی ملاقات سے ملایا، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اسے مجیب الرحمٰن کی حُبّ الوطنی کی دلیل نہ سمجھا۔

جس سہ پہر کو مجیب الرحمٰن کی یہ تقریر تھی، اسی سہ پہر کو تین بجکر چالیس منٹ پر مشرقی پاکستان کے نئے حاکمِ اعلیٰ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں چارج لینے ڈھاکہ پہنچے۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب، میجر جنرل خادم راجہ اور دوسرے سینئر فوجی افسر اُن کے استقبال کے لیے ہوائی اڈّے پر موجود تھے۔ مَیں بھی حاضر تھا۔ جنرل ٹکا خاں نیلے رنگ کا سُوٹ پہنے ہشاش بشاش طیارے سے اُترے، وہ بھرپُور اعتماد اور تیغِ عزم کی زندہ مثال تھے۔ اس کے برعکس جنرل یعقوب پژمُردہ اور بجھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اندرونی ہیجان کو چُھپانے کے لیے بار بار اپنی پتلی سی چھڑی اپنی خاکی پتلون پر مار رہے تھے۔ تاریخ کے اس دوراہے پر ان دو جرنیلوں کے رُوپ اور رول میں فرق بڑا نمایاں تھا۔

ہوائی اڈّے پر رسمی علیک سلیک کے بعد کاروں کا قافلہ روانہ ہُوا۔ سب سے آگے سیاہ مرسڈیز تھی جس کی چمکتی چھت پر ڈوبتے سُورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ رات کی تاریکی آخری کرنوں کے ڈوبنے کے انتظار میں تھی۔

جنرل ٹکا خاں موسم کی نزاکتوں سے بے نیاز مرسڈیز کار میں روانہ ہو گئے۔ جنرل راجہ اُن کے ہمراہ تھے۔ راستے میں جنرل ٹکا خاں نے کہا: "آپ لوگوں نے یہاں کیا گند پھیلا رکھا ہے؟" جنرل راجہ جنہوں نے گزشتہ دو برسوں میں بہت سے موسمی اور سیاسی طوفان دیکھے تھے، اس جُملے سے تلملا اٹھے۔ وہ سیٹ کے کنارے پر جا ٹکے اور جنرل ٹکا خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے: "سَر! اپنا تبصرہ کچھ دیر کے لیے اپنے پاس رکھیے۔ ہم یہاں روزانہ ایک دوزخ سے گزرتے ہیں۔ کیا ہماری خدمات کا یہی صلہ ہے؟" جنرل ٹکا خاں خاموش ہو گئے۔

ایک گھنٹے بعد جنرل ٹکا خاں بریفنگ[1] لینے اور چارج سنبھالنے مارشل لا ہیڈ کوارٹر تشریف لائے۔ مجھے حکم ہُوا کہ ساتھ والے کمرے میں انتظار کروں، اگر ضرورت پڑی تو اندر بُلا لیا جاؤں گا۔ مَیں بیٹھا دوش و فردا کے غموں سے کھیلتا رہا اور اعلیٰ افسر دوسرے کمرے میں مصروف رہے۔ کوئی دو گھنٹے بعد بریفنگ ختم ہوئی اور جنرل یعقوب میرے کمرے میں آئے۔ مَیں نے انہیں سلیوٹ کیا، تو انہوں نے کہا: "نہیں، جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو گی۔" پھر انہوں نے شفقت سے اپنا ہاتھ میرے دائیں کندھے پر رکھا اور داغ دہلوی کا یہ شعر پڑھا ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اسی شام آٹھ بجے راولپنڈی تار بھیج دیا گیا کہ جنرل ٹکا خاں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے، گویا اب ان پر بیک وقت تین ذمّہ داریاں تھیں۔ مشرقی پاکستان میں متعیّن افواج کے کمانڈر، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور گورنر۔ جنرل ٹکا خاں کو پہلی دو ٹوپیاں پہننے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی، البتہ تیسری ٹوپی پہنانے کے لیے ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا تعاون ضروری

---

[1] BRIEFING کسی کو متعلقہ صورتِ حال سے آگاہ کرنا۔

تھا کیونکہ قانون کے تحت وہی ان سے گورنر کے عہدے کا حلف لے سکتے تھے۔ جسٹس صدیقی نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ ناسازیٔ طبیعت بتائی، مگر اصل وجہ عوامی لیگ کا اثر تھا جو صرف عوام ہی میں نہیں، بنگالی انتظامیہ اور عدلیہ تک بھی پھیل چکا تھا۔ اس انکار کے چند روز بعد ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن نے ایک باقاعدہ قرارداد پاس کی جس میں مسٹر جسٹس صدیقی کے اس جرأت مندانہ اقدام کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

جنرل ٹکا خاں نے اپنے بنگالی چیف سیکرٹری کو خود فون کیا کہ وہ حلف اُٹھانے کی رسم کا بندوبست کرے۔ وہ بھی ٹال مٹول کرتا رہا۔ ادھر یہ قانونی رکاوٹ بھی تھی کہ کسی اور جج کو اس کام کے لیے نامزد کرنے کے لیے صدارتی حکم میں ترمیم ضروری تھی جس کے لیے نئے کاغذات راولپنڈی سے آنے تھے۔ ٹکا خاں حلف اٹھائے بغیر جو فرائض انجام دے سکتے تھے، دینے لگے۔

اس اثنا میں عوامی لیگ نے اپنی "حکومت" چلانے کے لیے مختلف ہدایات جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ ہدایات جن کی کُل تعداد ۳۱ تھی، اخبار میں چھپوا دی جاتیں اور تمام افراد کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا۔ ان ہدایات کی زد میں تقریباً سبھی شعبے مثلاً سرکاری محکمے، صنعتی ادارے، بنک اور تعلیمی درسگاہیں، ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن آتے تھے۔ لوگ عوامی لیگ سے دلی ہمدردی یا اُس کے دہشت پسندوں کے ڈر سے ان ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو، صوبے پر مجیب کی گرفت مضبوط تھی۔ صرف سات چھاؤنیاں سات جزیروں کی طرح اُس کے تسلّط سے باہر تھیں جہاں فوجی افسر اور جوان نہایت صبر آزما دن بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس صورتِ حال کو فوراً بدلنے کے لیے بے قرار تھے مگر ابھی تک فوجی ڈسپلن سے مجبور ہر چیز سہے جا رہے تھے۔

مجیب نے اشتعال انگیزی کا ہر حربہ آزمایا۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ مقامی ٹھیکیداروں کو راشن سپلائی کرنے سے روک دیا اور جہاں ان کا سامنا ہوتا، اُنہیں گالیاں دی جاتیں۔ مگر آفرین ہے ڈسپلن کے ان مجسّموں پر کہ انھوں نے خشک راشن کی دال اور عوامی لیگ کی تر بتر گالیاں کھا کر گزارہ کر لیا، مگر فوجی ڈسپلن کے خلاف کوئی حرکت نہ کی۔

ان فوجیوں میں سے بعض اب بھی شہروں میں متعیّن تھے جہاں وہ بینک، ریڈیو اسٹیشن، بجلی گھر، ٹیلیفون ایکسچینج اور دیگر نازک مقامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مشتعل عوام اُن کے پاس آ کر پھبتیاں کستے، گالیاں دیتے اور بعض اوقات پتھراؤ کرتے۔ جب حالات بے قابو ہونے لگتے اور متعلقہ تنصیبات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا، تو فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے دستوں کو گولی چلانا پڑتی، جس سے بعض افراد ہلاک یا زخمی ہو جاتے۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

۷ مارچ کو ایک ہفتے کی جھڑپوں کا خلاصہ ایک سرکاری اعلامیے کی صورت میں جاری کیا گیا جس میں اس بات کا اقرار کیا گیا کہ گزشتہ چھ دنوں میں ۱۷۲ افراد ہلاک اور ۳۵۸ زخمی ہوئے۔ اس کی تفصیلات یہ تھیں:

"چٹاگانگ میں وائرلیس کالونی، باغ کالونی، فیروز باغ اور پہاڑتلی میں ایک تصادم کے دوران میں ۷۸ افراد ہلاک اور ۲۰۵ زخمی ہوئے۔ فوج کے ہاتھوں پانچ افراد ہلاک اور ایک زخمی ہوا جبکہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہاتھوں دو آدمی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ۳ اور ۴ مارچ کو بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے پولیس کو گولی چلانا پڑی جس میں ۳۱ افراد مارے گئے۔ رنگپور میں ایک ایسے ہی تصادم کو روکنے کے لیے سیکورٹی فورس کو سختی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں تین افراد ہلاک اور گیارہ زخمی ہوئے۔ ۴ مارچ کو کھلنا کے قریب تخریب کاری کی وجہ سے ریل گاڑی پٹڑی سے اتر گئی اور پولیس فائرنگ سے چار افراد وہیں ڈھیر ہو گئے اور ایک آدمی

کو چوٹیں آئیں۔ ۶ مارچ کو ۳۴۱ افراد نے جو ڈھاکہ سنٹرل جیل میں بند تھے جیل کے دروازے توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ پولیس نے ان کی کوشش ناکام بنانے کے لیے فائرنگ کی، سات آدمی ہلاک اور تیس زخمی ہوئے۔ ۳ اور ۴ مارچ کو مشتعل ہجوم نے جیسور، کھلنا اور راجشاہی کے ٹیلیفون ایکسچینج پر ہلّہ بول دیا۔ فوجی جوانوں کو جو ان نازک تنصیبات کی حفاظت پر مامور تھے مجبوراً گولی چلانا پڑی جس کے نتیجے میں ۸ آدمی ہلاک اور ۱۹ زخمی ہوئے۔ ۵ مارچ کو کھلنا جاتے ہوئے فوجیوں پر ایک ہجوم نے حملہ کر دیا۔ فوجیوں کو اپنی مدافعت میں گولی چلانی پڑی تین افراد ہلاک اور چند زخمی ہوئے۔

"اپنے فرائض کی ادائیگی میں قانون نافذ کرنے والے افراد کو بھی قربانی دینا پڑی ایک افسر ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ ۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی شب کو ڈھاکہ میں ٹھٹھری بازار اور نواب پور کے علاقے میں ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہاتھوں ۲ افراد ہلاک اور ۵ زخمی ہوئے۔ ای پی آر کے ایک سپاہی کو اپنی مدافعت میں گولی چلانا پڑی جس کی وجہ سے چار افراد ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔

"یوں صوبے بھر میں فوج کے ہاتھوں کُل ۲۳ افراد ہلاک اور ۲۶ زخمی ہوئے۔ ان میں سے چھ افراد اُس وقت مارے گئے جب ایک ہجوم نے صدر گھاٹ (ڈھاکہ) ۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی رات کو فوجیوں کی ایک ٹولی پر حملہ کر دیا۔ اگلی صبح ڈھاکہ ہی میں ایک بپھرے ہوئے ہجوم نے مقامی ٹیلی وژن اسٹیشن پر ہلّہ بول دیا۔ وہاں متعین فوجی دستے نے گولی چلائی اور ایک شخص ہلاک ہو گیا۔"[1]

یہ تھے ایک ہفتے کے سرکاری اعداد و شمار۔ بنگالیوں نے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ حقائق کو کئی گنا گھٹا کر بیان کیا گیا ہے۔ انہیں سرکاری اعلانیے کے بجائے اُن خبروں پر زیادہ اعتماد تھا جو عوامی لیگ کے ذرائع سے مقامی اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ یہ اخبار ان واقعات کو خوب اُچھال رہے تھے اور اشتعال انگیز سُرخیاں جماتے تھے، مثلاً "آج ہزاروں افراد کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا"۔۔۔ "سینکڑوں افراد موقع پر ہی ڈھیر ہو گئے"۔۔۔ "گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں بڑی تعداد عورتوں اور بچّوں کی ہے" وغیرہ۔

اگر سرکاری ہینڈ آؤٹ میں بنگالیوں پر "تشدّد" کی تفصیلات کو گھٹا کر بیان کیا گیا تو مقامی اخبارات نے انہیں کئی گنا بڑھا کر کسر پوری کر دی لیکن جو قیامت غیر بنگالیوں (بہاریوں) پر ٹوٹی، اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلانیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں۔ اُن کا خون اُن کی آہوں کی طرح بے اثر گیا۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نے حکامِ بالا سے کہا کہ عوامی لیگ کے "دورِ حکومت" میں ہونے والے ان مظالم کی تفصیلات چھپنی چاہییں مگر وہ نہ مانے۔ اُن کا اصرار یہ تھا کہ یہ دلخراش واقعات پردۂ راز میں ہی رہنے چاہییں، ورنہ دو نقصان ہوں گے: اوّل یہ کہ ایسی خبروں سے (مسلمانوں نے مسلمانوں کا گلا کاٹنا شروع کر دیا) دو قومی نظریے کی نفی ہو گی۔ دوئم اس سے مغربی پاکستان میں انتقام کی فضا پیدا ہو گی جہاں ہزاروں بنگالی پُر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

ان دلائل کے باوجود میرے جیسے بعض افراد کا خیال تھا کہ غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کی تشہیر ضرور ہونی چاہیے، ورنہ یہ تاثر لیا جائے گا کہ بنگالی معصوم ہیں اور وہ فوج کے ہاتھوں ستم سہہ رہے ہیں، حالانکہ ستم سہنے والوں میں غیر بنگالیوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہے اور ان پر ظلم ڈھانے والے خود بنگالی ہیں۔ یہ دلیل ایک تجویز کی شکل میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے دفتر (راولپنڈی) میں بھیجی

[1] پاکستان آبزرور ڈھاکہ، مورخہ ۸ مارچ ۱۹۷۱ء

گئی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔

اسی عرصے میں مجیب الرّحمٰن نے ایک اور محاذ پر اپنی تیّاریاں مکمّل کرلیں۔ یہ تھا براہ راست فوج سے ٹکّر لینے کا محاذ۔ اس سلسلے میں انھوں نے کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔اے۔جی عثمانی کو (جن کی مونچھوں کا ذکر پہلے آچکا ہے) یہ ذمّہ داری سونپی کہ وہ مدافعت کے لیے ایک فورس تیار کریں۔ مجیب کی اس پرائیویٹ فوج کے افراد سابق فوجیوں، عوامی لیگ کے رضاکاروں اور یونیورسٹی کے طالبعلموں سے لیے گئے۔ اسلحے کی ضروریات اسلحہ خانوں کو لُوٹ کر پوری کی گئیں۔ صوبائی حکومت کے تحت "انصار" فورس کی ہزاروں رائفلیں جو سول انتظامیہ کے پاس ہوتی تھیں، اِن افراد میں بانٹ دی گئیں۔ کچھ اسلحہ بیرونِ ملک بھارت سے بھی آیا۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے لڑکوں اور لڑکیوں نے سائنس لیبارٹری میں نصابی تجربات کرنے کے بجائے دیسی بم بنانے شروع کردیے۔ یہ بم بنانے کے لیے زیادہ معلومات یا ساز و سامان درکار نہ تھا۔ ہر وہ چیز جو دھماکے سے پھٹ سکے اور قریب کھڑے افراد کو نقصان پہنچاسکے، کافی تھی ——

اس پرائیویٹ آرمی نے کرنل عثمانی کے زیرِ نگرانی بھرپور تربیت کا آغاز کیا اور لڑکوں نے مورچہ بندی اور سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنے کی مشق شروع کردی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ایک عمر رسیدہ بنگالی سیاستدان نے مجیب سے کہا: "آپ کیا بچّوں جیسی باتیں کرتے ہیں، کیا اِن تیّاریوں سے آپ پاکستان کی پیشہ ور فوج کا مقابلہ کرسکیں گے؟" مجیب نے جواب دیا: "کونسی پیشہ ور فوج؟ وہ فوج جو ڈھاکہ میں کرفیو نافذ نہ کرسکی، ساڑھے سات کروڑ عوام کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے —— خواہ ہتھیار کچھ بھی ہوں۔"

مجیب کے کہنے پر کرنل عثمانی نے ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس سے بھی رابطہ قائم کیا تاکہ وقتِ ضرورت اُن سے بھی مدد لی جاسکے۔ اِن تینوں شعبوں میں ملازمت کرنے والے بنگالی پہلے ہی تربیت یافتہ اور ہتھیار بند تھے اور اندر ہی اندر اُن کی ہمدردیاں بھی عوامی لیگ کے ساتھ تھیں، لیکن اُوپر سے ڈسپلن کا خول یا بھرم قائم تھا۔ ان میں سے کئی در پردہ عوامی لیگ کی فوجی کمیٹی کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔[1]

شیخ مجیب الرّحمٰن اور اُن کے مقرر کردہ کمانڈر انچیف کرنل ایم۔اے۔جی عثمانی کی اسٹریٹیجی یہ تھی کہ اندر ہی اندر فوجی محاذ پر لڑنے کی تیّاریاں مکمّل کرلی جائیں اور اوپر سیاسی محاذ گرم رکھّا جائے، کیونکہ سیاسی محاذ کی تپش ہی سے اندرونی محاذ کو حرارت مل سکتی تھی اور اگر سیاسی عمل سے نصب العین حاصل ہوجائے، تو ٹکّر لینے کی کیا ضرورت ہے، البتّہ تیّاری دونوں محاذوں پر مکمّل ہونی چاہیے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ انٹیلی جنس والوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اِن تمام تیّاریوں کے متعلق حکّام بالا کو باخبر رکھّا، پتہ نہیں اُن کی رپورٹیں کس مرحلے پر بے اثر ہوکر رہ جاتی تھیں۔ مَیں نے خود ایک سینیئر افسر سے فوج میں عوامی لیگ کے اثر و رسوخ اور متوقّع محاذ کا ذکر کیا۔ اُس نے مجھے یہ کہہ کر جھڑک دیا: "بکواس بند کرو، تم دُنیا کی بہترین فوج کے ڈسپلن پر بُہتان لگاتے ہو ——"

مجیب الرّحمٰن کی حکومت کے پہلے پندرہ روز کی فضا یہ تھی جس میں ہمیں بالآخر یحییٰ خاں کی آمد کا مژدہ پہنچا۔

[1] بعد میں تفتیش کے دوران جن فوجی افسروں نے اس فوجی سازش میں ملوّث رہنے کا اعتراف کیا، اُن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: بریگیڈیئر مجمدار، کمانڈنٹ ایسٹ بنگال سنٹر، لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسن کمانڈنگ آفیسر ۲ ایسٹ بنگال رجمنٹ، لیفٹیننٹ کرنل یلین گورتر کی معاینہ ٹیم کے رکن۔ ان کے علاوہ میجر شریف، میجر جلیل، میجر معین اور میجر ضیاء الرّحمٰن بھی شامل تھے لیکن یہ گرفتار نہ ہوسکے، اس لیے تفتیش کے دوران اِن کے اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

باب ۸

بھٹّو، مجیب اور یحییٰ

یُوں تو مَیں نے کئی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کا بارہا مشاہدہ کیا ہے، مگر ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں صدر یحییٰ خاں کی آمد کا منظر کبھی نہیں بھُولوں گا۔ عجیب فضا تھی۔ ماہ و سال کے لحاظ سے موسمِ بہار کے شباب کا وقت تھا، مگر سیاسی کشمکش نے اسے پُرآشوب دَور میں بدل دیا تھا ——— رُوپہلی سہ پہر کو کُھلی ہواؤں میں بھی دَم گھُٹتا تھا۔

ڈھاکہ ایئرپورٹ کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے، صرف پی۔ اے۔ ایف بیس والا گیٹ کُھلا تھا جس کے باہر ۱۸ پنجاب کی ایک کمپنی ہتھیاروں سے لیس ٹرکوں میں سوار کھڑی تھی، ہر ٹرک کی چوٹی پر مشین گن نصب تھی جس کا دستہ ایک چاق چوبند مشین گنر کے قبضے میں تھا، یُوں معلوم ہوتا تھا اشارہ پاتے ہی وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔ گیٹ سے اندر جانے پر سخت پابندی تھی، صرف مُٹھی بھر افراد کو داخلے کے خصوصی پاس جاری کیے گئے تھے۔ اِن میں سے ہر کسی کو گیٹ پر روک کر پوری چھان بین کی جاتی کہ پاس کا کہیں غلط استعمال تو نہیں ہو رہا۔ مَیں بڑی مشکلوں سے اندر داخل ہُوا۔

ہوائی اڈّے کی عمارت پر بھی فوج متعیّن تھی۔ ہتھیار بند، آہنی خود پہنے ہمہ تن مستعد۔ ہوائی جہازوں کی آمد و رفت بھی روک دی گئی تھی۔ صرف صدر کے جہاز کا انتظار تھا جو کسی لمحے پہنچنے والا تھا۔

استقبال کرنے والوں میں لیفٹیننٹ جنرل ٹِکّا خاں، میجر جنرل خادم راجہ، میجر جنرل فرمان، میجر جنرل ابوبکر عثمان مٹّھا (کوارٹر ماسٹر جنرل جی ایچ کیو) اور پانچ چھ اور افسر تھے۔ سرکردہ شہریوں کی لمبی قطار تھی نہ سرکاری (سویلین) افسروں کی بیتاب نگاہیں، پھُولوں کے گلدستے تھے نہ اُودے اُودے لباسوں والے بچّے۔ اخبار نویس تھے نہ فوٹوگرافر، حتّٰی کہ سرکاری فوٹوگرافر بھی غائب تھا۔

جنرل ٹِکّا خاں اور اُن کے ساتھی پی آئی اے کے ہینگر (HANGAR) کے پاس چھوٹے سے کنٹرول آفس کے باہر کھڑے تھے۔ ان سے تقریباً سو میٹر دُور ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر (الوہٹ III) اُڑنے اور اُترنے کی مشق کر رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی موجودگی کی وجہ پُوچھی تو بتایا گیا کہ ہوائی اڈّے سے شہر کو جانے والی سڑک پر عوامی لیگ کی چیک پوسٹ ہے، ممکن ہے صدر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایوانِ صدر پہنچانا پڑے۔

مَیں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، یحییٰ خان کی آمد میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ مَیں نے مغرب کی جانب اُن کا بوئنگ طیّارہ تلاش کیا، جو کہیں نظر نہ آیا، البتہ اچانک سیاہ رنگ کا ایک گِدھ اُڑتا ہُوا آیا اور ہمارے سروں کے اُوپر سے پرواز کرتا گزر گیا۔ اتنے میں ڈھاکہ کا بنگالی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہانپتا ہُوا آیا اور فوجی افسروں کو خوشخبری سُنانے لگا کہ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اِس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ فارم گیٹ والی چوکی فوراً اُٹھالی جائے تاکہ "مہمان کو کوئی پریشانی نہ ہو"۔ اِس سے پیشتر مجیب الرحمٰن کُھلے عام یہ کہہ چکے

تھے کہ "صدر یحییٰ خاں بنگلہ دیش کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لا سکتے ہیں"۔

ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کا طیارہ اُترا۔ پی آئی اے کے عملہ کی عدم موجودگی میں پی۔اے۔ایف کے اسکواڈرن لیڈر قاضی نے سیڑھی لگائی۔ صدر اُترے۔ اُن کا شگفتہ چہرہ صحت و توانائی کی تابانیاں بکھیر رہا تھا، بڑے پُر اعتماد اور خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ جہاز کے عملے کے متعلق جو انہیں سری لنکا کے راستے ساڑھے پانچ گھنٹے میں ڈھاکہ لایا تھا، انہوں نے کہا: "یہ بڑے بہادر بچے ہیں، شاباش!" (ان میں کوئی بچی نہ تھی)۔ اس کے بعد انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا ـــــ میرے ساتھ بھی۔ اُن کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے ذہن یا ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں۔ وہ تفکرات سے آزاد یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی فوجی یونٹ کے معائنے پر آئے ہوں۔ معلوم ہوتا تھا انہیں حالات کی اس سنگینی کا علم نہ تھا جو ہماری نیندیں حرام کیے ہوئے تھی۔

مصافحہ ختم ہوا، تو صدر کے شایانِ شان کار سامنے آگئی۔ اس پر جرنیلی کی علامت چار ستاروں والی پلیٹ اور پاکستانی جھنڈا لگا تھا۔ جنرل ٹکا خاں نے کہا:

"سر، کیا آپ کار میں تشریف لے جائیں گے؟"

"کیا آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟"

"جی نہیں، میرا مطلب تھا کہ . . . کہ ہیلی کاپٹر بھی تیار ہے۔"

"نہیں، نہیں، میں کار میں جاؤں گا۔"

"اچھا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"پھر آپ کو چھوڑنے کون آئے گا؟"

کاروں کا کارواں روانہ ہوا۔ پی۔اے۔ایف گیٹ سے باہر ۳۱ پنجاب کی کمپنی نے حفاظتی فرائض سنبھالے اور میں چھاؤنی میں آپریشن روم میں چلا گیا جہاں صدر کے نازک سفر کی لمحہ بہ لمحہ خبریں آرہی تھیں: "اب وہ بحفاظت فارم گیٹ سے گزر گئے ہیں"۔ . . . "اب وہ وی آئی پی اسٹور کے پاس ہیں"۔ . . . "اب کار ایوانِ صدر کی طرف مُڑ رہی ہے"۔ . . . "اب مہمان بخیر و خوبی اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں"۔ آخری پیغام سُن کر سب کے دَم میں دَم آیا۔

اسی شام جنرل یحییٰ خاں نے اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک اجلاس ایوانِ صدر میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں جنرل ٹکا خاں، میجر جنرل خادم راجہ، میجر جنرل فرمان اور ائیر کموڈور مسعود نے شرکت کی۔ یہ اجلاس کم اور بریفنگ زیادہ تھی۔ اس کا مقصد تازہ صورتِ حال سے صدر کو آگاہ کرنا تھا۔ یہ بریفنگ فوجی ضابطے کے مطابق شروع ہوئی۔ اس میں مشن، وسائل اور وسائل کی تقسیم وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور امنِ عامّہ کی حد تک موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ پیش کیا۔ اس بریفنگ کا اختتام روایتی انداز میں رجائیت پر ہوا۔

امن و اماں کی صُورتِ حال کے پیچھے کارفرما عوامل کی نشاندہی نہ کی گئی اور نہ کوئی ایسی سفارشات پیش کی گئیں جو بہتر مستقبل کی ضمانت دے سکتیں۔ میں نے بعد میں ایک سینئر فوجی افسر سے اس کوتاہی کی وجہ پُوچھی، تو انہوں نے فرمایا: "صدر نے کبھی ہمارے تجزیہ پر اعتماد نہیں کیا۔ اُن کے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری مشیر ہیں، اُن کے ہوتے ہُوئے ہمیں ایسے تردّد کی ضرورت نہ تھی"۔

اجلاس کے آخر میں صدر نے فرمایا: "آپ لوگ پریشان نہ ہوں، میں کل مجیب کو بُلاؤں گا اور اُسے کھری کھری سُناؤں گا۔ ایسی سرزنش کروں گا کہ دوپہر کے کھانے کا بھی نہیں پُوچھوں گا۔ اس کے بعد پرسوں اُس سے باقاعدہ ملاقات کروں گا اور دیکھوں گا کہ

اس کی کیفیت ٹھیک ہوئی ہے کہ نہیں۔ اگر پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آیا، تو میں جانتا ہوں کہ اس کا علاج کیا ہے۔" صدر کے منہ سے یہ تند و تیز کلمات سُن کر حاضرین پر خاموشی چھا گئی۔ "میں جانتا ہوں اس کا علاج کیا ہے" بار بار ذہنوں میں بجنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک حیثیت اور چھریرے بدن والا افسر سیخ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مؤدب مگر سنجیدہ لہجے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے سَر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی، تو اُس نے کہا: "جناب والا! حالات بڑے ہی نازک ہیں۔ یہ بنیادی طور پر سیاسی مسئلہ ہے، اِسے سیاسی طور پر ہی حل کرنا چاہیے، ورنہ ہزاروں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے خواہ مخواہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔" جنرل یحییٰ خاں نے یہ جملے ہمہ تن گوش اور دُوسروں نے ہمہ تن تشویش بن کر سُنے۔ سامعین میں سے کئی دل تیز تیز دھڑکے۔ صدر یحییٰ خاں نے اپنی بھاری پلکیں جھپکتے ہوئے جواب دیا: "یس! مٹّی یس! مجھے علم ہے۔ ۔ ۔ میں جانتا ہوں۔ ۔ ۔ بیٹھ جاؤ۔" مٹّی بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ بعد مٹّی کو اس جرأتِ رندانہ کی پاداش میں فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اجلاس ختم ہو گیا۔ ڈھاکہ میں صدر یحییٰ کا یہ آخری فوجی اجلاس تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے سیاسی کاموں میں لگ گئے۔

اگلے روز یحییٰ خاں نے ایوانِ صدر میں مجیب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران کوئی اور موجود نہ تھا۔ باہر سے دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ یہ سابقہ اعتماد کی بکھری ہوئی دھجیوں کو جوڑنے کی ایک کوشش ہے۔ یحییٰ خاں نے اس ملاقات کے دوران محسوس کیا کہ مجیب اب انتخابات سے پہلے والا مجیب نہیں ہے۔ اب یہ جناب کی ہاں میں ہاں ملا کر دلجوئی حاصل کرنے کے بجائے احتیاط اور سرد مہری سے کام لے رہا ہے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا وہ دل کی بات کھُل کر زبان پر نہیں لا رہا۔ صدر کو یہ نیا مجیب الرحمٰن دریافت کر کے ضرور تعجب ہُوا ہو گا۔ یہ امر حیران کُن ہے کہ لیڈروں کی تیز حسیات کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ لان میں اُگتے ہُوئے گھاس کی آواز بھی سُن سکتے ہیں مگر یحییٰ خاں کو گھاس میں چُھپا ہُوا یہ سانپ پورا ایک سال نظر نہ آیا۔

درحقیقت ماہ مارچ کے پہلے پندرھواڑے میں حالات نے جو رُخ اختیار کیا تھا اور یحییٰ خاں نے اُنہیں جس طرح خراب سے خراب تر ہونے کا موقع دیا تھا، اس کے بعد گفت و شنید اور صلاح مشورے کے امکانات خاصے کم ہو چکے تھے۔ اب جناب مجیب یہ سمجھنے لگے تھے کہ پورے صوبے پر میرا قبضہ ہے، میں یہ اقتدار یحییٰ خاں کو کیوں لوٹاؤں اور یحییٰ خاں سوچتے تھے کہ میں پورے مُلک کا سربراہ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہوں، میں رضاکارانہ طور پر (صوبے میں) مجیب کی حاکمیت کیسے تسلیم کر لُوں ـــــــ شیخ صاحب اسی صورت میں "مغربی پاکستان سے آنے والے مہمان" کی بات مان سکتے تھے جب وہ چھ نکات پر مبنی آئین پر صاد کرنے کو تیار ہو، لیکن یحییٰ خاں ایسے آئین کی تائید کر کے اپنے بیس (BASE) کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

۱۷ مارچ کو یحییٰ خاں اور مجیب کے درمیان بات چیت کا ایک اور دَور ہُوا جس میں دونوں جانب سے ماہرین اور مشیر بھی شامل ہُوئے۔ طرفین نے اپنا اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت سے پیش کیا، مگر سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ عوامی لیگ کے ماہرین نے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں وزنی دلائل تیار کر رکھے تھے، مگر صدر اور ان کے مشیروں کو قائل نہ کر سکے۔ اجلاس تعطّل کا شکار ہو گیا۔

اجلاس کے بعد مجیب الرحمٰن اپنی سفید کار پر سیاہ جھنڈا[1] لہرائے ایوانِ صدر سے باہر نکلے، تو منتظر اخبار نویسوں نے اُنہیں

---

[1] مارچ کے ابتدا میں جو بنگالی مارے گئے اُن کا ماتم جگہ جگہ سیاہ جھنڈے لہرا کر کیا گیا۔ مجیب الرحمٰن کی کار پر یہ جھنڈا بھی اسی ماتم کی علامت تھا۔

روک لیا، میں بھی وہیں موجود تھا، مگر مجیب اتنے بے قرار اور جنونی کیفیت میں تھے کہ انہوں نے میری وردی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں اُن کے بائیں بازو کے پاس کھڑا اُن کا چہرہ پڑھتا رہا۔ اُن کا چہرہ راکھ کی طرح تھا، ہونٹ شدّتِ جذبات سے پھڑک رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔ میں مشرقی پاکستان کے سب سے بااثر لیڈر کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دندناتے شیر کی کھال میں یہ طوفان بلاوجہ نہیں آسکتا۔ ضرور ہم کسی عظیم المیئے کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔

اخبار نویسوں نے اُن سے جھٹ پٹ کئی سوال کر ڈالے، مگر وہ "ہاں، ہاں" "نہ، نہ" جیسے مختصر جواب دے کر دھان منڈی (گھر) کی طرف چل دیے۔ اخبار نویس اُن کے پیچھے اُن کے مکان کی طرف بھاگے۔ میں برگد کے درخت تلے اکیلا رہ گیا۔ ڈھلتے سورج کی وجہ سے سائے طویل ہو چکے تھے۔ ایوانِ صدر کا آہنی دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ اس کی جھریوں سے صرف سنتری کی سنگین دکھائی دے رہی تھی۔

چھاؤنی آکر پتہ چلا کہ مذاکرات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے میجر جنرل خادم راجہ، جنرل ٹکا خاں کے پاس گئے، مگر ٹکا خاں نے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "خادم! میں بھی مذاکرات کے متعلق اُتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم۔" جنرل راجہ نے کہا: "لیکن مذاکرات کی رفتار اور نتائج سے باخبر رہنا تو آپ کے فرائض میں ہے، کیا پتہ آپ کو کس وقت کونسا ایکشن لینے کو کہا جائے؟" مرے کی بات کہ یہ نکتہ ٹکا خاں کے پلّے پڑ گیا اور وہ سیدھے جنرل یحییٰ خاں کے پاس گئے۔ کہا جاتا ہے جنرل یحییٰ نے ٹکا خاں کے سوالوں کے جواب میں بتایا: "وہ حرامی گڑبڑ کر رہا ہے، آپ تیار رہیں۔" واپس آکر ٹکا خاں نے اسی رات ۱۰ بجے جنرل راجہ کو ٹیلیفون پر کہا: "خادم، آپ اپنی تیاری کر لیں۔" اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ہر طرح کی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے کاغذی تیاری اور منصوبہ بندی کرنے کو کہا گیا ہے، مگر اس منصوبے کا دار و مدار سیاسی مذاکرات پر ہوگا۔ یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہر مُلک کی فوج ہر قسم کی ممکنہ صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے جس کا مقصد اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ان منصوبوں کی موجودگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ ممالک ایسی کارروائی کرنے پر تُلے ہوتے ہیں، اس لیے بعض غیر مُلکی مصنّفین کا یہ استدلال سراسر بے بنیاد ہے کہ جب صدر یحییٰ خاں ایوانِ صدر میں سیاسی حل کے لیے کوشاں تھے، ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں نے انہیں فوجی کارروائی پر مجبور کیا۔ اگر بعض جرنیلوں کی طرف سے ان پر ایسا دباؤ تھا، تو یہ یحییٰ خاں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے جرنیلوں کی طرف سے ہوگا۔ ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں کا اندازِ فکر مختلف تھا۔

اسی طرح میں بعض غیر مُلکی صحافیوں کے ان الزامات کو بھی بعید از حقیقت سمجھتا ہوں کہ یحییٰ خاں نے ڈھاکہ میں مذاکرات کا صرف اس لیے ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ ان کے جرنیلوں کو فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی اور تیاری کے لیے وقت مل سکے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مذاکرات کے دوران تو کیا مجیب الرّحمٰن کے ۲۵ روزہ (یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک) دور میں بھی کوئی فوجی کمک ڈھاکہ نہیں بھیجی گئی اور نہ فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی میں دس دن لگے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ یہ منصوبہ کب، کہاں اور کتنے وقت میں تیار ہوا۔

۱۸ مارچ کو صبح کے دس بجے ہوں گے کہ میجر جنرل راؤ فرمان علی، جی او سی خادم راجہ کے دفتر تشریف لائے اور فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ انہوں نے اس بنیادی مفروضے پر اتفاق کیا کہ یکم مارچ سے رُونما ہونے والے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے پہلے سے جو منصوبہ "بلٹز" (BLITZ) کے نام سے تیار پڑا

 ...خاموشی میں دس دن گزر گئے ۔

پھر یکایک مغربی افق پر کچھ حرکت شروع ہوئی جیسے دس دنوں کی خاموشی اپنا اثر دکھانے لگی — اور مختلف واقعات دو دو دن کے مقررہ وقفے کے بعد رونما ہونے لگے جیسے کوئی ٹائم ٹیبل طے کر کے اس کو عملی شکل دی جاتی ہے ۔ ۱۱ فروری کو مسٹر بھٹو نے راولپنڈی میں صدرِ مملکت سے طویل ملاقات کی ۔ دو روز بعد حکومت نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہوگا ۔ دو روز بعد مسٹر بھٹو نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر پی پی پی کو نظر انداز کیا گیا "تو خیبر سے کراچی تک طوفان برپا کر دوں گا"[1]

بھٹو کے اعلان کے بعد صدر یحییٰ نے کابینہ کو برخاست کر دیا اور ملک پھر مکمل طور پر مارشل لا کی گرفت میں آ گیا ۔ دو روز بعد صدر نے فوجی گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کا اجلاس ۲۲ فروری کو طلب کر لیا ۔ مشرقی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل یعقوب اور وائس ایڈمرل احسن کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا ۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے دو روز قبل (۱۹ فروری) جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور حالاتِ حاضرہ پر بات کرنا شروع کی (یہ عنایت وہ پہلے بھی مجھ پر کرتے رہتے تھے) انہوں نے اس ملاقات میں دو باتوں کا بالخصوص ذکر کیا ۔ ایک کا تعلق بھٹو سے تھا اور دوسری کا یحییٰ خاں سے ۔ مسٹر بھٹو کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے موقف میں اتنی لچک رکھی ہے کہ اگر صدر یا مجیب ان کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ ان کے خیالات کو اہمیت دی جائے گی تو وہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر تیار ہو جائیں گے اور صدر کے پاس قانونی ڈھانچہ (ایل ایف او) کے تحت اتنے اختیارات ہیں کہ وہ اپنی بات (مجیب سے) منوا سکیں — صدر یحییٰ خاں کے بارے میں انہوں نے اپنی دور رس نگاہوں سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تعطل جاری رہا اور نتیجۃً فوجی کارروائی ناگزیر ہو گئی تو یہ تباہ کن ہوگا ۔ یحییٰ خاں علٰحدگی کے عمل میں تاخیر کرنے کے لیے یہ کارروائی کریں گے تو اس سے علٰحدگی کا عمل تیز تر ہو جائے گا ۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ہم صرف مفروضوں کی بات کر رہے ہیں ، پوچھا کہ اگر حالات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ فوجی کارروائی ناگزیر ہو جائے تو تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے ۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ایسی صورتِ حال کا سامنا ہو تو میرے خیال میں کارروائی مختصر اور تیز ہونی چاہیے سرجن کے نشتر کی طرح اور اس جراحی کے فوراً بعد زخموں کو مندمل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر سیاسی اور اقتصادی مرہم پٹی ہونی چاہیے ۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل جنرل یعقوب اور ایڈمرل احسن شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے ۔ شیخ صاحب نے حالات کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ کر انہیں یقین دلایا کہ چھ نکات میں ترمیم کی جا سکتی ہے ۔ یہ رہی ایک اور قلابازی ۔ غالباً بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنا موقف بدلنے ہی کا نام سیاست ہے ۔ بیشک اس کام میں مجیب الرحمٰن بہت طاق تھے ۔

راولپنڈی میں اعلیٰ سطحی کانفرنس ۲۲ فروری کو منعقد ہوئی ۔ اس میں کیا فیصلے ہوئے اور نئے حالات سے نپٹنے کے لیے کیا اسٹریٹیجی وضع کی گئی ابھی تک صیغۂ راز میں ہے ، البتہ اس کی جو گونج ہم تک ڈھاکہ میں پہنچی وہ یہ تھی کہ مجیب الرحمٰن کو اپنی نیک نیتی اور حب الوطنی کا ثبوت دینے کے لیے ایک اور موقع دیا جائے گا اور اگر وہ راہِ راست پر آ گیا تو مارشل لا اپنے اصل اور روایتی انداز میں (دوبارہ) نافذ کیا جائے گا ۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد دونوں محاذوں پر فوراً کارروائی کا آغاز کیا گیا ۔ سیاسی سطح پر ایڈمرل احسن نے شیخ مجیب سے ابتدائی مذاکرات شروع کیے اور چھ نکات کو مغربی پاکستان کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے ان میں ضروری ترمیم پر زور دیا ۔ مجیب الرحمٰن نے ترمیم والی بات تو مان لی البتہ

---

[1] روزنامہ ڈان کراچی ۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۷۱ء



جنرل عبدالحمید خاں

چیف آف سٹاف (آرمی)

ہے، وہ بیکار ہو چکا ہے، کیونکہ اس منصوبے کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ بنگالی عوام ہمارے ساتھ ہیں اور صرف چند سرپھروں سے نبٹنا ہے، لیکن اب ان کے خیال میں صورتِ حال یہ تھی کہ عوامی تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے ایک ایسے منصوبے کی ضرورت ہے جو مجیب الرحمٰن کی غیر قانونی حکمرانی کا فوراً قلع قمع کر کے حکومت کے مؤثر اقتدار کو مؤثر طور پر بحال کر دے۔

ابتدائی سوچ بچار کے بعد جنرل فرمان نے آسمانی رنگ کا سرکاری پیڈ لکالا جس کے بائیں جانب ڈیڑھ انچ حاشیہ چھوڑ کر لمبی لکیر لگی ہوتی ہے۔ انہوں نے سکّے کی عام پنسل لے کر لکیر کے دائیں جانب منصوبے کا مسوّدہ لکھنا شروع کیا، جس میں فوجی کارروائی کی ضرورت، اس کے بنیادی لوازمات مشن اور اس کی تکمیل کے لیے مختلف اقدامات کا ذکر کیا۔ منصوبے کا آخری حصّہ جس میں صوبے بھر میں متعیّن مختلف یونٹوں کو مختلف کام سونپے گئے تھے، جنرل خادم نے سپردِ قلم کیا۔ دونوں کی کوششوں سے یہ منصوبہ اسی ایک نشست میں تیّار ہو گیا۔

یہ منصوبہ جس کا نام "آپریشن سرچ لائٹ"[1] رکھا گیا پانچ صفحات پر پھیلے ہوئے سولہ پیراگراف پر مشتمل تھا (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ سوئم)۔ اس منصوبے میں اور باتوں کے علاوہ دو بنیادی کارروائیوں پر زور دیا گیا: ایک یہ کہ بنگالی یونٹوں کو ردِّ عمل کا موقع دیے بغیر فوراً غیر مسلّح کر دیا جائے۔ دوئم یہ کہ عوامی لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے عدم تعاون کی تحریک کو قیادت سے محروم کر دیا جائے۔ منصوبے میں ضمیمے کے طور پر عوامی لیگ کے ان سولہ رہنماؤں کے نام اور پتے بھی درج تھے جنہیں فوری طور پر گرفتار کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

۲۰ مارچ کی سہ پہر کو ہاتھ کا لکھا ہوا یہ مسوّدہ فلیگ اسٹاف ہاؤس میں جنرل عبدالحمید خاں اور جنرل ٹکّا خاں کو پڑھ کر سنایا گیا —— دونوں نے اسے پذیرائی بخشی، البتّہ جنرل حمید نے بنگالی یونٹوں کو غیر مسلّح کرنے والی شق یہ کہہ کر کٹوا دی کہ "اس طرح دنیا کی بہترین فوج تباہ ہو جائے گی"۔ مگر انہوں نے نیم فوجی تنظیموں مثلاً پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز کو غیر مسلّح کرنے کی منظوری دے دی۔ آخر میں انہوں نے پوچھا: "تمام یونٹوں کو اتنے سارے کام سونپنے کے بعد کتنی نفری (ریزرو) بچتی ہے؟" جنرل راجہ نے جھٹ جواب دیا: "کچھ بھی نہیں"۔

بعد ازاں یہ منصوبہ جنرل یحییٰ کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے اسے ایک اور بنیادی خصوصیّت سے محروم کر دیا۔ انہوں نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا کہ مذاکرات کے بہانے عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت کو ایک جگہ جمع کر کے گرفتار کر لیا جائے، کیونکہ بقول اُن کے "میں مذاکرات میں لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر قاتلِ جمہوریت کے طور پر تاریخ میں اپنا نام درج کروانا نہیں چاہتا۔"

اِن ترامیم کے بعد منصوبے میں جو کچھ بچا، اسے آخری شکل دے دی گئی۔ اس پر عمل درآمد کا انحصار مذاکرات کے نتائج پر تھا۔

اُدھر جب مجیب الرحمٰن مذاکرات میں مصروف تھے، تو ان کا غیر سرکاری کمانڈر انچیف کرنل (ریٹائرڈ) ایم اے جی عثمانی اپنی فوجی کارروائی کو قطعی شکل دے رہا تھا۔ اس نے مجیب کی "پرائیویٹ آرمی" کو تازہ ہدایات دینے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں متعیّن

---

[1] OPERATION SEARCHLIGHT

بنگالی یونٹوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور انہیں مقرّرہ اشارے پر کارروائی کرنے کو کہا۔ ہندوستانی میجر جنرل (ریٹائرڈ) ڈی۔ کے۔ پلیٹ[1]، کرنل عثمانی کے منصوبے کے حسب ذیل مقاصد بتاتے ہیں:

(ا) ڈھاکہ کے ہوائی اڈّے اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے مشرقی پاکستان میں داخلے کی تمام راہیں مسدود کر دی جائیں۔

(ب) ڈھاکہ یونیورسٹی کو مرکز بنا کر ایسٹ پاکستان رائفلز، پولیس اور طلبہ کی مدد سے ڈھاکہ شہر کو کنٹرول کیا جائے۔

(ج) مختلف چھاؤنیوں میں مقیم بنگالی یونٹیں بغاوت کر کے متعلقہ چھاؤنیوں پر قبضہ کر لیں۔

اس طرح فریقین نے اپنے طور پر بدترین حالات کے لیے تیّاری مکمّل کر لی؛ تاہم یہ معلوم نہ تھا کہ پہل کدھر سے ہوگی۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا دونوں دھڑوں کی یہ کوشش ہے کہ پہلے سیاسی بات چیت کو آزمایا جائے، اگر خاطر خواہ نتائج نہ نکلیں، تو پھر فوجی کارروائی کی جائے۔

۱۸ مارچ کو سرکاری ذرائع سے مذاکرات میں کچھ پیش رفت کی اطلاع ملی۔ اس کی بالواسطہ تصدیق مجیب الرحمٰن کے اُس بیان سے بھی ہُوئی جو انہوں نے ایک صحافی کے سوال پر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "کوئی پیش رفت نہ ہوتی تو میں مذاکرات جاری کیوں رکھتا۔"[2] یہ اطمینان بخش خبر جنرل ٹکّا خاں اور پھر جنرل خادم راجہ کو ملی۔ ہوتے ہوتے جب اس کی بھنک مجھ جیسے جونیئر افسروں تک پہنچی، تو محسوس ہُوا کہ روشنی طلوع ہونے لگی ہے۔ شاید تاریک سُرنگ میں رہنے والوں کو ہلکی سی کرن بھی روشنی کا مینار لگتی ہے۔ یہ خبر سُن کر ہم میں سے بعض افسر اتنے پُرامیّد ہو گئے کہ انہوں نے اپنے بال بچّوں کو مغربی پاکستان بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

یحیٰی خاں اور مجیب الرحمٰن کے درمیان مذاکرات آخرِ کار عوامی لیگ کی اِس تجویز پر مرتکز ہو کر رہ گئے کہ یحیٰی خاں کی سربراہی میں وقتی طور پر کوئی تبدیلی کیے بغیر مارشل لا فوراً اُٹھا لیا جائے اور اقتدار پانچ صوبوں میں عوامی نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ آئین سازی کے متعلّق عوامی لیگ کی تجویز یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکانِ اسمبلی پر مشتمل دو الگ الگ کمیٹیاں قائم کر دی جائیں جو اسلام آباد اور ڈھاکہ میں اپنے اجلاس منعقد کریں اور ایک معیّنہ مُدّت میں اپنی الگ الگ رپورٹ تیّار کریں۔ بعد میں قومی اسمبلی کا اجلاس بُلا کر اِن دونوں رپورٹوں کو مدغم کر کے ایک قابلِ قبول آئین ترتیب دیا جائے۔ درمیانی مُدّت کے لیے چھ نکات کی روشنی میں ۱۹۶۲ء کے آئین میں صوبائی خود مختاری کی ضمانت دے کر اسے نافذ کیا جائے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی خود مختاری کا تعلّق ہے انہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنی حدود و قیود متعیّن کرنے کا اختیار دیا جائے ـــــ انتقالِ اقتدار کی اس تجویز کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعے نافذ کیا جائے۔

صدر یحیٰی خاں کو اس تجویز میں ایک خوبی نظر آئی کہ اِس سے اُن کی کرسی پر (کم از کم وقتی طور پر) کوئی زد نہیں پڑتی تھی یعنی وہ اور اُن کے منتخب کردہ مشیر بھی برسرِ اقتدار رہیں گے۔ مذاکرات میں جس اُمیّد یا 'روشنی' کا اوپر ذکر آیا ہے، غالباً اس کا پس منظر بھی یہی تجویز اور اس پر یحیٰی خاں کا خوشگوار ردِّ عمل تھا، لیکن اس تجویز کا سنگین پہلو یہ تھا کہ مارشل لا اٹھانے کے بعد یحیٰی خاں کی حکومت کے لیے کوئی قانونی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اِس نکتے کو یا تو یحیٰی خاں سمجھے نہیں یا اس سے جان بُوجھ کر پہلو تہی کر گئے۔ انہوں

---

[1] یہ اقتباس اُن کی کتاب THE LIGHTINING CAMPAIGN سے لیا گیا ہے جو بھارتی سرکار کی اعانت سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے فوراً بعد شائع ہوئی۔

[2] روزنامہ پاکستان آبزرور ڈھاکہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء

لے مجیب الرحمٰن کو یقین دلایا کہ اگر بھٹو کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ ہُوا تو اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو اُن دنوں کراچی میں بیٹھے ڈھاکہ مذاکرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اس سے قبل یحییٰ خاں کو اس مضمون کا ایک تار ارسال کیا تھا کہ "اگر پی پی پی سے بالا بالا کوئی فیصلہ کیا گیا، تو اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔"[1] یحییٰ خاں اور مجیب کے درمیان مذاکرات کی روشنی میں بھٹو کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ ڈھاکہ تشریف لائیں۔ انہوں نے جواب بھجوایا کہ "میں پہلے ہی اپنا نقطۂ نظر صدر پر واضح کر چکا ہوں۔" یحییٰ خاں کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ ادھر جناب مجیب، بھٹو کو منہ لگانے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ اُن کے خیال میں بنگالیوں کے قتل و خون کا ذمہ دار بھٹو تھا اور ادھر بھٹو نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ وہ صرف اسی صورت میں ڈھاکہ آئے گا کہ مجیب الرحمٰن اُس کے ساتھ مذاکرات کے لیے آمادہ ہو۔

جب ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعے بھٹو کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا، تو میں حسبِ عادت ڈھاکہ پریس کلب گیا جہاں ایک کہنہ مشق صحافی مسٹر حسین سے ملاقات ہوئی۔ اسے مجیب کا قرب حاصل تھا۔ اس نے کہا: "جہاں تک ہمارا تعلق ہے، بھٹو کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک بار ہم یحییٰ خاں کو قائل کر لیں تو بھٹو کو منانا اُن کا کام ہوگا، اور اگر بھٹو اُن کی بات نہیں مانتا، تو پھر یحییٰ خاں جانیں اور بھٹو۔" وہ بیچارا اس بات سے بے خبر تھا کہ یحییٰ خاں، بھٹو کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

پریس کلب سے واپسی پر میں روزنامہ "دی پیپل" کے دفتر میں رُکا۔ صحافتی معیار سے گرا ہُوا یہ اخبار فوج کے خلاف زہر اُگلنے میں سب سے آگے تھا۔ وہاں میری ملاقات عوامی لیگ کے تین بیرسٹروں سے ہوئی، جنہوں نے موجودہ سیاسی بحران میں فوج کی نیت کے بارے میں مجھ پر جرح شروع کر دی۔ اگر میرا حافظہ جواب نہیں دے رہا، تو ان میں سے ایک کا نام شہاب الدین تھا۔ اُس نے کہا: "کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ فوج جو اپنے خون سے ملک کا دفاع کرتی ہے، اس پر حکمرانی کا بھی حق رکھتی ہے؟" میں نے عرض کیا: "ہرگز نہیں، ہم تو خلوصِ دل سے سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام سرحدوں کا دفاع کرنا ہے۔" "اگر یہ درست ہے تو عوام کے نمائندوں کو اقتدار کیوں منتقل نہیں کرتے اور عوامی لیگ کا مسودۂ آئین کیوں مان نہیں لیتے؟" "اسے منظور یا نامنظور کرنا تو صدر کا یا پھر سیاستدانوں کا کام ہے۔ اس میں فوج کے عام افسروں اور سپاہیوں کا کوئی دخل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

دوسرا بیرسٹر جو سفید قمیص اور سیاہ فریم والا چشمہ پہنے ہوئے تھا، بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا: "میری تجویز یہ ہے کہ آپ عوامی لیگ کے آئین کو آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کے اندیشے درست ثابت ہوں اور واقعی ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہونے لگے، تو آپ اسے فوراً منسوخ کر دیں۔ آپ کے پاس تب بھی توپیں اور یہ دلیل ہو گی کہ آپ قومی سلامتی کی خاطر یہ اقدام کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "میں اس بات کا قائل نہیں کہ آئین کو تسلیم کر کے اُسے بعد ازاں منسوخ کر دیا جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آئین ایک ایسی مقدس دستاویز ہے جسے منظور کرنے کے بعد ہمیشہ قائم و دائم رکھنا چاہیے۔" بیرسٹر طنزاً بولے: "واہ، میجر صاحب! فوج نے کب سے آئین کے تحفظ کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ دس سال میں دو آئین منسوخ کر کے آج آپ ہمیں اس کے تقدس کا سبق دینے لگے ہیں۔"

---

[1] روزنامہ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء

تیسرے بیرسٹر ابھی بحث میں اُلجھنے کے لیے پَر تول رہے تھے کہ مَیں نے گھڑی دیکھی اور اس معلومات افزا گفتگو سے اپنی محرومی کا گلہ کرتے ہُوئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مَیں نے اخبار کے مدیر سے اجازت چاہی اور چھاؤنی چلا گیا۔

چھاؤنی میں سیدھا گھر جانے کے بجائے مَیں نے آفیسرز میس میں جھانکا جہاں کھانے کے بعد چند افسر بیٹھے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے حسبِ معمول ٹی وی پروگرام عوامی لیگ کی عدمِ تعاون کی تحریک کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ پُرجوش لڑکے اور لڑکیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر آزادی کے نغمے الاپ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی یہ فوجی افسر "شہر کی تازہ خبر" سُننے کے لیے میری طرف متوجّہ ہُوئے مَیں نے اُنہیں بیرسٹروں والا واقعہ سنایا جس سے تڑپ کر کیپٹن چوہدری جھٹ بولے: "صدر صاحب بلاوجہ معاملے کو طُول دے رہے ہیں۔ اُن کے حُکم کی دیر ہے، فوج کی ایک کمپنی بنگالیوں کو سیدھا کر دے گی۔"

بھٹّو اور ان کے ساتھی ۱۴؍مارچ کو ڈھاکہ پہنچے۔ عوامی لیگ نے بنگلہ دیش کے مہمانوں" کے استقبال کی ذمّہ داری اُٹھائی اور حفاظتی اقدامات سمیت تمام انتظامات اپنے ذمّے لے لیے۔ البتّہ فوج کو احساس تھا کہ آڑے وقت عوامی لیگ کا بندوبست قابلِ اعتماد ثابت نہ ہوگا اور بالآخر اُنہی کو یہ ذمّہ داری سنبھالنا پڑے گی۔ چنانچہ فوج نے بھی مغربی پاکستان سے آنے والے وفد کے لیے متبادل انتظامات کر لیے۔ حسبِ توقّع جلد ہی عوامی لیگ کا بندوبست ناکام ہو گیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی اور بھٹّو اور اُن کے ساتھیوں کی حفاظت کے لیے فوج کو آگے بڑھنا پڑا۔

بھُٹّو سب سے پہلے صدر یحییٰ خاں سے ملے جنہوں نے مجیب الرّحمٰن سے اپنے مذاکرات کے بارے میں پی پی پی چیئرمین کو مطّلع کیا۔ بھٹّو کا ردِّ عمل اُن کی کتاب (GREAT TRAGEDY) میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: (صفحہ ۴۱)

"مَیں نے دو کمیٹیوں کی تجویز کے بارے میں اپنے رفقاء کو مطّلع کیا اور انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہُوئے مشورہ دیا کہ مَیں اس تجویز کو نہ مانوں، کیونکہ اس میں پاکستان کو دو لخت کرنے کے جراثیم موجود ہیں۔"

مسٹر بھٹّو نے اپنی صفائی میں جو دلیل دی ہے اس کی تصدیق کہیں سے نہیں ہو سکی، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یحییٰ خاں، مجیب الرّحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹّو کے درمیان مذاکرات صرف بھٹّو کی "حُبّ الوطنی" کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ مستقبل کے مورّخ کو تاریخ کے اِس اہم موڑ کے لیے مزید شہادتیں اکٹھی کرنا ہوں گی۔

تعطّل کے انہی دنوں میں ۲۳؍مارچ کا سُورج طلوع ہُوا۔ یومِ پاکستان عموماً قراردادِ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور استقلالِ پاکستان کے پس منظر میں منایا جاتا ہے، مگر اُس روز ڈھاکہ میں کچھ اور ہی منظر تھا۔ عوامی لیگ نے اسے "یومِ مزاحمت" کے طور پر منایا۔ عوامی لیگ کے چند کارکنوں نے قومی پرچم جَلا ڈالا، قائدِ اعظمؒ کی تصویر پھاڑ ڈالی اور اُن کا پُتلا بنا کر نذرِ آتش کر دیا۔ پاکستان کی یہ نمایندہ علامتیں ختم کرنے کے بعد انہوں نے آزاد بنگلہ دیش کا پرچم ہر جگہ لہرایا اور مجیب الرّحمٰن کی تصاویر جگہ جگہ آویزاں کر دیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے ٹیگور کا مشہور نغمہ "سنار بنگلہ" قومی ترانے کے طور پر نشر کیا۔

اِس حرکت کو محض چند انتہا پسند طلبہ کی شرارت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کارروائی میں مجیب الرّحمٰن شامل تھے۔ انہوں نے اسی صبح کو طلبہ کے ایک وفد سے اپنے گھر پر ملاقات کی (جسے عموماً غیر سرکاری ایوانِ صدر کہا جاتا تھا)۔ اُن کی مرضی سے اُن کے گھر پر آزاد بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔ مجیب الرّحمٰن نے اسے سلامی دی۔

۲۳؍مارچ کو سارے شہر پر سبز اور قرمزی رنگ کے بنگلہ دیشی پرچم لہرا رہے تھے۔ پاکستان کا جھنڈا صرف دو مقامات



شیخ مجیب الرحمٰن
صدر، عوامی لیگ



ذوالفقار علی بھٹو
چیئرمین، پاکستان پیپلز پارٹی

پر لہرا رہا تھا: ایک گورنمنٹ ہاؤس پر اور دوسرا مارشل لا ہیڈ کوارٹر کی عمارت پر، بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے مغربی دروازے پر بھی کسی نے بنگلہ دیش کا ننھا سا جھنڈا لگا دیا تھا، تاہم اصل عمارت پر اب بھی پرچم ستارہ و ہلال پھڑپھڑا رہا تھا ——— مگر تنہا تنہا ———

بنگالی نوجوان شہر کی سڑکوں پر "جے بنگلہ" کے نعرے لگاتے خوب دندناتے پھرتے تھے۔ وہ واقعی اسے یوم آزادی کے طور پر منا رہے تھے ——— بنگلہ دیش کی آزادی! اُن کی راہ میں صرف چند روڑے تھے جنہیں مجیب الرحمٰن پُرامن طور پر ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۲۴ مارچ کو عوامی لیگ نے نئی تجاویز پیش کر دیں۔ اُس نے دو دستوری کمیٹیوں کے بجائے دو دستوری کنونشن (مجالس) بنانے پر اصرار کیا اور کہا کہ یہ مجالس مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے دو علیحدہ علیحدہ آئین مرتب کریں اور پھر ان دساتیر کو الحاق پاکستان یا کنفیڈریشن کے لیے بنیاد بنایا جائے۔

اسی روز بھٹو اور یحییٰ خاں کے درمیان علیحدہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے اتفاق کیا (اور یہ اتفاق رائے پہلی بار نہیں ہوا تھا) کہ عوامی لیگ کی خود مختاری رفتہ رفتہ پاکستان کی آئینی شکست و ریخت تک پہنچ گئی ہے، لہٰذا قومی سلامتی اور بقا کے لیے ضروری کارروائی کرنی چاہیے۔ اس اتفاقِ رائے کے باوجود یہی اعلان کیا گیا کہ مذاکرات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری مسٹر تاج الدین نے اسی شام اپنی پارٹی کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ ہم نے "آخری تجاویز" پیش کر دی ہیں اور ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کو تیار نہیں[1]۔

مغربی پاکستان کے سیاستدان، ماہرین اور مشیر سیانے پرندوں کی طرح آنے والے طوفان کی بُو سونگھ کر اپنے اپنے آشیانوں کا رُخ کرنے لگے۔ ان میں سے اکثر ۲۵ مارچ کی صبح کو مغربی پاکستان روانہ ہو گئے۔ صرف بھٹو اور دو تین حضرات پیچھے رہے۔

بعد میں عوامی لیگ کے ایک ہمدرد نے مجھ سے گلہ کیا کہ "ہمیں تو آخری وقت تک یہی کہا گیا کہ مذاکرات جاری ہیں، کسی نے اشارتاً بھی نہ بتایا کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں یا عوامی لیگ خطرے کی لکیر کو پار کرنے والی ہے۔" میں نے عرض کیا: "کیا کنفیڈریشن کی تجویز کے بعد بھی کوئی اُمید باقی رہ گئی تھی؟" اُس نے جواب دیا: "ہمارا خیال تھا کہ مذاکرات آگے بڑھ رہے ہیں، فوج بدستور پیچھے ہٹ رہی ہے، ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں، غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم یہ فراموش کر بیٹھے کہ بھٹو بھی ڈھاکہ میں موجود ہے۔"

جب مغربی پاکستان کے قائدین ڈھاکہ سے کراچی روانہ ہو رہے تھے، تقریباً اسی وقت میجر جنرل خادم راجہ اور میجر جنرل راؤ فرمان علی بھی علیحدہ علیحدہ ہیلی کاپٹر لے کر بالترتیب جیسور اور کومیلا چلے گئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہاں کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر درّانی اور بریگیڈیئر اقبال شفیع کو "آپریشن سرچ لائٹ" کی تفصیلات سے آگاہ کریں اور اشارہ ملتے ہی کارروائی کے لیے تیار رہنے کو کہیں۔

جنرل فرمان جیسور سے واپس ڈھاکہ آ گئے، مگر جنرل خادم کومیلا سے چٹاگانگ کے لیے چلے گئے تاکہ وہاں بھی یہی اہم ہدایات دے سکیں۔ چٹاگانگ کی حالت دوسری چھاؤنیوں کی نسبت خاصی نازک تھی۔ وہاں سب سے سینئر افسر بریگیڈیئر مجمدار تھے جو عوامی لیگ سے دلی وابستگی کے لیے مشہور تھے۔ انہیں اعتماد میں لینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جنرل راجہ نے نہایت ہوشیاری اور سلیقے سے کام لیتے ہوئے چٹاگانگ میں متعین ایک غیر بنگالی افسر لیفٹیننٹ کرنل فاطمی سے رابطہ قائم کیا۔ اُسے اعتماد میں لیا، رازداری پر زور دیا اور

---

[1] روزنامہ پاکستان آبزرور ڈھاکہ، مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء

کہا: "تمہارا کام یہ ہوگا کہ جب تک بریگیڈیئر اقبال شفیع اپنی فوج لے کر کومیلا سے پہنچ نہیں جاتے تم چٹاگانگ کو سنبھالے رکھنا۔"

اِس دورے میں جنرل خادم نے بریگیڈیئر مجمدار سے کہا کہ ڈھاکہ سے شمال میں چند میل کے فاصلے پر ۲ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں بے چینی کے آثار پائے جاتے ہیں، انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے "پاپا ٹائیگر" کی ضرورت ہے۔ آپ بنگال رجمنٹ کے سینئر افسر ہیں، میرے ساتھ چلیں اور انہیں تسلّی دیں۔ بریگیڈیئر مجمدار فوراً رضامند ہوگئے اور وہ جنرل راجہ کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر ڈھاکہ آ گئے۔ وہ ڈھاکہ کیا آئے اسیر ہو کر رہ گئے (اور پھر ملازمت سے ہٹا دیے گئے)۔

باقی چھاؤنیوں کو فوجی کارروائی کی تفصیلات بتانے کے لیے چند اعلیٰ اسٹاف آفیسر سلہٹ، رنگپور اور راجشاہی تشریف لے گئے اور وہاں کے کمانڈروں کو اعتماد میں لے کر واپس چلے آئے۔

ڈھاکہ شہر، ۵۷ بریگیڈ کی ذمہ داری تھی۔ بریگیڈیئر ارباب نے چپکے چپکے اُن مقامات کی نشاندہی کرائی جہاں کارروائی کرنا تھی۔ اِس کام کے لیے انہوں نے سادہ لباس اور پرائیویٹ گاڑیوں میں اپنے عملے کو بھیجا۔ بظاہر یہ سارا معاملہ صیغۂ راز میں رہا اور اِس کا کوئی ناخوشگوار ردِّعمل نہ ہُوا۔

صدر نے ۲۵ مارچ کو واپس راولپنڈی آنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ وہ اگلے روز قوم سے خطاب کریں گے۔ اِس خطاب کے لیے میجر جنرل راؤ فرمان علی نے حسب ذیل نکات مرتب کر کے صدر کے حوالے کیے:

- مجیب الرحمٰن کو غدّار قرار دینے کے بجائے ایسا محبِ وطن بتایا جائے جو انتہا پسندوں کے نرغے میں پھنس گیا ہے۔
- یہ اعلان کیا جائے کہ مجیب الرحمٰن کو کسی جُرم میں گرفتار نہیں کیا گیا، بلکہ حفاظتی اقدام کے طور پر فوج کی تحویل میں لیا گیا ہے۔
- اِس خطاب میں مشرقی پاکستان کے لیے خود مختاری کی حدود کا تعیّن کر دیا جائے۔

۲۶ مارچ کو صدر یحییٰ نے قوم کے نام جو تقریر نشر کی اُس میں اِن نکات کو سراسر نظرانداز کر دیا۔ ڈھاکہ میں مقیم اعلیٰ افسروں کی رائے کو نظرانداز کرنے کا یہ پہلا ـــــ یا آخری ـــــ واقعہ نہ تھا۔ قوم سے خطاب میں جنرل یحییٰ خاں نے ایک متوازی حکومت قائم کرنے کی وجہ سے مجیب الرحمٰن کو غدّار کہا اور اعلان کیا "اُسے اُس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔" یہ اعلان مجیب الرحمٰن کی ۷ مارچ کی تقریر کا جواب معلوم ہوتا تھا جس میں انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر کہا تھا: "ہم اسے چیلنج کیے بغیر نہیں جانے دیں گے۔"

صدر یحییٰ خاں کی روانگی کو اُن کی آمد سے بھی زیادہ پُراسرار بنا دیا گیا۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کھیلا گیا۔ سہ پہر کو صدر چائے پینے کے بہانے ایوانِ صدر سے چھاؤنی میں واقع فلیگ اسٹاف ہاؤس تشریف لے گئے۔ دن کی روشنی ختم ہونے سے پہلے صدر کی سواری پورے طمطراق اور لوازمات کے ساتھ چھاؤنی سے شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ اِس کے آگے پیچھے جیپوں اور موٹر سائیکلوں کا قافلہ تھا۔ کار پر قومی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کے آگے پیچھے چار ستاروں والی پلیٹیں لگی تھیں جو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ اندر جرنیل صاحب بیٹھے ہیں۔ دراصل وہاں بریگیڈیئر رفیق بیٹھے تھے جن کا بھرا بھرا مُنہ اور چوکھٹا کسی حد تک جنرل یحییٰ خاں سے ملتا جُلتا تھا۔ اِس سوانگ کو رازداری قائم رکھنے کا بہت بڑا معرکہ سمجھا گیا، حالانکہ مجیب کے جاسوسوں کو حقیقتِ حال کا پتا چل چکا تھا۔ یحییٰ خاں کے ایک بنگالی اسٹاف افسر لیفٹیننٹ کرنل لے۔ آر۔ چودھری نے صدر کا سامان لے جانے والا ڈاج ٹرک دیکھ لیا اور فوراً مجیب کو خبر کر دی۔ اسی طرح شام کو سات بجے جب جنرل یحییٰ خاں پی۔ اے۔ ایف گیٹ سے ہوائی

اڈے پہنچے، تو بنگالی ونگ کمانڈر خوندکر اپنے دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جھٹ سیلی فون پر مجیب کو اطلاع دے دی۔

صدر یحییٰ خاں کی روانگی کے پندرہ منٹ بعد ایک غیر ملکی صحافی نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے مجھے فون کیا اور صدر کی روانگی کی سرکاری تصدیق چاہی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ صدر کی روانگی کا راز، راز نہیں رہا جب صدر مائل پرواز ہوئے تو شب کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اُس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس شب کی سحر کبھی نہیں ہو گی۔

حصّۂ دوئم

خانہ جنگی

باب ۹

آپریشن سرچ لائٹ (۱)

۲۵ مارچ، صبح ۱۱ بجے میجر جنرل خادم راجہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ان کی صاف شفاف میز پر پڑے ہوئے ٹیلیفونوں میں سے ایک اچانک بجنے لگا۔ یہ مقامی ہاٹ لائن تھی جو افسرانِ بالا کے درمیان رابطے کا کام دیتی تھی۔ جونہی جنرل راجہ نے ہیلو کہا، جنرل ٹکا خاں بولے: "خادم! آج رات!"

ٹھیک دو سال پہلے جنرل یحییٰ خاں نے فیلڈ مارشل ایوب خاں سے اقتدار "وصول" کیا تھا۔ آج وہ اپنے دورِ اقتدار کا سب سے بڑا فیصلہ دے چکے تھے۔ جنرل راجہ نے اپنے سٹاف کو بلا کر ضروری ہدایات دے دیں۔ اونچی سطح پر شاید یہ ایکشن معمول کی کارروائی بھی گیا ہو لیکن نچلی سطح پر جب یہ خبر متعلقہ حضرات تک پہنچی تو خاصی ہلچل مچ گئی۔ کوئی ٹینک شکن توپ کا ایمونیشن لینے بھاگا، کوئی ہتھیار اکٹھے کرنے لگا، کسی نے اپنے موجودہ ہتھیاروں کی کمی پوری کرنا چاہی اور کسی نے ان کے ناقص اجزا بدلنے کی کوشش کی۔ ۲۹ کیولری کے چند افراد جو کچھ روز پہلے رنگپور سے آئے تھے، ورکشاپ میں پڑے ہوئے چھ زنگ آلود ٹینکوں (ایم۔۲۴) کو صاف کرنے لگے۔ اگرچہ یہ ٹینک متحرک جنگ لڑنے کے قابل نہ تھے مگر ڈھاکہ کی سڑکوں پر شور مچانے کے لیے کافی تھے۔

۱۴ ڈویژن کے سٹاف نے ڈھاکہ سے باہر چھاؤنیوں کو "آپریشن سرچ لائٹ" کے متعلق ایک مخصوص کوڈ کے ذریعے اطلاع دینا شروع کر دی۔ اس کارروائی کے لیے ۲۴ اور ۲۵ مارچ کی درمیانی رات ایک بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ وقت کے تعین میں مصلحت یہ تھی کہ اُس وقت تک جنرل یحییٰ خاں بخیر و عافیت کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔

"آپریشن سرچ لائٹ" کے منصوبے کے مطابق ڈھاکہ میں تین ہیڈ کوارٹرز قائم کیے گئے۔ ایک کے انچارج میجر جنرل راؤ فرمان علی تھے۔ ان کے ذمے ڈھاکہ شہر تھا۔ ان کے وسائل میں بریگیڈیئر ارباب والا ۵۷ بریگیڈ تھا۔ دوسرے ہیڈ کوارٹر کے انچارج میجر جنرل خادم راجہ تھے جنہوں نے ۵۷ بریگیڈ کے علاوہ بقیہ ۱۴ ڈویژن کے ذریعے سارے صوبے کو کنٹرول کرنا تھا۔ اس کے علاوہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی کارکردگی پر مجموعی طور پر نظر رکھنے کے لیے مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں رات جاگ کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تیسرا ہیڈ کوارٹر دارالحکومت ثانی[۱] کے علاقے میں واقع تھا۔

۱۔ دارالحکومت ثانی شیرِ بنگلہ نگر، ایوب نگر کا بنایا ہوا جدید وضع کا زیر تکمیل منصوبہ تھا جس کا ڈیزائن امریکہ کے مشہور ماہر فنِ تعمیر لوئی کاہن نے تیار کیا تھا۔ اس کی تعمیر کی بنیادی وجہ فیلڈ مارشل ایوب خاں (اکتوبر ۱۹۵۸ء سے مارچ ۱۹۶۹ء) کے زمانے میں اسلام آباد میں نئے دارالحکومت کا قیام تھا۔ بنگالیوں نے اسلام آباد کی تعمیر پر جو شدید ردعمل ظاہر کیا تھا اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے یہ دوسرا دارالحکومت شروع کیا گیا تھا۔ یہ ڈھاکہ ایئرپورٹ کے جنوب مغربی کنارے پر واقع ہے۔

کارروائی سے چند روز قبل مغربی پاکستان سے میجر جنرل افتخار جنجوعہ اور میجر جنرل ابوبکر عثمان مٹھا کو ڈھاکہ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر میجر جنرل خادم راجہ اور میجر جنرل راؤ فرمان کی جگہ ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ دونوں افسر جنرل صاحبزادہ یعقوب کی ٹیم کے اہم رکن تھے۔ جنرل یعقوب تو جاچکے تھے، مگر ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں فوجی کارروائی کرنے سے انکار نہ کر دیں۔ اس شک کی تصدیق کرنے کے لیے جنرل یحییٰ خاں اور ان کے قریبی حلقوں نے کئی طریقے اختیار کیے۔ حتیٰ کہ ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست جنرل عبدالحمید نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی بیگموں سے پوچھا کہ آپ کے شوہروں کے خیالات کیا ہیں۔ جب یہ بات جنرل فرمان اور جنرل خادم تک پہنچی تو انہوں نے جنرل حمید کو یقین دلایا کہ ہم آپ کے فرمان کے خادم ہیں۔

میرے جیسے ادنیٰ افسر دس بجے رات جنرل ٹکا خاں کے ہیڈ کوارٹر میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جب میں وہاں پہنچا تو دفتر کے احاطے میں صوفے اور آرام کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں اور رات بھر کے لیے چائے اور کافی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ میرے ذمے کوئی خاص فرائض نہ تھے "صرف حاضر رہنے" کو کہا گیا تھا۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ صوفوں اور کرسیوں کے پاس ایک جیپ کھڑی تھی جس میں وائرلیس سیٹ نصب تھے۔ یہ بیرونی خانہ آپریشن روم تھا جس میں جنرل ٹکا خاں، جنرل مٹھا اور چند اور حضرات تشریف فرما تھے۔

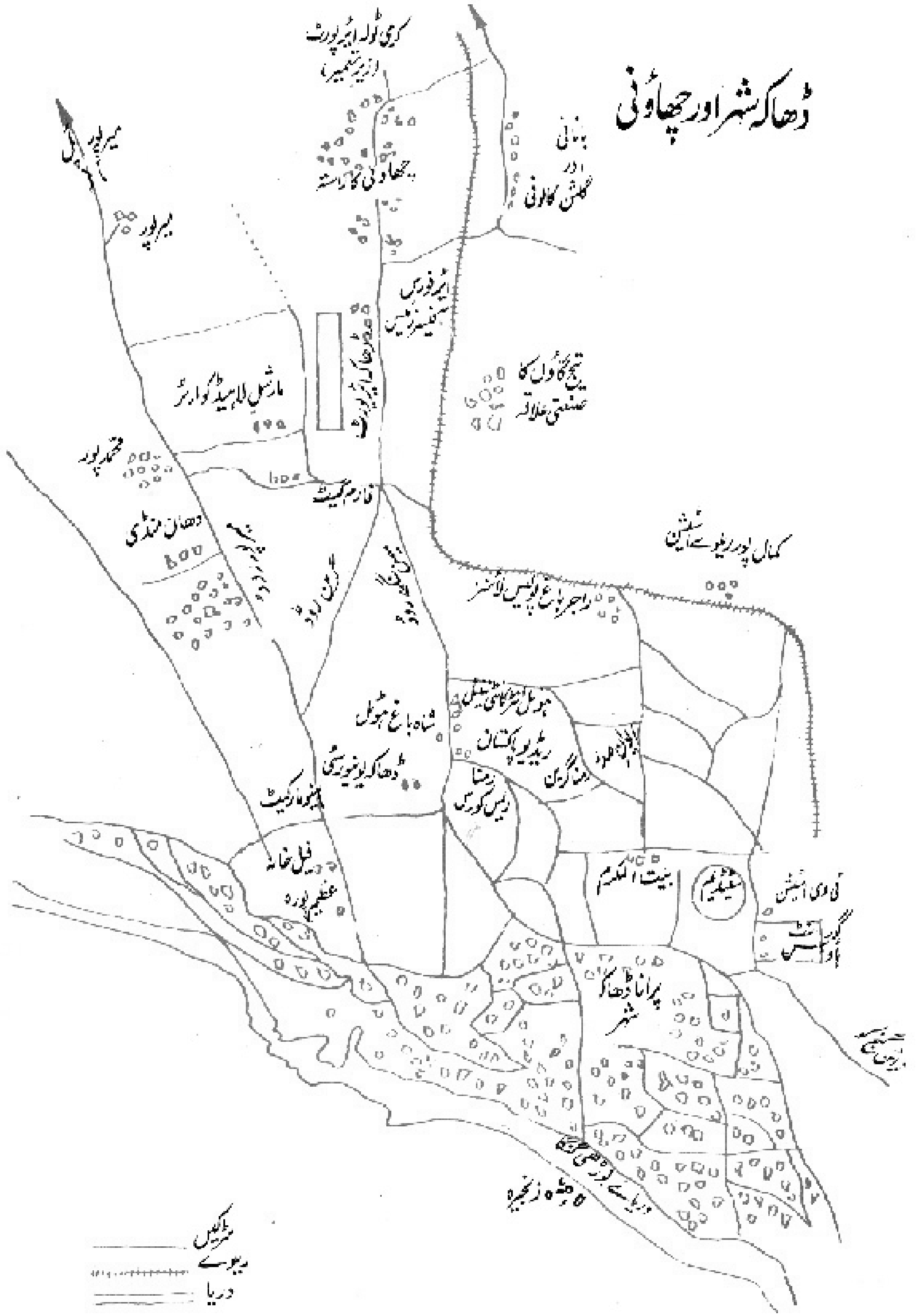
ٹھنڈی چاندنی میں ڈوبا ہوا شہر سو رہا تھا اور موسم بہار کی خنک ہوا میرے گالوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔ باہر جتنا سکون تھا میرے اندر اتنا ہی زیادہ تلاطم تھا۔ میں سوچنے لگا یہ خوشگوار رات خون کی ہولی کھیلنے کے لیے قطعاً نامناسب ہے۔

مسلح افواج کے علاوہ اگر کچھ اور لوگ اس رات سرگرم عمل تھے تو وہ عوامی لیگ کے قائدین اور ان کی "پرائیویٹ آرمی" تھی۔ بنگالی نوجوانوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دی تھیں اور عوامی لیگ سے ہمدردی رکھنے والی پولیس اور ای پی آر مستعد تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا مقرر کردہ "کمانڈر انچیف" کرنل ایم۔ اے۔ جی عثمانی بنگالی یونٹوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا ——— ان تیاریوں کے باوجود ابھی تک ساری کارروائی پر خاموشی کی پتلی سی چادر تنی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے جیپ میں سویا ہوا وائرلیس سیٹ جاگا۔ ڈھاکہ کے مقامی کمانڈر نے کارروائی مقررہ وقت (ایک بجے) سے پہلے شروع کرنے کی اجازت چاہی کیونکہ مخالفین کو فوجی کارروائی کا علم ہو چکا تھا اور وہ پوری شد و مد سے مزاحمت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا اب وقت ضائع کرنے سے حریف ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ ہم سب نے اپنی اپنی گھڑیوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگایا کہ ابھی جنرل یحییٰ خاں سری لنکا کے قریب ہوں گے۔ اگر ابھی کارروائی شروع کی گئی تو عین ممکن ہے بھارت کے لڑاکا طیارے صدر کے بوئنگ کو کراچی پہنچنے سے پہلے شکار کر لیں۔ چنانچہ ٹکا خاں نے فیصلہ دیا: "بابی (ارباب) سے کہو کہ جب تک ممکن ہو صبر سے کام لے۔"

بریگیڈیئر ارباب کے بریگیڈ کو وقت آنے پر حسب ذیل کارروائی کرنا تھی:

- ۱۳ فرنٹیئر فورس ڈھاکہ چھاؤنی میں ریزرو فورس کے طور پر ٹھہرے گی اور وقت ضرورت چھاؤنی کا دفاع کرے گی۔
- ۴۳ لائٹ ایک ایک رجمنٹ (آرٹلری) پہلے ہی ڈھاکہ ائیرپورٹ پر متعین تھی۔ اس کے ذمے ہوائی اڈے کا زمینی اور فضائی دفاع تھا۔
- ۲۲ بلوچ ڈھاکہ شہر میں فیل خانہ میں تھی جہاں ایسٹ پاکستان رائفلز (ای پی آر) کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اس کے ذمے ای پی آر


ڈھاکہ شہر اور چھاؤنی
کرمی ٹولہ ایئرپورٹ (زیر تعمیر)
میرپور پل
میرپور
چھاؤنی کا راستہ
بنانی اور گلشن کالونی
ایئرفورس ہیڈکوارٹرز
تیج گاؤں کا صنعتی علاقہ
مارشل لاء ہیڈکوارٹر
محمد پور
فارم گیٹ
دھان منڈی
گرین روڈ
کمال پور ریلوے اسٹیشن
راجر باغ پولیس لائنز
شاہ باغ ہوٹل
ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل
ریڈیو پاکستان
ڈھاکہ یونیورسٹی
رمنا ریس کورس
رمنا گرین
نیو مارکیٹ
فیل خانہ
عظیم پورہ
بیت المکرم
سٹیڈیم
ٹی وی اسٹیشن
پرانا ڈھاکہ شہر
سڑکیں
ریلوے
دریا

کے پانچ ہزار افراد کو غیر مسلح کرنا اور ان کے ٹیلیفون ایکسچینج پر قبضہ کرنا تھا۔

- ۳۲ پنجاب کے ذمے راجر باغ پولیس لائنز میں ایک ہزار بنگالیوں کو غیر مسلح کرنا تھا۔ یہ فورس عوامی لیگ کی ہمدرد سمجھی جاتی تھی۔

- ۱۸ پنجاب کو نواب پور اور پرانے شہر میں پھیل جانا تھا جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں ہندوؤں کے اَن گنت مکانات اسلحہ خانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

- فیلڈ رجمنٹ (آرٹلری) کے ذمے محمد پور، میرپور اور ان سے ملحقہ علاقوں کو کنٹرول کرنا تھا۔

- ۱۸ پنجاب، ۲۲ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی پر مشتمل ایک "خصوصی فورس" تیار کی گئی تھی جس کے ذمے اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال کو ــــ جو عوامی لیگ کے حامیوں کے گڑھ سمجھے جاتے تھے ــــ باغیوں سے صاف کرنا تھا۔

- ایم۔۲۴ ٹینکوں کے نامکمل اسکواڈرن کو حکم تھا کہ وہ پو پھٹنے سے پہلے شہر کی شاہراہوں پر اپنی قوت اور ہیبت کا مظاہرہ کریں اور اگر ضرورت پڑے تو فائر بھی کریں۔

- سپیشل سروس گروپ (کمانڈوز) کی ایک کمپنی کے ذمے مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرنا تھا۔

مذکورہ بالا یونٹوں کے فرائض میں حکومت کے اقتدار کو بحال کرنا، چیدہ چیدہ سیاسی قائدین کو گرفتار کرنا، اہم تنصیبات کی حفاظت کرنا اور مزاحمت کی صورت میں باغیوں کو کچل دینا شامل تھا ــــ ان فوجیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں رات ایک بجے سے پہلے پہنچنا تھا، لیکن راستے میں بنگالیوں کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کے پیش نظر اکثر یونٹیں چھاؤنی سے ساڑھے گیارہ بجے ہی نکل پڑیں۔ جو فوجی دستے پہلے ہی شہر میں ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی وژن، ٹیلیفون ایکسچینج، بجلی گھر اور سٹیٹ بنک وغیرہ کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے بھی وقت سے پہلے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

چھاؤنی سے جو پہلا دستہ روانہ ہوا، اسے فارم گیٹ پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں عوامی لیگ کے رضا کاروں نے چیک پوسٹ قائم کر رکھی تھی۔ اب انہوں نے وہاں درخت کاٹ کر سڑک پر گرا دیے تھے اور خالی جگہوں پر پرانی کاروں اور روڑی کوٹنے والا بے کار انجن کھڑا کر دیا تھا۔ ان رکاوٹوں کے پار سینکڑوں بنگالی زور زور سے "جے بنگلہ" کے نعرے لگا رہے تھے ــــ میں نے جنرل ٹکا خاں کے ہیڈ کوارٹر میں کھڑے ان نعروں کا شور سُنا، دفعتہً گولیوں کی تڑاخ تڑاخ سنائی دی۔ پھر نعرے بلند ہوئے، پھر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی، پھر نعرے، گولیوں کی سرسراہٹ اور چیخیں گھل مل گئیں ــــ ایک شور برپا ہوا۔ ایک دو مرتبہ کسی خود کار ہتھیار کے چلنے کی آواز بھی آئی ــــ کوئی پندرہ منٹ بعد ہنگامہ فرو ہونے لگا اور نعرے مدھم پڑنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ہتھیاروں نے نعروں پر برتری حاصل کر لی ہے ــــ فوجی دستے رکاوٹ پار کر کے شہر کی طرف بڑھنے لگے ــــ چاند دُور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا اور چاندنی اس آہ و بکا میں اپنا رُوپ کھو بیٹھی تھی۔

اب جب کہ کارروائی خود بخود شروع ہو چکی تھی، رات ایک بجے کا انتظار بے معنی تھا۔ دوزخ کے دروازے کھل چکے تھے۔ اس دوزخ میں بھڑکنے والا پہلا شعلہ بلند ہوا تو ریڈیو پاکستان کی ریڈیائی لہر کے عین قریب شیخ مجیب الرحمٰن کی آواز سنائی دی۔ اس نے عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پیغام پہلے سے ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس کا مکمل متن بھارتی وزارت خارجہ کی مرتب کردہ "بنگلہ دیش کی دستاویزات" میں یوں درج ہے:

شاید یہ میرا آخری پیغام ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج سے بنگلہ دیش آزاد ہے۔ میں عوام سے اپیل کرتا ہوں

...گر ... بھی ... ہ وسائل بھی رکھتے ہوں، غاصب فوج کا اُس وقت تک نہ ... بہ حیثیت جنگ ... شکست ...
دھرتی سے پاکستان کا آخری سپاہی نکل نہیں جاتا، جب تک آپ مکمل کامیابی حاصل نہ کرلیں، اپنی جنگ جاری رکھیں۔[1]

میں مجیب کا یہ نشریہ نہ سُن سکا، البتہ میں نے اس راکٹ لانچر کا دھماکا ضرور سُنا جو کمانڈوز نے مجیب کے گھر جاتے ہوئے ایک رکاوٹ کو دُور کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔ اس کمانڈو پلاٹون میں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل زیڈ۔ اے۔ خاں اور کمپنی کمانڈر میجر بلال بنفسِ نفیس موجود تھے۔ جونہی وہ مجیب کے مکان کے قریب پہنچے وہاں گیٹ پر متعین حفاظتی رضا کاروں نے فائر کھول دیا۔ یہ رضا کار پیشہ ور سپاہیوں کا مقابلہ کیا کرتے، چند لمحوں میں ہمت ہار بیٹھے اور کمانڈوز چار فٹ اونچی دیوار پھاند کر صحن میں اُتر گئے۔ انہوں نے اپنی آمد کا اعلان اسٹین گن کا ایک برسٹ (BURST) فائر کرکے کیا، بلند آواز سے مجیب کو باہر آنے کو کہا گیا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر وہ زبردستی اندر داخل ہوئے اور مجیب کے بیڈ رُوم کے پاس پہنچ گئے۔ دروازے کے باہر تالا پڑا تھا جسے گولی مار کر نیچے گرا لیا گیا۔ مجیب نے فوراً اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ ان کے لباس اور مُوڈ سے یوں لگتا تھا کہ وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔ سپاہیوں نے فوراً انہیں اور گھر کے باقی افراد کو حراست میں لے لیا اور جیپوں میں بٹھا کر زیرِ تعمیر "دارالحکومتِ ثانی" میں لے آئے۔ چند منٹ بعد جنرل ٹکا خاں کے ہیڈ کوارٹر میں کھڑی جیپ کے وائرلیس سیٹ پر ۵۷ بریگیڈ کے بریگیڈ میجر، میجر جعفر کی صاف آواز سُنائی دی: "بڑا پرندہ پنجرے میں ہے . . . دوسرے اپنے گھونسلوں میں موجود نہیں . . . اوور۔"

جونہی پیغام ختم ہوا میری نظر بڑے پرندے پر پڑی جو سفید قمیص میں فوجی جیپ میں بیٹھا سفید چاندنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے جنرل ٹکا خاں سے کہا: "کیا بڑے پرندے کو آپ کے حضور پیش کیا جائے؟" انہوں نے سختی سے کہا: "میں اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں" — مجیب الرحمٰن کو کھلی جیپ میں بٹھا کر شب باشی کے لیے چھاؤنی بھیج دیا گیا اور ان کے گھریلو ملازموں کو شناخت کے بعد رہا کر دیا گیا۔

مجیب الرحمٰن نے اسیری کی پہلی رات آدم جی اسکول میں گزاری، پھر انہیں ایک اور جگہ منتقل کر دیا گیا اور تین چار روز بعد بذریعہ ہوائی جہاز کراچی بھیج دیا گیا۔ بعد میں جب مجیب الرحمٰن کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں اور غیر ملکی دباؤ بڑھنے لگا، تو میں نے اپنے عزیز دوست میجر بلال سے پوچھا: "آپ نے کارروائی کی گرما گرمی ہی میں اسے کیوں ٹھکانے نہ لگا دیا؟" انہوں نے جواب دیا: "میرا بھی یہی ارادہ تھا، لیکن کارروائی سے ذرا پہلے جنرل مٹھا نے مجھے ذاتی طور پر بُلا کر حکم دیا تھا کہ مجیب کو زندہ پکڑ کر لانا ہے۔"

جب مجیب الرحمٰن آدم جی اسکول میں آرام دہ بستر پر دراز تھے، تو ڈھاکہ شہر خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے برآمدے میں کھڑا چار گھنٹے تک یہ جگر خراش منظر دیکھتا رہا۔ شعلے کبھی ماتمی لباس پہنے دھوئیں کے بادلوں میں منہ چھپاتے اور کبھی بھاگ کر آسمان میں پناہ لینے کی کوشش کرتے، کبھی وہ چاند کی طرف لپکتے اور کبھی ستاروں کو اپنی بپتا سنانے کو دوڑتے، لیکن وہ کہیں بھی پہنچ نہ پاتے — زمین سے اُٹھتے، تھوڑی دُور بلند ہوتے اور پھر بے اثر آہوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ اس چٹکی ہوئی چاندنی میں میرا عالمِ تاب تھرتھر کانپ رہا تھا کہ جب مجھے گواہی کے لیے بُلایا گیا، تو ربِّ ذوالجلال کے حضور کیا جواب دُوں گا؟

دھوئیں کے بلند ترین بادل اور چنگھاڑتے ہوئے شعلے یونیورسٹی کیمپس سے بلند ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے دوسرے حصوں

---

[1] ے جلد اول، صفحہ ۲۸۶

بالخصوص روزنامہ دی پیپل کی عمارت سے تباہی کے آثار نظر آرہے تھے۔ بعض حصوں سے مختلف ہتھیاروں کے فائر کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات دو بجے کے قریب ایک بار پھر وائرلیس سیٹ نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ پیغام سننے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک فوجی کپتان بولا: "مجھے اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے . . ." یہ سنتے ہی پاس کھڑے ایک "علی" نے ریسیور میرے ہاتھ سے چھینا اور اس گفتگو میں چلا کر کہا: "کیا مزاحمت لگا رکھی ہے . . کتنی دیر میں ٹارگٹ پر قبضہ کر لوگے؟ . . . چار گھنٹے؟ بکواس، لغو! تمہارے پاس کونسے ہتھیار ہیں؟ راکٹ لانچر، ریکائل لیس رائفل، مارٹر؟ . . . تو یہ کس کام کے لیے ہیں؟ انہیں استعمال کرو اور دو گھنٹے کے اندر اندر ٹارگٹ پر قبضے کی اطلاع دو۔"

حسب الحکم صبح چار بجے تک یونیورسٹی کی عمارت کو (اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال سمیت) مسخر کیا جا چکا تھا لیکن وہاں سے پھوٹنے والا بنگالی قومیت کا نظریہ کافی عرصے تک ناقابل تسخیر رہا ـــــ شاید نظریوں کو مسخر کرنا توپوں اور ٹینکوں کے بس کی بات نہیں۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے فوج کے مختلف دستوں نے شہر کے دوسرے حصوں میں بھی اپنا کام مکمل کر لیا۔ راجر باغ میں پولیس کو اور پیل خانے میں ای پی آر کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ گلی کوچوں میں دہشت پھیلانے کے لیے ہوا میں گولیاں چلائی گئیں۔ سپاہی صرف ان عمارتوں میں داخل ہوئے جہاں سے گولی چلانے میں پہل کی گئی؛ ورنہ وہ سڑکوں اور گلیوں میں پھر کر حکومت کا "اقتدار" بحال کرتے رہے۔

۲۶ مارچ کو پو پھٹتے ہی مختلف دستوں نے اپنا اپنا مشن مکمل کرنے کی رپورٹ دی۔ جنرل ٹکا خاں جو ساری رات لان میں ہمارے ساتھ بیٹھے رہے تھے، علی الصبح اندر گئے۔ جب تھوڑی دیر بعد وہ رومال سے عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو برآمدے میں میں کھڑا تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور خود کلامی کے لہجے میں فرمایا: "آہا! کوئی بھی تو نہیں . . . ." میں نے باہر سڑک پر نظر ڈالی۔ واقعی وہاں بنی نوع انسان کا نام و نشان تک نہ تھا، صرف ایک آوارہ کتا تھا جو دُم دبائے شہر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

دن چڑھے بھٹو کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے لے کر بحفاظت ائیرپورٹ پہنچایا گیا۔ وہاں انہوں نے وی آئی پی لاؤنج میں گزشتہ رات کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے بریگیڈیئر ارباب سے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا ہے۔" کراچی پہنچنے پر انہوں نے پھر یہی جملہ دہرایا۔

جب مسٹر بھٹو یہ پُرامید تبصرہ کر رہے تھے، میں اس وقت یونیورسٹی کیمپس میں ان قبروں کا جائزہ لے رہا تھا جن میں کئی کئی مردے ٹھونس دیے گئے تھے۔ میں نے وہاں پانچ سے پندرہ میٹر قطر کے تین گڑھے دیکھے۔ ان گڑھوں میں پڑی ہوئی مٹی ان خاک کے پتلوں کی بے بسی کا پتہ دے رہی تھی جو بے کفن ان میں دفن تھے ـــــ میں نے وہاں موجود فوجی افسروں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد پوچھی لیکن کسی نے سیدھا جواب نہ دیا۔

میں یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہوا جگن ناتھ ہال اور اقبال ہال گیا جن کے متعلق میں نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے برآمدے میں کھڑے اندازہ لگایا تھا کہ وہ زمین بوس ہو چکے ہوں گے۔ یہاں آکر دیکھا تو دونوں عمارتیں جوں کی توں کھڑی تھیں۔ اقبال ہال پر دو اور جگن ناتھ ہال پر تین راکٹوں کے نشان تھے۔ ان کے بعض کمرے جھلسے ہوئے تھے کہیں کہیں کواڑ جل کر گر چکے تھے۔ تین جگہوں پر ادھ جلی رائفلوں کے ڈھیر تھے اور ایک آدھ جگہ فالتو کاغذ جھلس رہے تھے ـــــ اگرچہ نقصان سنگین تھا، تاہم اتنا نہ تھا جتنا میں نے قیاس کیا تھا۔

غیر ملکی اخباروں نے قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ فوجی افسروں نے ہلاک شدگان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ بتائی۔ سرکاری طور پر صرف چالیس اموات کی تصدیق کی گئی۔

یونیورسٹی سے نکل کر میں شہر کے مختلف حصوں میں گیا۔ راستے میں کبھی کسی فٹ پاتھ پر اور کبھی کسی گلی کے موڑ پر مجھے اکا دکا لاش نظر آئی۔ لاشوں کے وہ انبار جن کے قصے میں نے بیرونی اخبارات میں پڑھے' مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ تاہم میں نے جو کچھ دیکھا' اس سے مجھے متلی آنے لگی اور میرا دل بیٹھنے لگا ـــــ میں اس تجربے کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکا اور وہاں سے چل دیا۔

پرانے شہر کی بعض گلیوں میں اب بھی رکاوٹیں موجود تھیں' مگر ان پر پہرہ دینے والے غائب ہو چکے تھے۔ رات کی فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر ہر فرد اپنے گھر میں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے کوئی شخص کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ ایک گلی کی نکڑ پر ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کسی بچھڑی ہوئی روح کی طرح بے قرار تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساتھ والی گلی میں غائب ہو گیا۔

شہر کا چکر لگانے کے بعد میں دھان منڈی گیا جہاں مجیب الرحمٰن کا گھر واقع تھا۔ مجیب کے گھر ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اسے دیکھ کر دشت یاد آ رہا تھا۔ مختلف اشیا ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کی بھرپور تلاشی لی گئی ہے۔ اس کباڑ میں کوئی قابلِ ذکر شے نظر نہ آئی' الا یہ کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی قدِ آدم تصویر اوندھے منہ پڑی فرش چاٹ رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کر کے دیکھا' شیشے کا فریم کئی جگہوں سے ٹوٹ چکا تھا' مگر اس کی شبیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

مکان کا بیرونی گیٹ بھی اپنی آرائش سے محروم ہو چکا تھا۔ مجیب الرحمٰن کے غیر قانونی دورِ حکومت کے دوران سیاہ رنگ کے گیٹ پر پیتل کا بنا ہوا بنگلہ دیش کا نقشہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کے ارد گرد چھ ستارے بنا کر عوامی لیگ کے چھ نکات کی نمائندگی کی گئی تھی۔ اب گیٹ پر صرف وہ سوراخ نظر آ رہے تھے جہاں یہ آرائشی نقش نصب کیے گئے تھے ـــــ چند دن کی شان و شوکت آناً فاناً غائب ہو چکی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت میں واپس چھاؤنی چلا آیا۔ یہاں کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ فوجی کارروائی سے بہت سے فوجی افسروں کے دل ہلکے ہو گئے تھے۔ فضا کا بوجھل پن غائب ہو چکا تھا۔ آفیسرز میس میں ہلکی پھلکی گفتگو میں اطمینان اور سکون کی لہر بہر تھی ـــــ کیپٹن چودھری نے کینو چھیلتے ہوئے کہا: "بنگالیوں کو خوب سبق سکھا دیا گیا ہے۔ کم از کم ایک نسل تک تو سر نہیں اٹھائیں گے۔" میجر ملک نے گرہ لگائی: "جی ہاں' ان کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔"

باب ۱۰

آپریشن سرچ لائٹ (۲)

ڈھاکہ تو ایک رات کی مارکٹائی سے سُن ہو گیا، لیکن صوبے کے باقی حصوں میں حکومت کی حاکمیت بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔ جن علاقوں میں خصوصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ان میں چٹاگانگ، راجشاہی اور پبنہ شامل تھے۔

چٹاگانگ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سو کے لگ بھگ تھی جو ۲۰ بلوچ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پلٹن مشرقی پاکستان میں عرصۂ ملازمت پورا کرنے کے بعد بحری راستے سے کراچی روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا ہراول دستہ پہلے ہی کوچ کر چکا تھا۔ باقی نفری باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کے ہاتھ میں تھی جنہیں میجر جنرل خادم راجہ چند روز پہلے یہ ہدایات دے چکے تھے کہ وہ کومیلا سے کمک پہنچنے تک چٹاگانگ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

چٹاگانگ میں بنگالی نفری پانچ ہزار کے قریب تھی جن میں سے آدھے افراد ایسٹ بنگال سنٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بریگیڈیئر مجمدار کے تربیت یافتہ تھے ــــــ فوجی اور سیاسی لحاظ سے ــــــ ان میں سے اکثر نے اپنی ٹریننگ چند مہینے پہلے مکمل کر لی تھی مگر بریگیڈیئر صاحب نے سیاسی فضا بدلتے دیکھ کر انہیں "جہاز کی نایابی" کے بہانے روک لیا تھا۔ ان کے علاوہ چٹاگانگ میں ایک نئی بنگالی پلٹن ۸ ایسٹ بنگال کے نام سے کھڑی کی گئی تھی جس کے سیکنڈ ان کمانڈ (یا نائب سالار) میجر ضیاء الرحمٰن[1] تھے۔ نیم فوجی تنظیم ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ایک ونگ بھی یہیں مقیم تھا۔ بنگالی پولیس اور سابق فوجی اور عوامی لیگ کے رضا کار اس کے علاوہ تھے۔

فوجی طاقت کے لحاظ سے چٹاگانگ میں جوڑ برابر کا نہ تھا۔ بظاہر یہی دکھائی دیتا تھا کہ پانچ ہزار بنگالی چھ سو غیر بنگالیوں کو فوراً ہڑپ کر جائیں گے اور یہ اہم بندرگاہ اور شہر باغیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ شروع شروع میں جو خبریں ڈھاکہ پہنچیں وہ واقعی تشویشناک تھیں، مگر اتنا یقین تھا کہ ۲۰ بلوچ کی نفری ابھی تک ڈٹی ہوئی ہے، مگر کب تک؟ کیا یہ چند سو سپاہی کومیلا سے کمک پہنچنے تک حالات کا مقابلہ کر سکیں گے؟

اُدھر کومیلا سے آنے والی کمک کا یہ حال تھا کہ جونہی فوجی دستے کومیلا سے چند میل جنوب میں فینی کے قریب شبھ پور کے مقام پر پہنچے باغیوں نے لکڑی کا پل اُڑا کر ان کی پیش قدمی روک دی۔ اس طرح چٹاگانگ میں میجر ضیاء الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کو اتنا وقت

---

[1] یہ وہی میجر ضیاء الرحمٰن ہیں جنہوں نے چند روز بعد پاکستانی فوج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور چٹاگانگ ریڈیو سٹیشن (ٹرانسمیٹر) سے بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا۔ اگست ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے اہل خانہ کو قتل کر کے بنگلہ دیش کا اقتدار سنبھالا۔ وہ اب اس کے صدر ہیں۔

ل کیا کہ وہ عددی برتری سے فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر قبضہ جما لیا۔ چٹاگانگ ریڈیو اسٹیشن تو بچ گیا، کیونکہ وہاں پاکستانی سپاہی متعین تھے لیکن چٹاگانگ/کپتائی روڈ پر واقع ریڈیو ٹرانسمیٹرز، جہاں ایسے حفاظتی انتظامات نہ تھے، باغیوں کے زیر اثر چلے گئے۔ ان ٹرانسمیٹروں کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایسے آلات نصب تھے جن کی مدد سے فوری نشریات شروع کی جا سکتی تھیں۔ وہیں سے میجر ضیاء الرحمٰن نے بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا۔

۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو ڈھاکہ میں میجر جنرل خادم حسین راجہ کو اطلاع ملی کہ کومیلا سے روانہ ہونے والے فوجی دستے پل ٹوٹنے کی وجہ سے فینی کے قریب رُک گئے ہیں۔ انہوں نے کومیلا کے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر اقبال شفیع کو ٹیلیفون پر حکم دیا کہ وہ مذکورہ پل کو باغیوں کے قبضے میں رہنے دیں اور خود نالہ پار کر کے آگے بڑھ جائیں۔ بریگیڈیئر اقبال شفیع کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ پل سے ہٹ کر نالے کے پار کیسے جائیں، کیونکہ ایسی صورتِ حال سے نپٹنے کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پل پر دوبارہ قبضہ کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور اگلی صبح دس بجے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

بریگیڈیئر اقبال شفیع فوجی دستوں کو لے کر چٹاگانگ کی طرف بڑھنے لگے جہاں ان کی اشد ضرورت تھی، مگر شہر سے بیس کلومیٹر دور کومیرا کے مقام پر باغیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ فوجی دستے کے ہراول گروہ میں سے گیارہ افراد جن میں پلٹن کے کمانڈنگ افسر بھی شامل تھے، شہید ہو گئے۔ اس اچانک افتاد سے ایسی بھگدڑ مچی کہ اس دستے کا کومیلا اور ڈھاکہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ جی او سی ڈھاکہ میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس دستے کا کیا بنا ہے؟ کیا وہ سارے کے سارے شہید ہو گئے ہیں؟ اگر کچھ بچے ہیں، تو وہ کہاں ہیں؟ اس کمک کی ناکامی سے چٹاگانگ کی صورتِ حال اور بھی بگڑنے کا امکان تھا۔ کیا پتہ کس وقت وہاں چند سو پاکستانی سپاہی باغیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جائیں؟

جنرل راجہ جب گمشدہ فوجی دستے سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مواصلاتی رابطہ قائم نہ کر سکے تو ہیلی کاپٹر لے کر خود اسے تلاش کرنے نکلے۔ پہلے وہ چٹاگانگ گئے تاکہ کرنل فاطمی سے وہاں کی صورتِ حال معلوم کر سکیں۔ جونہی ان کا ہیلی کاپٹر ۲۰ بلوچ میں اُترنے کے لیے نیچے آیا، چٹاگانگ کی پست قامت پہاڑیوں سے اچانک اس پر فائرنگ ہوئی۔ دو گولیاں ہیلی کاپٹر کو لگیں، مگر زیادہ نقصان نہ ہوا۔ جنرل راجہ بحفاظت ۲۰ بلوچ میں اُتر گئے۔ وہاں کرنل فاطمی نے انہیں بتایا کہ ان کی پلٹن نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے، پچاس کو ہلاک اور کوئی پانچ سو افراد کو قیدی بنا لیا ہے جس سے ایسٹ بنگال سنٹر محفوظ ہو گیا ہے، البتہ شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر باغی قابض ہیں۔

جنرل راجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ چٹاگانگ سے کومیلا کی طرف سڑک کے اُوپر پرواز کریں گے تاکہ راستے میں جہاں کہیں فوجی دستہ نظر آئے وہاں اُتر جائیں۔ جب وہ چٹاگانگ سے چلنے لگے تو ایک ستم رسیدہ خاتون جس کی گود میں بچہ تھا، ان کے پاس آئی اور چٹاگانگ سے نکلنے کے لیے ان کی مدد مانگنے لگی۔ یہ خاتون مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کی بیوی تھی اور ہنگاموں میں کارواں سے جدا ہو گئی تھی۔ جنرل صاحب نے اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھا لیا۔

ہیلی کاپٹر میجر لیاقت بخاری اُڑا رہے تھے جو اپنی بہادری اور پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے تمام حلقوں میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے پائلٹ میجر پیٹر تھے جو اپنے کام میں بہت طاق تھے۔ یہ دونوں ہوا باز، جنرل خادم راجہ، بے بس خاتون اور اس کے بچے کو لے کر بخیریت چٹاگانگ سے نکل آئے۔ ہیلی کاپٹر کومیلا کی طرف سڑک کے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا

[illegible] نقشہ اپنے گھٹنوں پر پھیلائے اندازہ لگاتے رہے کہ گم شدہ فوجی دستہ اس وقت کہاں ہوگا۔ [illegible] متوقع جگہ کے قریب پہنچ کر باہر جھانکا، مگر نچلے بادلوں کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ تو میجر لیاقت بخاری سے کہا کہ وہ بادلوں کے نیچے جائیں تاکہ سڑک نظر آسکے۔ بخاری نے فوراً تعمیل کی، مگر وہ جونہی نیچے گئے، گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ پائلٹ نے جبلی تحریک پر فوراً ہیلی کاپٹر اُوپر اُٹھایا۔ ایک گولی ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں لگی اور دوسری ایندھن کی ٹینکی سے چند انچ دور لوہے کی چادر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے پاس ہی وہ عورت اپنے بچے سمیت بیٹھی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچ گئی۔ میجر بخاری نے جنرل راجہ سے پوچھا: "سر! کیا ایک اور کوشش کروں؟" انہوں نے فرمایا: "نہیں، اب سیدھے ڈھاکہ چلو۔"

اسی اثنا میں میجر جنرل مٹھہ نے جو اسپیشل سروس گروپ (کمانڈوز) کے ماہرانہ استعمال کی شہرت رکھتے تھے، ڈھاکہ سے ۳۲ کمانڈو بٹالین کا ایک دستہ فضائی راستے سے چٹا گانگ بھیجا تاکہ وہ زمینی راستے سے بریگیڈیئر اقبال شفیع کے ساتھ رابطہ قائم کرسکے۔ یہ دستہ بخیریت چٹا گانگ پہنچ گیا، لیکن اسے کچھ علم نہ تھا کہ بریگیڈیئر اقبال شفیع کہاں ہیں اور ان تک پہنچنے کے لیے کونسا راستہ مناسب ہے؟

اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے ایک بنگالی افسر آگے بڑھا۔ اس نے پاکستانی دستے کے کمانڈنگ آفیسر سے کہا: "میں کیپٹن حمید ہوں، مری میں ہوتا ہوں۔ چٹا گانگ میں اپنے والدین کی خبر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی رہنمائی کے لیے تیار ہوں۔" اس کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا گیا اور یہ فوجی دستہ کیپٹن حمید کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے چٹا گانگ رکومیلا روڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شہر سے باہر سڑک کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جب وہ ان پہاڑیوں کے درمیان پہنچے، تو اچانک دونوں جانب سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ چھاپہ مار دستے نے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تیرہ افراد ہلاک ہوگئے جن میں ایک کمانڈنگ آفیسر، دو نوجوان افسر، ایک جے سی او اور نو سپاہی شامل تھے۔

اس دستے کے علاوہ ۲۰ بلوچ کا ایک گروہ بھی اسی مشن پر روانہ کیا گیا، مگر یہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ جب کرنل فاطمی سے اس ناکامی کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہہ دیا کہ راستے میں باغیوں کی طرف سے شدید مدافعت تھی۔

گویا یہ دونوں کوششیں ناکام ہوگئیں۔

ادھر بریگیڈیئر اقبال شفیع پیش قدمی کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے کومیرا کے مقام پر تعطل کے دوران کومیلا سے چھوٹی توپوں کی ایک بیٹری منگوالی۔ یہ توپیں ان کے پاس ۲۷ مارچ کی شام کو پہنچیں اور اگلی صبح باغیوں پر حملہ کرکے مدافعت توڑ دی گئی۔ چٹا گانگ شہر کی طرف پیش قدمی کے لیے راستہ کھول لیا گیا۔

راستے میں اس تاخیر کے دوران چٹا گانگ شہر میں حاجی کیمپ کے قریب اصفہانی جوٹ ملز کی کالونی پر قیامت گزر گئی۔ وہاں باغیوں نے بے یار و مددگار مردوں، عورتوں اور بچوں کو کلب کی عمارت میں جمع کرکے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس سفاکانہ قتل کے چند روز بعد میں اس عمارت میں گیا۔ اس کے فرش اور دیواروں کے نچلے حصے پر خون ہی خون تھا۔ عورتوں کے لباس اور بچوں کے کھلونے خون سے تر تھے۔ ساتھ والی رہائشی عمارت میں بستر کی چادریں اور گدے خون خشک ہونے کی وجہ سے اکڑ گئے تھے۔

۲۹ مارچ کو بریگیڈیئر اقبال شفیع اور چٹا گانگ کے دستوں میں ملاپ کی خبر ملی۔ ڈھاکہ کے آپریشن روم میں متفکر فوجی افسروں کی جان میں جان آئی، مگر اتنے میں اصفہانی کالونی کے بے گناہ باسی اپنی جان پر کھیل چکے تھے۔

اب تک چٹا گانگ میں قابلِ ذکر کامیابی صرف ایک بحری جہاز سے سامان اُتروانے تک محدود تھی۔ یہ جہاز وسط مارچ میں

مغربی پاکستان سے دفاعی سامان لے کر پہنچا تھا، لیکن عوامی لیگ کے کارکنوں نے اس سے سامان اتارنے کی اجازت نہ دی، کیونکہ — بقول ان کے — اس کی مدد سے سات کروڑ بنگالیوں کی آواز کو دبانا مقصود تھا۔ مجیب الرحمٰن کے پچیس روزہ دورِ اقتدار میں فوجی انتظامیہ نے زبردستی سامان اتارنے کی کوشش نہ کی؛ البتہ جب پالیسی بدلی، تو لاگ ایریا کمانڈر بریگیڈیئر ایم۔ ایچ۔ انصاری کو فضائی راستے، ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچایا گیا۔ انہوں نے چٹاگانگ میں موجود وسائل جن میں پیادہ فوج کی ایک پلٹن، چند ہلکی توپیں اور دو ٹینک شامل تھے، جمع کرکے ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) ترتیب دی۔ بحریہ نے ایک تباہ کن جہاز (DESTROYER) اور چند گن بوٹ (GUN BOATS) مہیا کیں۔ ان کی مدد سے بریگیڈیئر انصاری نے نازک مسئلے کو حل کردیا۔ بعد ازاں ایک اور پلٹن ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچ گئی اور بریگیڈیئر انصاری کے "وسائل" بہتر ہوگئے۔

اگرچہ وسائل کے اعتبار سے حالت پہلے سے بہتر ہوگئی تھی، مگر چٹاگانگ کو باغیوں سے پاک کرنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ باغیوں کا زیادہ تر اجتماع ایسٹ پاکستان رائفلز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر، ضلع کچہری میں ریزرو پولیس لائنز اور ریکانی روڈ پر ٹرانسمیٹر بلڈنگ میں تھا۔ سب سے پہلے میجر جنرل مٹھا نے ٹرانسمیٹر کی عمارت سے باغیوں کو نکالنے کے لیے ایس ایس جی (کمانڈوز) کا ایک دستہ روانہ کیا۔ اس دستے نے اپنے حریف تک پہنچنے کے لیے دریائی راستہ اختیار کیا تاکہ ایک پہلو سے اچانک حملہ کیا جائے، لیکن ابھی وہ کشتیوں ہی میں تھے کہ ان پر فائر کھل گیا۔ وہ نہ بھاگ سکتے تھے اور نہ ڈٹ کر مقابلہ کرسکتے تھے۔ سولہ افراد موقع ہی پر ہلاک ہوگئے۔

ادھر، ۲ بلوچ کا ایک اور دستہ لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کی قیادت میں ٹرانسمیٹر بلڈنگ کی طرف روانہ کیا گیا، لیکن یہ اپنے 'ٹارگٹ' تک نہ پہنچ سکا، کیونکہ حسبِ معمول کرنل فاطمی راستے ہی میں باغی افراد سے الجھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ آخرکار پاکستان ایئر فورس کے دو سیبر طیاروں (ایف۔ ۸۶) نے کام نمٹا دیا۔ انہوں نے بھرپور فضائی حملہ کرکے باغیوں کو وہاں سے بھگا دیا۔ چند روز بعد میں وہاں گیا، تو ٹرانسمیٹر بلڈنگ کے اردگرد مضبوط دفاعی لائن میں جابجا خندقیں کھدی تھیں۔ ان خندقوں کو گہری نالیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیا گیا تھا۔ سارا دفاعی انتظام نہایت پیشہ ورانہ مہارت سے مکمل کیا گیا تھا۔ ہوائی حملے سے ٹرانسمیٹر تباہ ہوئے تھے نہ عمارت منہدم ہوئی تھی؛ البتہ گولیوں کے چند نشان ابھی تک گواہی دے رہے تھے کہ یہ عمارت "تازہ" کسی امتحان سے گزری ہے۔

دوسرا اہم 'ٹارگٹ' ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا جہاں ایک ہزار مسلح باغیوں نے حصار بنا رکھا تھا۔ ان کے مورچے جو بلند جگہ پر واقع تھے، پشتوں کے ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے۔ ہلکے ہتھیاروں سے فائر کرنے کے لیے ان پشتوں میں ضروری سوراخ اور درزیں بھی رکھی گئی تھیں۔ پاکستانی سپاہیوں کو ان دفاعی انتظامات کا پہلے سے علم تھا؛ چنانچہ انہوں نے ایک پوری پلٹن (تقریباً چھ سو افراد)، دو ٹینکوں اور ایک توپ سے ان پر حملہ کیا۔ ساحل کے پاس سے نیوی کے ایک جہاز (DESTROYER) اور دو مسلح کشتیوں (GUN BOATS) نے ان کی مدد کی۔ لڑائی کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ بالآخر سرکش بنگالی مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان میں سے کئی ہلاک ہوگئے۔ یہ فتح آپریشن "سرچ لائٹ" کے چھٹے دن یعنی ۳۱ مارچ کو نصیب ہوئی۔

اس کے بعد ریزرو پولیس لائن کی باری تھی۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پولیس، سابق فوجی، عوامی لیگ کے رضاکار اور دیگر سرکش عناصر جمع تھے جن کے پاس ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار رائفلیں تھیں۔ یہاں بھی پاکستان آرمی کی ایک پلٹن نے حملہ کیا، مگر مدافعت کمزور نکلی اور وہ ابتدائی کارروائی ہی میں مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ان مقامات پر مزاحمت کو فرو کرنے میں بریگیڈیئر انصاری نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں کچھ عرصے بعد ہلالِ جرأت کا اعزاز اور میجر جنرل کا عہدہ عطا کیا گیا۔ (قبل ازیں وہ اس ترقی سے محروم رہ گئے تھے۔)

مارچ کے آخر تک چٹاگانگ میں اہم فوجی کارروائیاں ختم ہو گئیں، مگر اکّا دُکّا جھڑپیں جاری رہیں۔ چٹاگانگ شہر اور چھاؤنی پر مکمل قبضہ ۶ اپریل کے لگ بھگ بحال ہوا۔

دیگر دو قصبے جہاں باغیوں کو ابتدائی دور میں برتری حاصل تھی، کُشتیا اور پبنہ تھے۔ آئیے ذرا ان مقامات کا حال بھی دیکھتے چلیں:

کُشتیا: جیسور سے شمال مغرب میں نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جو کئی سڑکوں اور ریلوے لائن کا سنگم ہے۔ یہاں عام حالات میں پاکستانی فوج متعین نہ تھی مگر فوجی کارروائی کے پیشِ نظر جیسور سے ایک کمپنی (تقریباً ڈیڑھ سو سپاہی) کُشتیا بھیجی گئی تھا کہ وہاں "اپنی موجودگی کا تأثر قائم کر سکے"۔ یہ کمپنی اپنے ساتھ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود مقدار میں ایمونیشن لے گئی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہاں "اندرونی امن و امان" بحال رکھنے کے لیے بھاری ہتھیاروں اور وافر ایمونیشن کی ضرورت نہیں۔ اس تأثر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے مکمل معلومات فراہم کیے بغیر فوراً جیسور سے روانہ کر دیا گیا تھا۔

کمپنی کمانڈر نے اپنی کمپنی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے اسے ٹیلیفون ایکسچینج، وی۔ ایچ۔ ایف[1] سٹیشن اور دیگر اہم مقامات پر لگا دیا۔ چند چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کو عوامی لیگ کے مقامی قائدین کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ قائدین تو ہاتھ نہ آئے، البتہ پہلے روز ہی ایک جھڑپ میں پانچ باغیوں کو ٹھکانے لگا کر اپنی موجودگی کا سکّہ جما دیا۔ اس کے بعد صرف کرفیو نافذ کرنا تھا جس میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اگلے دو روز بھی امن و امان سے گزر گئے۔

۲۸ مارچ کو ساڑھے نو بجے رات مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس، کمپنی کمانڈر شعیب کے پاس آیا۔ خوف کے مارے اس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ کُشتیا سے کوئی سولہ کلومیٹر دور چوآڈانگا کے سرحدی قصبے میں بہت سے باغی جمع ہیں اور دھمکی دے رہے ہیں کہ جس کسی نے پاکستانی فوج سے تعاون کیا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ایس پی نے یہ اطلاع بھی دی کہ وہ کسی وقت رات کو کُشتیا پر ہلّہ بول دیں گے۔ میجر شعیب نے اپنی تمام پلاٹونوں کو چوکس رہنے کی ہدایت بھیج دی، مگر سپاہیوں نے کسی غیر معمولی حفاظتی اقدام کی ضرورت محسوس نہ کی ——— آخر بنگالی ہی تو ہیں سالے، نپٹ لیں گے ان سے ———

رات کے پچھلے پہر (کوئی پونے چار بجے) کُشتیا پر گولے برسنے لگے۔ یہ فرسٹ ایسٹ بنگال (۱۔ای بی) کا حملہ تھا جسے اپنے تمام ہتھیاروں سمیت جیسور چھاؤنی سے "ٹریننگ" کے بہانے باہر بھیجا گیا تھا تا کہ چھاؤنی میں مزاحمت کا باعث نہ بنے۔ ۱۔ای بی کے ساتھ بھارتی سیکورٹی فورس[2] (بی۔ایس۔ایف) کے سپاہی بھی مل گئے۔ (بعد میں پاکستانی فوج نے بی ایس ایف کے چار سپاہی جیسور کے باہر گرفتار کر لیے تھے۔) حملے کا ہدف وہ اسلحہ خانہ تھا جسے تین روز پہلے پاکستانی سپاہیوں نے پولیس سے چھین کر اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس اسلحہ خانے سے ملحق ایک جج کا سہ منزلہ مکان تھا۔ باغی اس مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے اسلحہ خانے میں گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ہمارے سپاہی اسی عمارت میں پڑے رہے، کیونکہ باہر نکلنے سے زیادہ نقصان اٹھانے کا خطرہ تھا۔ جب سورج طلوع ہوا

---

[1] VERY HIGH FREQUENCY وائرلیس سٹیشن جو زیادہ فاصلے تک مواصلاتی رابطے کا کام دیتا ہے۔

[2] یہ بھارتی بارڈر پولیس یا رینجرز کی طرح نیم فوجی تنظیم ہے، مگر فوجی فرائض سنبھالنے کے بھی اہل سمجھی جاتی ہے۔

تو ہمارے پانچ سپاہی صحن میں شہید پڑے تھے۔ نو بجے تک شہیدوں کی تعداد گیارہ ہوگئی۔ آئندہ نصف گھنٹے میں مزید نو افراد کام آئے۔ پولیس میں سے صرف چند سپاہی جان بچا کر کمپنی ہیڈکوارٹر پہنچ سکے۔ اس تباہی کی دو بڑی وجوہ تھیں ـــــ ایک ایمونیشن کی کمی اور دوسرے حفاظتی اقدامات سے لاپروائی ـــــ

ہماری دوسری دو چوکیاں ٹیلیفون ایکسچینج اور وی۔ایچ۔ایف اسٹیشن میں واقع تھیں۔ ان پر بھی بیک وقت اتنا شدید حملہ ہوا کہ جغرافیائی قرب کے باوجود ایک چوکی دوسری چوکی کی مدد کو نہ پہنچ سکی ـــــ خود کمپنی ہیڈکوارٹر مُردہ خانے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ وہاں گیارہ فوجی ایک جگہ ہلاک پڑے تھے اور چودہ دوسری جگہ۔ وہاں ساٹھ افراد میں سے پچیس شہید ہوچکے تھے۔

اس تباہی کے پیشِ نظر جیسور بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں "فوری مدد" کے لیے پیغام بھیجا گیا اور بلاتاخیر فضائیہ کی امداد پر زور دیا گیا ـــــ بار بار پیغامات کے جواب میں یہ مایوس کن جواب موصول ہوا: "فوجی کمک خارج از امکان ہے کیونکہ ساری نفری پہلے ہی کسی نہ کسی کارروائی میں مصروف ہے اور فضائی مدد موسم کی خرابی کی وجہ سے ممکن نہیں . . . . خدا حافظ!"

میجر شعیب نے اپنی کمپنی کے تتر بتر سپاہیوں کو جمع کیا۔ پتہ چلا کہ ڈیڑھ سو افراد میں سے صرف ۶۵ زندہ بچے ہیں۔ انہوں نے فوراً کشتیا چھوڑ کر جیسور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر کے لیے ایک ٹرک، ایک ڈاج اور چھ جیپیں اکٹھی کیں۔ روانگی رات کی تاریکی میں ہوئی۔ سب سے اگلی جیپ میں میجر شعیب خود سوار تھے۔ کشتیا سے کوئی پچیس کلومیٹر دور اچانک میجر شعیب کی جیپ پکی سڑک پر چلتی چلتی ایک کھائی میں دھنس گئی جہاں باغیوں نے سڑک کاٹ کر اوپر سے ڈھانپ دی تھی۔ جونہی قافلہ رکا، سڑک کے دونوں جانب سے گولیاں برسنے لگیں۔ پاکستانی سپاہی گولیوں کی بوچھاڑ میں ٹرکوں سے کود کر آڑ لینے کے لیے بھاگے، مگر میجر شعیب سمیت ان میں سے اکثر وہیں شہید ہوگئے۔ صرف نو افراد رینگ رینگ کر زندہ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے بھی بعض راستے میں پکڑے گئے اور باغیوں اور دیہاتیوں نے مل کر انہیں ذلیل و خوار کیا۔ ننگا بازاروں میں چلوایا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔

اب مختصراً پبنہ کا حال بھی سُن لیجیے۔ پبنہ کے قریب راجشاہی میں ہماری ۲۵ پنجاب متعین تھی۔ اس کی ایک کمپنی (کوئی سوا سو افراد) "اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے" پبنہ روانہ کی گئی۔ یہ کمپنی بھی (کشتیا والی کمپنی کی طرح) صرف امن و امان برقرار رکھنے کے لیے آئی اور اپنے ساتھ چھوٹے ہتھیار، تھوڑا سا ایمونیشن اور تین دن کا راشن لائی۔ یہاں بھی کمپنی کمانڈر نے زیرِ کمان سپاہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر اہم تنصیبات مثلاً بجلی گھر اور ٹیلیفون ایکسچینج وغیرہ پر متعین کر دیا۔ چند سپاہیوں کو سیاسی لیڈروں کے گھر بھیجا گیا مگر وہ پہلے ہی وہاں سے فرار ہوچکے تھے۔ پہلے دن پاکستانی سپاہیوں نے کسی مزاحمت کے بغیر پبنہ میں ڈیرہ ڈال لیا۔ آئندہ ۳۶ گھنٹے بھی بخیر و عافیت گزر گئے، مگر ۲۷ مارچ کو سورج ڈوبتے ہی نالے کے پار سے گولیاں چلنے لگیں۔ یہ فائر کرنے والے ایسٹ پاکستان رائفلز کے نو سو باغی تھے جن کے ساتھ چالیس چالیس آدمی پولیس اور عوامی لیگ کے تھے۔ انہیں ہماری کُل تعداد کا علم نہ تھا، چنانچہ وہ دُور دُور سے فائر کرتے رہے۔ ہمارے فوجی بھی وقتاً فوقتاً جوابی فائر کرتے، مگر ذرا کنجوسی سے، کیونکہ انہیں ایمونیشن کی کمی کا احساس تھا۔ اس ابتدائی جھڑپ میں ہمارا ایک نان کمیشنڈ آفیسر (N.C.O) اور دو سپاہی زخمی ہوگئے۔

باغیوں کی ایک لائٹ مشین گن (ایل ایم جی) مسلسل فائر کر رہی تھی۔ کیپٹن اصغر نے سوچا کہ جب تک اسے خاموش نہ کیا گیا، سکھ کا سانس لینا مشکل ہوگا، چنانچہ چند جاں نثار ساتھ لیے اور آہستہ آہستہ اس ایل ایم جی پوزیشن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جب

وہ اپنے مارٹر کے قریب پہنچا تو اس نے ایک دستی بم پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ ہلکی مشین گن تباہ ہوگئی لیکن قبل اس کے کہ کیپٹن اصغر اگلی کارروائی کرتا' دشمن کی ایک اور مشین گن نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ سخت زخمی ہوا' مگر آڑ لیتا ہوا دشمن سے اوجھل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اوٹ میں جاتے ہی وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

کیپٹن اصغر کے بعد لیفٹیننٹ رشید نے چند ساتھیوں سمیت اسی دشمن پر حملہ کر دیا اور نہایت شجاعت سے اپنی جان' جاں آفریں کے حوالے کر دی۔

اس اثنا میں بجلی گھر اور ٹیلیفون ایکسچینج سے بھی سپاہی واپس بلا لیے گئے تاکہ انہیں یکجا کر کے مقابلے کے لیے ازسرِنو منظم کیا جائے۔ اُدھر باغیوں نے بھی اس وقفے کے دوران اپنے آپ کو منظم کر کے ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہیوں اور افسروں کو اب احساس ہوا کہ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود ایمونیشن لانے کا نقصان کیا ہے؟ انہیں اس کوتاہی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس جھڑپ میں ہمارے دو افسر' تین جونیئر کمیشنڈ افسر اور اسّی سپاہی شہید ہوگئے۔ اس کے علاوہ ایک افسر اور تئیس سپاہی زخمی ہوئے۔

مدد کے لیے بار بار راجشاہی پیغام بھیجا گیا۔ بالآخر زخمیوں کو اٹھانے کے لیے ایک ہیلی کاپٹر آیا' مگر اترنے کے لیے محفوظ جگہ نہ پاکر واپس چلا گیا؛ البتہ راجشاہی سے میجر اسلم اٹھارہ سپاہیوں کی کمک لے کر پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریکائل لیس رائفل' ایک مشین گن اور کچھ ایمونیشن لائے' بچے کھچے سپاہیوں کو باغیوں کے نرغے سے نکالا۔ زخمیوں کو ڈاج میں ڈال کر کچے راستے سے راجشاہی روانہ کیا (تاکہ زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے) اور خود وہاں پہنچنے کے لیے سڑک کا راستہ منتخب کیا تاکہ راستے میں باغیوں کا سامنا ہو' تو ان سے نپٹا جا سکے۔

پبنہ/ راجشاہی روڈ پر میجر اسلم کو شدید مدافعت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اسے فرو کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی' مگر کامیابی نہ ہوئی؛ چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت سڑک چھوڑ کر دیہاتی راستوں سے راجشاہی کی طرف پیدل چلنا شروع کیا۔ جس گاؤں میں باغیوں کا سامنا کرنا پڑتا' وہاں سے دوسرے راستے پر ہو لیتے' بالآخر جب وہ بھوکے پیاسے' خاک چھانتے اور باغیوں سے نپٹتے یکم اپریل کو راجشاہی پہنچے' تو ان میں سے صرف ۱۸ آدمی زندہ تھے' میجر اسلم سمیت باقی سارے راستے میں شہید ہو چکے تھے۔

یہ تھی چٹاگانگ' کشتیا اور پبنہ کی مختصر رُوداد جہاں ہمیں شدید مزاحمت اور بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ ان شہروں پر بالترتیب چھ اپریل' سولہ اپریل اور دس اپریل کو حکومتِ پاکستان کا اقتدار بحال کیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی مزاحمت ہوئی' مگر اسے زیادہ جانی نقصان کے بغیر فرو کر لیا گیا۔

اس سارے المیے کا المناک ترین پہلو یہ ہے کہ باغیوں نے نہ صرف پاکستانی فوجیوں کو بے دردی سے قتل کیا' بلکہ ان کے بال بچوں کو بھی سفاکانہ سلوک کا نشانہ بنایا۔ اس کتاب میں ان کی بربریت کے سارے قصے رقم کرنا ممکن نہیں۔ صرف ایک واقعہ نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں:

۲ ایسٹ بنگال[1] ڈھاکہ کے شمال میں جودیپ پور کے مقام پر تھی۔ اس میں ساری نفری بنگالی تھی؛ البتہ چند افسر جیسے سی او اور

---

[1] یہ وہی پلٹن ہے جس کی تقریب پرچم کشائی فروری ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئی تھی اور لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین نے بنگالی سپاہیوں کو وقتِ ضرورت کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی عثمانی کی قیادت پر بھروسا کرنے کی تلقین کی تھی۔

یہاں کے افراد جن کا تعلق ٹیکنیکل شعبوں سے تھا، مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ان میں سے اکثر نے اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ اسی پلٹن میں گزارا تھا اور وہ اپنے آپ کو اسی کنبے کے افراد سمجھتے تھے۔ ۲۵ مارچ کی کارروائی کے پیشِ نظر جس طرح فرسٹ ایسٹ بنگال کو ٹریننگ کے بہانے جیسور چھاؤنی سے باہر بھیج دیا گیا تھا، اسی طرح سیکنڈ ایسٹ بنگال کو بھی جودیب پور سے شمال کی طرف روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ ڈھاکہ سے دُور رہے۔ اس پلٹن کی ایک ایک کمپنی غازی پور، ٹنگیل اور میمن سنگھ میں تھی؛ البتہ چوتھی کمپنی پیچھے ایک پرانے محل میں واقع ہیڈ کوارٹر میں رہی۔

اس پلٹن نے دوسری بنگالی پلٹنوں سے مواصلاتی رابطہ قائم کرنے کے بعد ۲۷ مارچ کو بغاوت کر دی۔ بغاوت کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور ان کے اہلِ خاندان کو قتل کر دیا؛ البتہ صوبیدار ایوب جودیب پور سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بھاگا بھاگا ڈھاکہ پہنچا اور اس بربریت کی داستان سُنائی۔ دہشت کے مارے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کے کناروں پر سفید جھاگ کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ہر کسی نے اسے تسلی دینے اور چائے پلانے کی کوشش کی، مگر اس نے کسی کی نہ سُنی اور جلد از جلد مدد کی ضرورت پر زور دیا۔

ڈھاکہ چھاؤنی سے پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی فوراً جودیب پور روانہ ہو گئی۔ ہیڈ کوارٹر کے چند نوجوان افسر رضاکارانہ طور پر ساتھ ہو لیے۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو بٹالین کا سارا علاقہ مقتل میں بدل چکا تھا۔ گندگی کے ایک ڈھیر پر پانچ بچے ذبح ہوئے پڑے تھے، ان کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے گئے تھے۔ ان کی ماؤں کی مسخ شدہ لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر اوندھی پڑی تھیں۔ صوبیدار ایوب ان میں اپنے کنبے کے افراد کو پہچان کر چلّا اٹھا اور انتہائی صدمے سے دماغی توازن کھو بیٹھا۔

محل کے صحن میں ایک فوجی جیپ کھڑی تھی جس میں وائرلیس سیٹ نصب تھا۔ جیپ کے ٹائروں سے ہوا نکل چکی تھی اور جیپ کے اندر مغربی پاکستان کا ایک این سی او (ٹیکنیکل) ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کے خون کے چھینٹے اس کے وائرلیس سیٹ پر بھی پڑے ہوئے تھے ——— عمارت کے اندر بھی منظر زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہاں ایک غسل خانے میں چند خون آلود کپڑے ملے جو رابطہ کی تفتیش کے مطابق، گوجرانوالہ کے کیپٹن ریاض کے تھے۔ سپاہیوں کے رہائشی کوارٹروں میں ایک نوجوان عورت پھٹے کپڑوں سمیت مُردہ پڑی تھی اور اس کا شیرخوار بچہ اس کی چھاتیوں سے لپٹ کر بلک رہا تھا۔ ایک اور کوارٹر میں چار سالہ بچی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ وہ فوجیوں کو دیکھتے ہی چلّا اٹھی: "مجھے نہ مارو، مجھے نہ مارو۔ میرے ابّو کو آ لینے دو۔" اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے ابّو اب کبھی نہیں آئیں گے۔

چند ماہ بعد چیف آف آرمی اسٹاف جنرل عبدالحمید نے مجھ سے ڈھاکہ ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں باتیں کرتے ہوئے اس تمام قتل و غارت کی ذمہ داری لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب پر عائد کی اور کہا: "یعقوب نے مارچ کے آغاز میں مغربی پاکستان سے فوجیوں کی آمد کی مخالفت کی تھی۔ اگر انہوں نے ہمیں بروقت فوجی طاقت میں اضافہ کرنے دیا ہوتا، تو تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں ہمارے جوان موجود ہوتے اور اس وحشیانہ قتل و غارت کی نوبت نہ آتی۔" میں یہ دلیل سُن کر خاموش ہو رہا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جنرل یعقوب نے یکم مارچ کو فوجیوں کی آمد کس بنا پر روکی تھی۔

کہیں قتل و غارت کے بعد اور کہیں اس کے بغیر پاکستانی فوج نے چند بڑے بڑے شہروں کو باغیوں کے نرغے سے نکال لیا۔ اس کے بعد مضافات کی طرف توجہ دی گئی اور مختلف فوجی دستے مختلف اطراف میں روانہ کیے گئے۔ ایک دستے کے ساتھ

مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا جس کا آنکھوں دیکھا حال میں آپ کو سناتا ہوں۔ اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ ان دستوں نے اپنا کام کیسے انجام دیا۔ اس ایک واقعے کو تمام واقعات کا نمونہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا، مگر اس سے طریقِ کار اور ذہنی رویّے کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔

یہ فوجی دستہ ایک پلٹن (چھ سو افراد کے قریب) پر مشتمل تھا جس کی دو کمپنیاں ٹرکوں پر سوار تھیں جن کے آگے اور اطراف پر ہلکی اور بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ باقی دو کمپنیاں سڑک کے دونوں جانب کوئی پانچ سو میٹر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تمام انسانی اور غیر انسانی مدافعت کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح لیس تھیں۔ پیدل فوج کے پیچھے پیچھے توپ خانہ تھا جس کی دو بڑی توپیں وقفوں کے بعد دو دو گولے سامنے کی طرف فائر کرتی تھیں تاکہ باغی توپوں کی گھن گرج سن کر پسپا ہوتے جائیں۔

سپاہی اتنے حساس تھے کہ ذرا سے شبہے پر گولی چلا دیتے تھے۔ چلتے چلتے اگر کسی مکان یا درختوں کے جھنڈ سے ذرا سی جنبش ہوتی، تو اس کا جواب ہلکی مشین گن کے ایک برسٹ (BURST) سے دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر ایک جھنڈ میں سرسراہٹ ہوئی، ایک سپاہی نے فوراً گولی داغ دی۔ چند لمحے بعد آگ کی تپش سے بانس کی لکڑی تڑاخ سے پھٹ گئی۔ ہر ایک نے یہی قیاس کیا کہ کسی شرپسند نے جوابی فائر کیا ہے، چنانچہ سارا قافلہ رک کر اس جھنڈ کی تلاشی لی گئی۔ چند سپاہی جھنڈ سے باہر سنگینیں تانے مستعد کھڑے رہے کہ باغی نکلا، تو اس کو ہلاک کردیں گے ـــــ اس میں پندرہ منٹ ضائع ہوگئے۔

ڈھاکہ سے ٹنگیل جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ پڑتا ہے جس کا نام کرائیہ ہے جو گنجان درختوں میں گھرا ہے۔ اس کے ایک طرف نالہ ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے۔ سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ اور ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ قصبہ بالکل اجاڑ پڑا تھا۔ حکم ملنے پر بازار میں پڑے ہوئے مٹی کے تیل کے ڈرم نذرِ آتش کر دیے گئے اور دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ دوسرے مکانوں تک بھی پھیل گئی اور دھواں سبز ٹہنیوں سے بلند ہونے لگا۔ فوجی دستہ اس کے آخری حشر کا انتظار کیے بغیر روانہ ہوگیا۔ جب ہم قصبے کے دوسری جانب پہنچے، تو میری نظر ایک سیاہ میمنے پر پڑی جو کھونٹے سے بندھا آتش زدہ استھان سے بھاگنے کے لیے بے تاب تھا۔ جُوں جُوں وہ آزاد ہونے کے لیے کھونٹے کے گرد چکر لگاتا، اس کے گلے کا رسّا اتنا ہی تنگ ہوجاتا ـــــ حتیٰ کہ وہ چکر کھا کر وہیں گر گیا ـــــ شعلے اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

چند کلو میٹر آگے بڑھے، تو سڑک کے بائیں جانب انگریزی حرف وی (V) کی شکل کی دو خندقیں نظر آئیں۔ وہ بالکل تازہ دکھائی دیتی تھیں جیسے انہیں کوئی ابھی ابھی چھوڑ کر گیا ہو، غالباً کچھ دیر پہلے تک یہاں باغی تھے جو توپوں کی گھن گرج سن کر بھاگ گئے تھے، مگر کدھر؟ اس کی اطلاع دینے کے لیے کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

اس جگہ کو کھنگالے بغیر آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ تھا، چنانچہ سپاہیوں کو حکم ہوا کہ وہ سڑک کے دونوں جانب سارے علاقے کی تلاشی لیں۔ میں نکما کھڑا رہ گیا۔ اس فراغت میں میں گارے کی بنی ہوئی کھلی جھونپڑی میں گھس گیا تاکہ طرزِ رہائش دیکھ سکوں۔ اس میں دو کمرے تھے، ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ چھوٹا کمرہ سٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور بڑا رہنے کے لیے۔ بڑے کمرے میں مٹی کا خوبصورت لیپ کیا گیا تھا اور سامنے کی دیوار پر دو بچّوں کی فریم شدہ تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ دونوں بھائی معلوم ہوتے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چارپائی اور ایک کھجور کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی کے اوپر اُبلے ہوئے چاولوں کا ایک پیالہ تھا جس میں ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ وہ نوالہ چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ کہاں

ایک موٹی سی گالی نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ سپاہیوں نے ایک بڈھے کو تلاش کر کے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی، مگر وہ باغیوں کے متعلق کچھ نہیں اُگلتا تھا۔ سپاہی اسے عدم تعاون کی سزا کے طور پر جان سے مار دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ میں بھی اس کے پاس چلا گیا اور سپاہیوں کو چپ کرایا۔ بنگالی بابا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس کے جسم پر واحد چیتھڑا اس کا ستر ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی سیاہ جلد سالہا سال کی دھوپ میں اور سیاہ ہو گئی تھی اور اس کی ڈاڑھی سیاہ سے سفید ہو چکی تھی۔ میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی۔ میری نظریں اس کے گرد آلود ننگے پاؤں کی سوجی ہوئی رگوں پر آ کر رک گئیں۔ مجھے وہ کسی طور شرپسند یا شرپسندوں کا حامی نظر نہ آیا۔ میرے ہمدردانہ رویئے سے ہمت پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر کہنے لگا:

"تھوڑی دیر پہلے وہ (شرپسند) یہاں تھے۔ وہ کہتے تھے اگر تم نے ہمارے متعلق کسی کو بتایا، تو گولی مار دیں گے۔ اب یہ (پاکستانی) آئے ہیں۔ کہتے ہیں اگر ان کے متعلق نہ بتایا، تو گولی مار دیں گے۔ میں کیا کروں؟ میں کدھر جاؤں؟"

ترس کھا کر بڑے میاں کو زندہ چھوڑ دیا گیا اور قافلہ آگے بڑھا اور چلتے چلتے شام تنگیل پہنچ گیا جہاں سرکٹ ہاؤس پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا رہا تھا۔

پاکستانی فوجیوں نے جا کر وہ پرچم اتار کر اس کی جگہ پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ دونوں توپوں نے بریگیڈیئر صاحب کے حکم پر دو دو گولے مغربی جانب سنتوش (مولانا بھاشانی کی جائے رہائش) کی طرف فائر کیے تا کہ ان سب کو پتہ چل جائے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ فوجی دستے نے دن بھر کی مسافت کے بعد رات تنگیل ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور میں بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں واپس ڈھاکہ چلا آیا۔

ایسی کارروائیوں سے باغی بڑی سڑکوں سے ہٹ کر یا تو دیہی علاقوں میں چلے گئے یا پسپا ہوتے ہوتے سرحد پار کر کے ہندوستان میں چلے گئے۔ ان کے تعاقب یا سرکوبی کا دارومدار دستیاب وسائل یا فوجی نفری پر تھا۔ جب تک وسائل محدود تھے صرف شاہراہوں کو صاف کیا گیا، مگر جب کمک پہنچی تو کارروائی کا دائرہ کار بھی وسیع کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے ۲۵ مارچ تک مشرقی پاکستان میں متعین فوج صرف ۱۴ ڈویژن پر مشتمل تھی، لیکن ۲۶ مارچ سے ۱۸ اپریل تک مزید نفری مغربی پاکستان سے پہنچی۔ اس میں دو ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز (۹ ڈویژن اور ۱۶ ڈویژن)، پانچ بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز، ایک کمانڈو بٹالین اور بارہ انفنٹری بٹالین (پیدل پلٹنیں) شامل تھیں۔ یہ سب اپنے بھاری ہتھیار (توپیں وغیرہ) مغربی پاکستان ہی میں چھوڑ آئے تھے کیونکہ انہیں چند شرپسندوں کی سرکوبی کرنا تھی، کوئی باقاعدہ جنگ تھوڑا ہی لڑنا تھی!

اس کے علاوہ تین پیادہ پلٹنیں اور دو مارٹر بیٹریاں (ہلکی توپیں)، بالترتیب ۲۴ اپریل اور ۲ مئی کو مشرقی پاکستان پہنچیں۔ نیم فوجی لشکر جو ایسٹ پاکستان (رائفلز) کی جگہ لینے کے لیے یکم اور ۲۱ اپریل کے درمیان پہنچا، اس میں ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (ای پی سی اے ایف)، مغربی پاکستان رینجرز (ڈبلیو آر آر) اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے سکاؤٹس شامل تھے۔

جتنی نفری آتی گئی اسے آپریشن سرچ لائٹ کی تکمیل پر لگا دیا گیا۔ یہ آپریشن جو ۲۵ مارچ کی رات کو شروع ہوا اس کے باضابطہ اختتام کا کبھی اعلان نہیں کیا گیا، مگر وسط مئی میں بڑے شہروں اور قصبوں کو عملاً زیر اثر لینے کے بعد یہی سمجھا گیا کہ اس کے مقاصد حاصل

مذکورہ بالا واقعات کے دوران کُل کتنے آدمی مارے گئے؟ ان میں سے کتنے بنگالی اور کتنے غیر بنگالی تھے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ اعداد و شمار اکٹھے نہیں کر سکا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے بنگالیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار ہندسوں میں ہوگی۔ اگر غیر ملکی ذرائع ابلاغ عامہ نے یہ اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے ربابِ عقل و دانش نے ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اکثر صحافی کلکتہ جا کر بیٹھ گئے جہاں وہ سیاحوں کی غیر مصدقہ خبروں اور بھارتی حلقوں کے تخمینوں پر انحصار کرنے لگے۔ مجھے یقین ہے اگر ان صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں رہنے دیا جاتا تو حالات انہیں اتنے گھمبیر نظر نہ آتے جتنے انہوں نے دور بیٹھ کر رنگ آمیزی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔

---

[1] بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو حسب ذیل تاریخوں پر باغیوں سے صاف کیا گیا:

پاکسی (۱۰ اپریل)، پبنہ (۱۰ اپریل)، سلہٹ (۱۰ اپریل)، اشرڈی (۱۱ اپریل)، چندر گھونا (۱۳ اپریل)، راجشاہی (۱۵ اپریل)، ٹھاکر گاؤں (۱۵ اپریل)، کشتیا (۱۶ اپریل)، کشتم (۱۹ اپریل)، چوآڈنگا (۱۷ اپریل)، برہمن باڑیہ (۱۷ اپریل)، دسمنہ (۱۹ اپریل)، چی (۲۱ اپریل)، ستکھیرا (۲۱ اپریل)، گولنڈو (۲۱ اپریل)، دوہزاری (۲۲ اپریل)، پنچ گڑھ (۲۳ اپریل)، رنگپور (۲۴ اپریل)، نواکھلی (۲۶ اپریل)، ستنہار (۲۷ اپریل)، سراج گنج (۲۷ اپریل)، مولوی بازار (۲۸ اپریل)، کاکس بازار (۱۰ مئی)، باتیا (۱۱ مئی)

باب ۱۱

جنرل نیازی کی آمد

۲۶ مارچ کو ڈھاکہ سے غیر ملکی نامہ نگاروں کو نکالنے کا فیصلہ پاکستان کو بہت مہنگا پڑا۔ انہوں نے باہر جا کر مشرقی پاکستان کے متعلق طرح طرح کی خبریں تخلیق کرنی شروع کر دیں جن میں سے بیشتر مبالغے یا غیر مصدقہ اطلاعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج معصوم اور نہتے بنگالیوں کو ناحق موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ اس پروپیگنڈے کا زہر کم کرنے کے لیے میں نے مارچ ۱۹۷۱ء کے آخر میں حکام بالا کو تجویز پیش کی کہ ہمیں برملا اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ مشرقی پاکستان میں متعین تمام بنگالی یونٹیں، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس بغاوت کر چکی ہے اور پاکستان آرمی کو ان مسلح اور منظم باغیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ کہ "معصوم اور نہتے" بنگالیوں کا۔ میری اس تجویز کے عوض مجھے ایک جھاڑ وصول ہوئی جس کا متن یہ تھا: "تم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ پاکستان آرمی کا ڈسپلن ٹوٹ گیا ہے؟ کیا تم ایسی حرکت کر کے آرمی کے ناموس کو بٹہ لگانا چاہتے ہو؟"

تجویز تو میں نے واپس نہ لی، البتہ جھاڑ وصول کر کے خاموش ہو گیا۔ چند ہفتے بعد جب حالات نے حکام کو مجبور کیا، تو انہوں نے ایک برطانوی اخبار کے نمائندے[1] کی خدمات حاصل کر کے اپنا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس مضمون میں سارا زور بیان اس بات پر صرف ہوا کہ بنگالی فوج کی بغاوت کی وجہ سے پاکستانی فوج کو سخت مدافعت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کے نتیجے میں جانی اور مالی نقصان ہو رہا ہے۔

معقول تجویز کے بروقت قبول نہ ہونے کا قلق صرف مجھے ہی نہیں تھا، ایک اور سلسلے میں میجر جنرل راؤ فرمان علی بھی نشانہ بن چکے تھے۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کے چند روز بعد (اوائل اپریل میں) اعلیٰ قیادت کو مشورہ دیا کہ باغی عناصر کے لیے فوراً عام معافی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ (ناکام مدافعت کے بعد) واپس آنا چاہیں آ جائیں۔ انہوں نے اس پر فوری طور پر عمل کرنے کو کہا تاکہ باغی عناصر مستقلاً بھارت کی گرفت میں نہ چلے جائیں۔ اس پر ایک سینیئر جنرل نے طنزاً کہا: "اوہ! ہمیں آپ کی سیاسی چالوں کا پتہ ہے، مگر اب سیاست کا وقت گزر چکا ہے۔" اسی اعلیٰ قیادت کو پانچ ماہ بعد (۴ ستمبر) عام معافی کا اعلان کرنا پڑا، مگر درمیانی عرصے میں گمراہ بنگالی بھارت کی رہنمائی میں "مکتی باہنی" (سپاہِ آزادی) میں بدل چکے تھے۔ بعد میں دورانِ جنگ اس سپاہ نے بھارتی فوج کا کام بہت سہل کر دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

پتہ نہیں وہ کون خوش قسمت تھا (یا تھی) جس کی تجویز کو راولپنڈی والوں نے بروقت قبول کرتے ہوئے ایک اور لیفٹیننٹ

---

[1] مسٹر انتھنی میس کیرنہس جس کے نام سے ایک مفصل مضمون یکم مئی ۱۹۷۱ء کو سنڈے ٹائمز لندن میں شائع ہوا۔

جنرل مشرقی پاکستان بھیج دیا تاکہ وہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کی بھاری ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹا سکے۔ اس وقت گورنر، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور کمانڈر ایسٹرن کمان کے تینوں عہدے ٹکا خان کے پاس تھے۔ موخر الذکر ذمہ داری (سپاہ کی کمان) سنبھالنے کے لیے مغربی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی پہنچے۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں ملٹری کراس اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہلالِ جرأت حاصل کر چکے تھے اور ٹائیگر کے نام سے مشہور تھے۔ غالباً اربابِ اقتدار کا خیال تھا کہ بنگال کے ٹائیگر کو زیر کرنے کے لیے پنجاب کا ٹائیگر بھیجنا ضروری ہے۔ ان کی وہ کمزوریاں جو دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کے بعد منظرِ عام پر آئیں اُس وقت زبان زدِ عام نہ تھیں شاید اس وقت تک ان کی قلعی نہیں کھلی تھی یا لوگ صاحبِ اقتدار شخصیت پر انگلی اٹھا کر مصیبت کو دعوت نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ ۱۰ اپریل کو ڈھاکہ پہنچے اور اگلی صبح کمانڈر ایسٹرن کمان کے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اسی شام اُن کے سرکاری مکان فلیگ اسٹاف ہاؤس میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ شام کو بھی وردی پہنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے کندھے پر لیفٹیننٹ جنرل کے تازہ رینک کا واضح احساس تھا۔ انہیں وردی، رینک اور چھاتی پر تمغے سجانے کا بہت شوق تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کی شخصیت زیادہ باوقار لگتی ہے۔ (یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں) جب انہوں نے مجھے تاکید کی کہ کسی اخباری نمائندے کو لانے سے پہلے میں دیکھ لیا کروں کہ وہ وردی میں ہیں۔ جنرل خادم راجہ نے مجھے بتایا کہ جب وہ فوج کی کمان ان کے سپرد کر چکے تو جنرل نیازی نے پوچھا: "اپنی داشتاؤں کا چارج کب دو گے؟"

چارج لینے کے بعد جنرل نیازی نے اپنے اسٹاف کو خطاب کیا جس میں انہوں نے ماضی کی "فاختاؤں"[1] پر تنقید کی اور بنگالیوں بالخصوص بنگالی دانشوروں اور بنگالی ہندوؤں پر خوب برسے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بنگالی قومیت کو پروان چڑھانے والے یہی لوگ ہیں۔

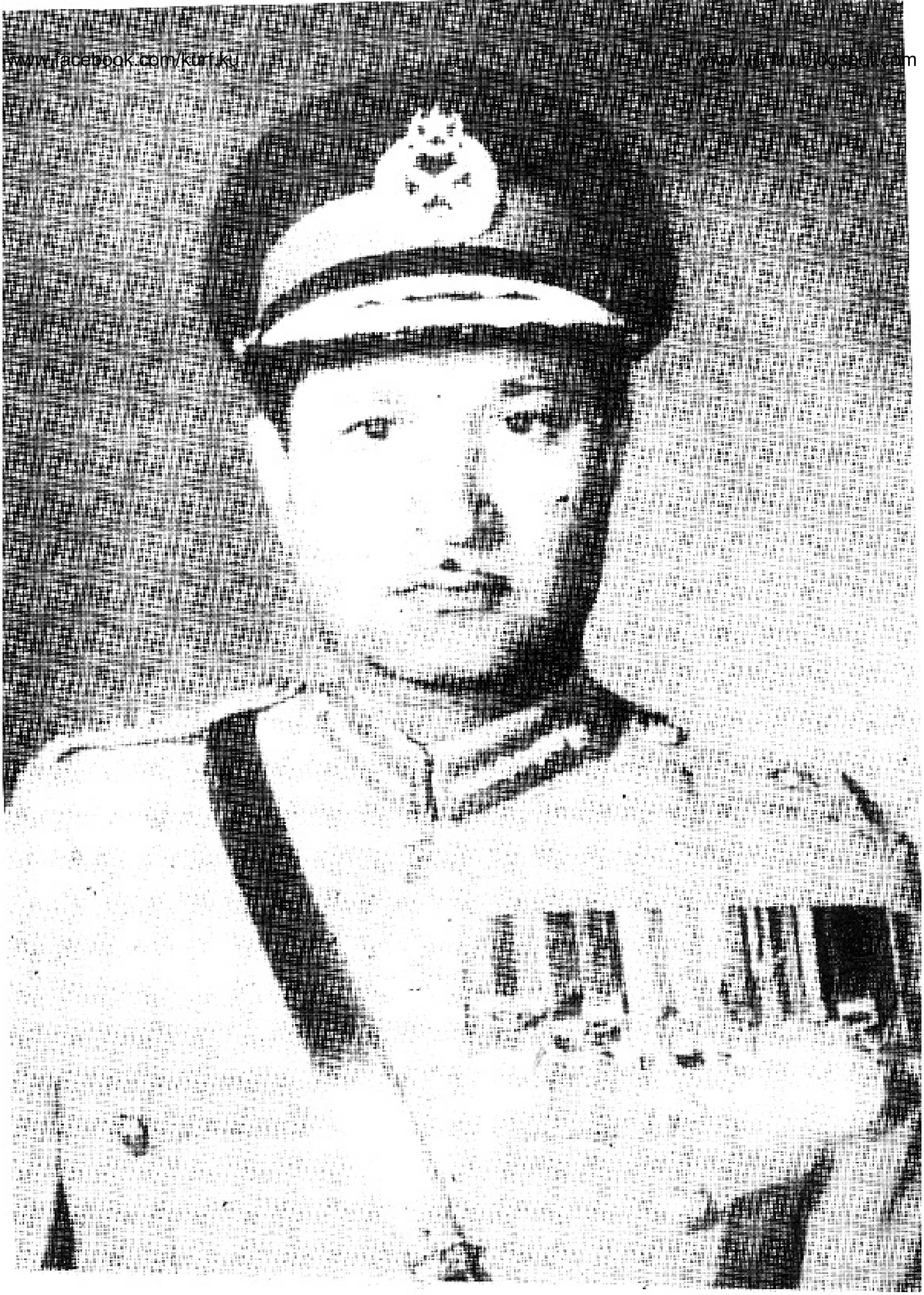
فوجی کارروائی کے بارے میں انہوں نے اپنے پیشرو سے مشورہ کیا اور جس طرح کام چل رہا تھا، دس مئی تک چلنے دیا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب مشرقی پاکستان کا آخری قصبہ (کاکس بازار) دوبارہ ہمارے قبضے میں آیا۔

ماہِ اپریل میں تین میجر جنرل، جنرل نیازی کی اعانت کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ میجر جنرل رحیم (جنرل خادم راجہ والے) ۱۴ ڈویژن کے جی او سی مقرر ہوئے جبکہ میجر جنرل شوکت رضا اور میجر جنرل نذر حسین شاہ کو بالترتیب ۹ ڈویژن اور ۱۶ ڈویژن دیے گئے۔ یہ دونوں ڈویژن تازہ تازہ مغربی پاکستان سے آئے تھے۔ جنرل نیازی نے اپنے تازہ وسائل کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی سرحد جنرل شوکت رضا کو، شمال مغربی علاقہ جنرل نذر حسین شاہ کو اور باقی علاقہ جنرل رحیم کو سونپ دیا۔

اس اضافی طاقت کے ذریعے سارے مشرقی پاکستان میں حکومت کا کنٹرول بحال کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اپریل کے آخر تک بڑے بڑے شہروں سے باغیوں کو نکالا جا چکا تھا اور وسط مئی تک ہر قابلِ ذکر جگہ پر پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی، لیکن یہ کنٹرول طاقت کے بل بوتے پر قائم تھا۔ اس کا دلوں پر حاکمیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کیونکہ موخر الذکر کام کے لیے جن سیاسی و انسانی اقدامات کی ضرورت تھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، بلکہ "عملِ صفائی" (SWEEP OPERATION) کے نام پر مشکوک گھروں

---

[1] فوجی زبان میں فاختہ (DOVE) اور باز (HAWK) کی اصطلاحیں عام ہیں۔ اول الذکر سے مراد ایسے لوگ لیے جاتے ہیں جو صلح جو اور نرم دل ہوں اور موخر الذکر کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنگ جو اور سخت گیر سمجھتے ہیں۔



لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی

کمانڈر، ایسٹرن کمانڈ

پر چھاپے مار مار کر زخموں پر نمک چھڑکنے کا تاثر دیا گیا۔

"عملِ صفائی" بھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ یہ کام جن لوگوں کے سپرد تھا، وہ بنگال اور بنگلہ زبان سے ناواقف تھے۔ وہ گلی نمبر پڑھ سکتے تھے نہ مشتبہ بنگالیوں کو پہچان سکتے تھے۔ انہیں ہر کام کے لیے مقامی لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جن میں سے اکثر کے دلوں میں اب بھی مجیب الرحمٰن بستا تھا۔ وہ اب بھی یہ اُمید سینے سے لگائے بیٹھے تھے کہ کبھی نہ کبھی ان کا "بنگ بندھو" رہا ہو کر ضرور آئے گا ـــــ چنانچہ ان کے رویے میں اگر کھلم کھلا مخالفت نہیں، تو واضح بے اعتنائی ضرور جھلکتی تھی۔

فوج کے ساتھ جن لوگوں نے اس آڑے وقت میں تعاون کیا، ان کا تعلق عموماً دائیں بازو کی جماعتوں سے تھا، مثلاً کونسل مسلم لیگ کے خواجہ خیرالدین، کنونشن مسلم لیگ کے فضل القادر چودھری، قیوم مسلم لیگ کے خان اے۔ صبور، جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غلام اعظم اور نظامِ اسلام پارٹی کے مولوی فرید احمد۔ یہ سب لوگ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ سے شکست کھا چکے تھے۔ جب انہوں نے فوج پر اور فوج نے ان پر انحصار کرنا شروع کیا، تو اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ پٹے ہوئے مُہرے فوج کی سرپرستی میں دوبارہ میدان میں آگئے ہیں۔ میں نے ایک سرکاری اجلاس میں ان کے مفید تعاون کو سراہنے کے بعد عرض کیا کہ ان مٹھی بھر پٹے مُہروں کے بیانات بار بار نشر کرنے کے بجائے اگر ایسے لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے جو سیاسی شخصیت بے شک نہ ہوں، مگر اپنے اپنے حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، تو بہتر ہوگا۔ یہ تجویز فوراً منظور کر لی گئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے حکم سنا دیا گیا کہ "تم سرکردہ شخصیتوں سے بیان حاصل کرو۔"

میں جب اپنی ہی تجویز کے پھندے میں پھنس گیا، تو پتہ چلا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے، کیونکہ جو لوگ بلا جھجک تعاون کرنے کو تیار تھے، وہ "سرکردہ" تھے نہ "باوقار" ـــــ اور جو سرکردہ اور باوقار تھے، وہ آسانی سے تعاون پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سُنیے جو مجھے مشرقی پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس مُرشد سے ملاقات کے دوران پیش آیا۔ میں ان کا "تعاون" حاصل کرنے گلشن کالونی میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ وہ مجھے نہایت شفقت سے اپنے دارالمطالعے میں لے گئے جہاں دنیا بھر کی چیدہ چیدہ کتابیں اور نادر مسوّدے محفوظ تھے۔ انہوں نے ان نوادرات سے میری تواضع کی۔ ساتھ ساتھ اپنی عالمانہ گفتگو سے بھی نوازا اور رہی سہی کسر رومی، سعدی اور اقبال کے اشعار سے پوری کی۔ اس فضا میں میں نے ان سے تعاون کی درخواست کی، تو وہ مجھے پُرپیچ گفتگو کے خارزار میں لے گئے۔ شُستہ گفتگو کرنے والا ملائم شخص یکایک باعثِ دقّت لگنے لگا۔ انہیں گفتگو کے ایک طویل موڑ سے واپس بُلاتے ہوئے جب میں نے اپنی درخواست دُہرائی، تو انہوں نے فرمایا: "مجھے سوچنے دیجیے۔" میں خاموش ہو گیا تا کہ وہ سوچ لیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر عرض کیا، تو فرمانے لگے: "جی ہاں، میں نے کہا نا، مجھے سوچنے دیجیے۔" میں نے کہا: "اچھا، کل حاضر ہو جاؤں گا۔" فرمانے لگے: "نہیں، کل نہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کم از کم تین ماہ چاہئیں تاکہ میں اندازہ کر سکوں کہ آپ لوگوں نے واقعی اپنا اقتدار بحال کر لیا ہے یا نہیں ـــــ ہاں، یہ تو بتایئے آج کل فارلینڈ[1] کہاں ہے؟"

آئندہ سرکاری اجلاس میں جب میں نے اپنی تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا، تو شعبۂ سراغ رسانی سے متعلق ایک صاحب بولے: "یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، ہم آج رات ہی مُرشد کو اٹھا لیں گے اور اس سے حسبِ منشا بیان لے لیں گے" ـــــ صدرِ مجلس کی مداخلت پر جسٹس مُرشد کو اس "عزت" سے محروم رکھا گیا۔

---

[1] امریکی سفیر متعینہ پاکستان

ان میں چند واحد دانشور نہ تھے جو مختلف خطوط پر سوچتے تھے۔ خود حکومت کے زیرِ اقتدار ریڈیو اور ٹی وی میں ایسے بے شمار افراد تھے جن کے دل کے تار کہیں اور جڑے ہوئے تھے۔ دونوں شعبوں کا ایک ایک واقعہ سُن لیجیے۔ آپ کو ان کی ذہنی افتاد کا اندازہ ہو جائے گا۔

ڈھاکہ میں ۲۵ مارچ کی رات کو فوجی کارروائی کے بعد مجھے حکم ملا کہ ریڈیو کو دوبارہ چلایا جائے تاکہ اس کے ذریعے مارشل لا احکام عوام تک پہنچائے جا سکیں۔ میں نے ریڈیو کے عملے سے کہا کہ وہ سازوں پر دھنیں نشر کرتے رہیں تاکہ سامعین کو اندازہ رہے کہ ریڈیو اسٹیشن چل رہا ہے اور جوں جوں مارشل لا کی طرف سے ہدایات آتی جائیں گی، موسیقی بند کر کے نشر کی جائیں گی اور پھر موسیقی کا سہارا لیا جائے گا۔ انھوں نے ان ہدایات کو سُنا اور صدقِ دل سے ان ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب میں چلا آیا تو انھوں نے ماتمی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ واپس آ کر انہیں ٹوکا اور کہا کہ آئندہ سے صرف حمد، نعت اور منقبت وغیرہ نشر کیے جائیں۔ انھوں نے اس حکم پر بھی سرِ تسلیم خم کیا اور یہ نغمہ بار بار نشر کرنے لگے ؎

اے مولا علیؑ، اے شیرِ خدا میری کشتی پار لگا دینا

یاد رہے "کشتی" عوامی لیگ کا انتخابی نشان تھا۔

اسی طرح میں نے ٹیلی وژن کو ہدایت کی کہ وہ قیامِ پاکستان کا پس منظر اُجاگر کرنے کے لیے تحریکِ پاکستان پر مبنی ڈرامے نشر کرے۔ انھوں نے پہلا ڈرامہ "محمد علی جوہر" پر ٹیلی کاسٹ کیا۔ ڈرامے کے شروع میں مولانا جوہر کی تصویر دکھائی گئی لیکن باقی سارے کا سارا ڈرامہ تحریکِ آزادی کے فروغ کی نذر ہو گیا۔ کردار بار بار اس طرح کے مکالمے بولتے تھے: "آزادی کے جذبے کو کبھی دبایا نہیں جا سکتا"۔۔۔ "آزادی قربانیاں مانگتی ہے"۔۔۔ "آزادی کے لیے ماؤں کو اپنے بچّے اور بہنوں کو اپنے بھائی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔"

آزادی کے ان جراثیم کو ختم کرنے کے بجائے حکّام نے "بنگالیوں کو دبائے رکھنے" کی پالیسی کو ترجیح دی۔ انھوں نے "عملِ صفائی" کو وسیع پیمانے پر جاری رکھا جس کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ "محبِّ وطن" بنگالی یا بہاری تھے۔ ان میں سے اکثر نے صدقِ دل سے فوج کے ساتھ تعاون کیا، مگر چند ایک نے ذاتی رنجش یا حماقت کی وجہ سے کئی بے گناہ آدمیوں کو بھی مروا دیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

ایک روز صبح صبح دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی رہنما ایک نوعمر لڑکے کو ساتھ لے کر مارشل لا ہیڈ کوارٹر گئے۔ اتفاقاً برآمدے میں سامنے سے میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے روک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: "یہ لڑکا میرا بھتیجا ہے جو باغیوں کے کیمپ سے بھاگ کر آیا ہے۔ میں اعلیٰ حکّام کو بعض اہم معلومات دینا چاہتا ہوں۔" میں انہیں ایک اعلیٰ حاکم کے پاس لے گیا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ باغی ڈھاکہ شہر کے پاس سے بہنے والے دریا "بوڑھی گنگا" کے پار کرانی گنج کے مقام پر جمع ہیں، لوگوں سے زبردستی روٹی اور پیسے بٹورتے ہیں اور آج رات ڈھاکہ شہر پر حملہ کرنے کی تیّاریاں کر رہے ہیں۔

میں واپس چلا آیا اور اس معتبر محبِّ وطن شہری کی اطلاع پر مزید تصدیق کیے بغیر فوراً فوجی کارروائی کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ کارروائی کے انچارج افسر سے کہا گیا کہ وہ فوراً میدانی توپیں، چھوٹی توپیں، ٹینک شکن توپیں اور مطلوبہ فوجی دستے تیّار کر کے راتوں رات بوڑھی گنگا کے کنارے پہنچ جائے اور طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے حملہ کر کے باغیوں کا صفایا کر دے۔

جب یہ کارروائی شروع ہوئی، میں آپریشن رُوم (OPERATION ROOM) میں تھا جہاں کارروائی کی خبریں اور اطلاعات آرہی تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے مختلف توپوں کی گھن گرج اور بعد میں خودکار ہتھیاروں کے فائر کی آواز سُنی۔ اس کمرے میں موجود کئی افسروں کا خیال تھا کہ ایک بٹالین اور چند توپوں سے شاید یہ معرکہ سر نہ ہو سکے۔ طلوعِ آفتاب تک غیر یقینی کا تاثر غالب رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہ مژدہ سُنایا گیا کہ ہماری بہادر فوج نے کسی جانی نقصان کے بغیر باغیوں کے کیمپ پر قبضہ کر لیا ہے۔

شام کو میری ملاقات اس کارروائی کے انچارج افسر سے ہوئی۔ اس نے جو انکشاف کیا اس سے میرا خون میری رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ کرانی گنج ایک غریب اور معصوم بستی تھی جس میں زیادہ تر بوڑھے، بچّے اور عورتیں تھے۔ انہیں خواہ مخواہ غیر مصدقہ اطلاع پر نشانہ بنا دیا گیا۔ اس سانحے کا بوجھ میں عمر بھر اپنے ضمیر پر لیے پھروں گا۔

اِدھر فوجی کارروائی زوروں پر تھی اور اُدھر ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات یک زبان تھے کہ صوبے میں حالات تیزی سے معمول پر آرہے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب ایک گھر "عملِ صفائی" کی زد میں تھا، تو گھر کا ریڈیو کہہ رہا تھا کہ سب اچھا ہے! اس سے یقیناً سرکاری ذرائع نشر و اشاعت پر سے بنگالیوں کا اعتماد اُٹھ گیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر غیر ملکی نشریاتی اداروں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو —— خواہ وہ نئی دہلی سے بول رہا ہو یا کلکتّہ سے —— بنگالیوں کے ذہن میں زہر گھولنے میں پیش پیش تھا۔ یہ ریڈیو بنگالیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑکانے اور انہیں "اپنی جان، مال اور عزّت کے تحفّظ کی خاطر" اپنا گھر بار چھوڑنے کی ترغیب دے رہا تھا —— بہت سے بنگالی جو ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے کچھ فوجی کارروائی کے ستائے ہوئے تھے اور کچھ آکاش وانی کے پڑھائے ہوئے ——

جن لوگوں نے ان حالات میں بھی اپنے گھروں میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا، انہوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ وہ کسی فوجی افسر یا باوردی فرد سے راہ و رسم پیدا کر لیں کیونکہ خاکی وردی اور پشتو یا پنجابی بولی ذاتی حفاظت اور بقا کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کئی کئی حضرات کسی نہ کسی بنگالی کنبے کی "سرپرستی" میں لگ گئے۔ جس کنبے کو قدرت نے حُسن کی دولت سے نوازا تھا اسے بیک وقت کئی کئی فوجی افسروں کی "سرپرستی" حاصل ہو گئی۔

مَیں بھی ایک متموّل بنگالی گھرانے میں رُوشناس کرایا گیا۔ اس گھر کا مالک ایک مقامی اخبار کا ایڈیٹر تھا، لیکن اتنا مغرور کہ گزشتہ سوا سال کے دوران میں اس نے کبھی سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کی تھی۔ اب وہ سراپا لُطف و کرم بن کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مَیں اس کے ساتھ چلوں تاکہ اس کے اہلِ خانہ کو تحفّظ کا احساس ہو، کیونکہ پڑوس میں "عملِ صفائی" سے ان کے دل دہل گئے ہیں۔ مَیں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کی والدہ، شادی شدہ بہن اور دیگر اہلِ خانہ سے تعارف کرانے کے بعد مجھے ڈرائنگ رُوم میں بٹھا دیا گیا۔ میرا میزبان اور اس کی نوبیاہتا بیوی ساتھ والے صوفے پر براجمان ہوئے۔ میزبان چند لمحوں کی مُہلت مانگ کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے کسی مہمان کو لانے کے بہانے چلا گیا اور مَیں حسین کمرے میں حسین ترحسینہ کے ساتھ اکیلا رہ گیا —— مَیں نے سوچا ان لمحوں کو خاموشی کی نذر کر دینا کفرانِ نعمت ہو گا۔ کیوں نہ چند میٹھی میٹھی باتیں ہو جائیں۔ مَیں نے گفتگو کا آغاز معذرت سے کرتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کل رات آپ کے پڑوس میں . . . ." اس نے چھری کی طرح میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "لاتعداد عورتوں پر مجرمانہ حملے کرنے اور ذاتی املاک کو بے تحاشا تباہ کرنے کے بعد اب تمہارا احساسِ ندامت جاگا ہے . . . " مَیں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر وہ طوفانی انداز میں کہتی چلی گئی: "تمہیں شرم آنی چاہیے اپنے کرتوتوں پر،

مجھے خاکی وردی کے ایک ایک تار سے نفرت ہے، وحشی پن ہر فوجی کے منہ پر رقم ہے . . . . پتہ نہیں میرا خاوند تمہیں یہاں کیوں لے آیا ـــــ تم یقیناً ان درندوں کے قبیلے سے ہو جنہوں نے گزشتہ شب میری بہن کے گھر گھس کر ہر چیز تہس نہس کر دی تھی . . . . "

میں نیم سکتے کے عالم میں اٹھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نفرت کے اس زہر کو ختم یا کم کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مریض کے نفسیاتی علاج کو سراسر نظرانداز کر دیا گیا۔ ۲۵ مارچ کے بعد اگر کوئی تعمیری یا مثبت کام ہوا، تو وہ ریلوے لائنوں کی مرمت، کشتیوں کی آمد و رفت اشیائے ضرورت کی نقل و حرکت، امن و امان کی بحالی وغیرہ تک محدود رہا۔ درحقیقت یہ کام بھی تسلی بخش طور پر پورا نہ ہو سکا، کیونکہ مسائل دیوقامت تھے اور ان سے نپٹنے والے بالشتیے! وہ بنیادی طور پر مسائل کی وسعت اور گہرائی کے ادراک سے محروم رہے۔ ان کی مثال اس چوہے کی سی تھی جو چلتے ہاتھی پر سوار یہ سمجھنے لگے کہ جس حصے پر اس کا قبضہ ہے، وہی ساری کائنات ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔

'ہاتھی' کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے راولپنڈی سے پانچ ہزار افراد پر مشتمل پولیس اور کوئی دو درجن سی۔ایس۔پی افسر بھیجے گئے یہ کمک بھی بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ان کی تربیت ایک باقاعدہ انتظامی شعبے کو چلانے تک محدود تھی جبکہ ضرورت لخت لخت جسم کو یکجا کر کے اس میں نئی روح پھونکنے کی تھی۔ بے شک نوکر شاہی سے مسیحائی کی توقع عبث تھی، یہ کام سیاستدانوں اور مدبّروں کا تھا ـــــ مگر افسوس کہ مارشل لا کے خارزار میں ایسے پھول نہیں کھلا کرتے۔

باب ۱۲

مُکتی باہنی

۱۹۷۱ء کی جس شورش نے ماہ دسمبر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کی، اس کی ابتدا مارچ ہی میں ہو چکی تھی۔ اس کی پُشت پناہی بھارت کر رہا تھا جس کے آثار شروع ہی سے نظر آرہے تھے۔ فوجی کارروائی کے فوراً بعد بھارت نے عملی حمایت درپردہ اور اخلاقی حمایت سرِعام شروع کر دی تھی۔

وزیرِ اعظم اندرا گاندھی نے ۲۷ مارچ کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں ان معزز ارکان کو جنھوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ آیا (مشرقی پاکستان کے بُحران کے متعلق) بروقت فیصلے کیے جائیں گے یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہمارے نزدیک بروقت فیصلوں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ وقت گزر جانے کے بعد فیصلے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"[1] چار روز بعد اسی ایوان نے حسبِ ذیل قرارداد منظور کی:

"یہ ایوان اُن (باغیوں) کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ ان کی جدّوجُہد اور قربانیوں کو بھارت کی بھرپور ہمدردی اور حمایت حاصل رہے گی۔"[2]

اسی روز بھارت کے ایک اہم ادارے[3] کے سربراہ مسٹر اے۔ کے۔ سبرامنیم نے عالمی امور کی بھارتی کونسل کے زیرِ اہتمام مذاکرے میں یہ اعلان کیا:

"بھارت کو اب اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کا مفاد پاکستان کی شکست و ریخت میں ہے۔ اس طرح کا موقع ہمیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔"[4]

اس تقریر کے دوران انھوں نے پاکستان کو بھارت کا دشمن نمبر ایک قرار دیا اور موجودہ بُحران کو "صدیوں میں ایک سُنہری موقع" ٹھہرایا۔

عملی حمایت جو درپردہ جاری تھی، اس کا ایک ثبوت بھارتی بارڈر سیکیورٹی فورس کے وہ سپاہی ہیں جو سرحد سے کئی میل اندر سلہٹ اور جیسور کے علاقوں میں پکڑے گئے۔ بعد میں اسی سرحدی فوج کے انسپکٹر جنرل نے اپنے سپاہیوں کو "باغیوں کے اوّلین سرکاری میزبان" قرار دیا۔ اس کے علاوہ بھارت کی باقاعدہ فوج کے کئی افسر سادہ کپڑوں میں مشرقی پاکستان میں گھس آئے تھے

---

[1] بنگلہ دیش دستاویزات۔ جلد اوّل صفحہ ۶۶۹

[2] ایضاً " " صفحہ ۶۷۲

[3] INSTITUTE OF STRATEGIC STUDIES

[4] ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی۔ مورخہ یکم اپریل ۱۹۷۱ء

اور پاک فوج کے خلاف مزاحمت میں مددگار رہے تھے۔ ان میں سے دو افسروں نے بعد میں اسیری کے دوران بڑے فخر سے اپنے ان کارناموں کا اعتراف کیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھارت، پاکستان کے اندرونی معاملات میں اس حد تک ملوث تھا تو اس نے مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں ـــــ جب پاکستان اندرونی خلفشار کا شکار تھا ـــــ مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے اسے ہڑپ کیوں نہ کر لیا؟ اس کا جواب ہمیں بھارتی مصنف میجر جنرل (ریٹائرڈ) ڈی۔ کے پلیٹ سے ملتا ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بھارتی فوج کے سربراہ نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان دنوں بھارتی فوج تنظیمِ نو کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ پچاس ارب روپے کی لاگت سے پانچ سالہ دفاعی منصوبہ زیرِ تکمیل تھا اور بھارت کی جنگی مشین کو صیقل کرنے کے لیے ابھی اہم اقدامات کرنا باقی تھے۔ اس منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"فوج کی افرادی قوت (منصوبے کے مطابق) ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، کئی یونٹوں کی نفری کم تھی۔ رسالے کے بعض دستوں کا قیام بھی تشنۂ تکمیل تھا۔ انتظامی امور اور نقل و حرکت کے وسائل کو بھی آخری شکل دینا باقی تھا۔ فضائی شعبے میں ہَک ۲۱ لڑاکا طیاروں کی ساخت کا پروگرام عروج پر نہیں پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں فاضل پرزوں کی کمی کے باعث بعض لڑاکا اسکوارڈنوں کی جنگی صلاحیتیں بھی کمزور پڑ گئی تھیں۔ بحریہ میں بھی ساز و سامان کی ترتیبِ جدید زیرِ عمل تھی ـــــ درحقیقت مسلح افواج کو بھرپور جنگ کی تیاری کے لیے چند ماہ کی مدت درکار تھی ـــــ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ توجہ تھا کہ خود بھارت کے اندر اس کے کئی ڈویژن (حالیہ انتخابات وغیرہ کی وجہ سے) امن و امان بحال رکھنے پر مامور تھے۔ اس کی دو ڈویژن فوج مغربی بنگال آ چکی تھی، مگر اس کے بھاری ہتھیار ابھی تک کشمیر میں پڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک ڈویژن ناگالینڈ اور میزو لینڈ (MIZO LAND) میں متعین تھا۔ فضائیہ کو مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے کے لیے اضافی ہوائی اڈے درکار تھے۔ سلچر میں واقع کری گرام کے ہوائی اڈے کو بھی توسیع دے کر جنگ کے لیے تیار کرنا باقی تھا۔"[1]

بھارت سے شائع ہونے والی ایک اور کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر چڑھائی کرنے کے لیے نو ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ کتاب کے دو مصنفین کا کہنا ہے:

"اس کے لیے ہمیں نو مہینوں کی مہلت درکار تھی تاکہ ہم ہر طرح سے تیاری مکمل کر لیں، عالمی رائے عامہ کو ہموار کر لیں اور (چین کی ممکنہ امداد کے خلاف) روس کی یقین دہانی حاصل کر لیں۔ ان اقدامات کے بغیر حملے کا آغاز ممکن نہ تھا۔"

جب ہم خانہ جنگی میں مصروف تھے تو بھارت مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر بھرپور کام کر رہا تھا۔ اس کی مسلح افواج کے سربراہ جلد از جلد اپنی جنگی مشینری کو صیقل کرنے میں لگ گئے۔ وزارتِ خارجہ سفارتی محاذ پر سرگرم ہوئی۔ اس نے روس سے دوستی کے معاہدے

---

[1] THE LIGHTING CAMPAIGN صفحہ نمبر ۴۰-۴۲

[2] "THE LIBERATION WAR" by Mohammad Ayub & Mr. A.K.Subramanyam صفحہ نمبر ۱۷۷

کسی تجویز کو [illegible] نکالا اور ۹ اگست کو روس سے باقاعدہ معاہدہ کرلیا۔ عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے پناہ گزینوں کے مسئلے کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا؛ حالانکہ ان میں سے اکثر خود بھارت کی شہ پر اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

ان تیاریوں کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاک فوج کی جنگی صلاحیتوں کو کند کرنے کے لیے مکتی باہنی کو منظم کیا۔ مکتی باہنی میں ریڑھ کی ہڈی سابق ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے باغی افسر اور سپاہی تھے۔ ہندوستان میں ان کی صفوں میں عوامی لیگ کے رضاکار، یونیورسٹی کے طلبہ اور تنومند پناہ گزین بھی شامل کیے گئے۔ ان کی قیادت کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی۔ عثمانی کے سپرد تھی جو اس کے باقاعدہ کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے تھے۔

باغی فوج کو سیاسی چھاتہ مہیا کرنے کے لیے عوامی لیگ کی مفرور قیادت کو استعمال کیا گیا جو اب کلکتہ پہنچ چکی تھی۔ ان قائدین کو "جلاوطن حکومت" کی شکل دی گئی جس میں تاج الدین، قمر الزماں، منصور علی اور مشتاق احمد خوندکر شامل تھے۔ اس "حکومت" کا مشن یہ تھا کہ مکتی باہنی کی مسلح جدوجہد اور بھارت کی سرپرستی سے بنگلہ دیش کو آزاد کرایا جائے۔

بھارت کے جنگی آقاؤں نے مکتی باہنی کے لیے حسبِ ذیل تین مقاصد مرتب کیے :

سب سے پہلے

وہ سارے مشرقی پاکستان میں پھیل کر پاک فوج کے ساتھ جھڑپوں کا آغاز کرے تاکہ موخر الذکر کی نقل و حرکت معطل ہو کر رہ جائے اور وہ حفاظتی اقدامات کے لیے متعلقہ علاقوں میں مقید ہو کر رہ جائے۔

اس کے بعد

گوریلا کارروائیوں کو رفتہ رفتہ تیز کر کے پاکستانی افواج کے مورال کو کمزور کیا جائے

تاکہ

آخر کار

اگر پاکستان اس چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر کھلی جنگ پر مجبور ہو جائے تو یہی مکتی باہنی بھارت کی باقاعدہ فوج کے لیے "مشرقی فیلڈ فورس" کا کام دے سکے۔"[1]

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک بھارتی جرنیل کی نگرانی میں مکتی باہنی کو تربیت دی گئی۔ شروع شروع میں تربیت صرف چار ہفتوں تک محدود تھی جس میں تخریبی کارروائیاں کرنے، کمین گاہوں پر گولیاں برسانے، دستی بم پھینکنے اور رائفل چلانے کی مشق کرائی گئی۔ بعد میں تربیت کی مدت بڑھا کر آٹھ ہفتے کردی گئی اور مذکورہ کاموں کے علاوہ تمام ہلکے ہتھیاروں کی تربیت دی گئی۔ اس طرح تیس ہزار افراد کو تربیت دے کر ایک منظم اور مسلح فوج تیار کی گئی اور اسے بھارت کی باقاعدہ فوج کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے کے انتظامات کیے گئے۔ ان کے علاوہ ستر ہزار مزید افراد کو گوریلا جنگ کی تربیت دے کر مشرقی پاکستان میں بھیجا گیا۔

مارچ کی فوجی کارروائی اور دسمبر کی باقاعدہ جنگ کے دوران ہونے والی گوریلا جنگ اور تخریب کاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

---

[1] پریم چوپڑا کی کتاب INDIA'S SECOND LIBERATION صفحہ نمبر ۱۵۵

پہلا دَور (جون اور جولائی) اس عرصے میں مکتی باہنی نے اپنی کارروائیوں کو سرحدی علاقوں تک محدود رکھا جہاں اسے سرحد پار سے بھارتی فوج کی اخلاقی اور مادّی امداد ملتی رہی۔ اس دَور میں باغیوں میں زیادہ جرأت نہ تھی۔ وہ عموماً چھوٹی موٹی حرکتیں کرکے سرحد پار بھاگ جاتے اور جہاں کہیں خطرے کی بُو آتی فوراً غائب ہوجاتے۔ ان کی زیادہ تر توجہ چھوٹی چھوٹی پلیاں اُڑانے، متروکہ ریلوے لائن پر سُرنگیں بچھانے اور ایک آدھ دستی بم پھینکنے پر مرکوز رہی۔

دُوسرا دَور (اگست۔ ستمبر) اب ان کی تربیت اور طریقِ کار خاصا بہتر ہوگیا — ان کی ذاتی جرأت اور قائدانہ صلاحیّتوں میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اب وہ فوجی قافلوں اور کمین گاہوں پر حملے کرنے، بحری جہازوں کو ڈبونے اور اہم سیاسی شخصیّتوں کو قتل کرنے لگے۔ ان کارروائیوں میں ڈھاکہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔

تیسرا دَور (اکتوبر۔ نومبر) اب وہ سرحدی علاقوں اور صوبے کے اندر بھی بہت مستعد ہوگئے۔ سرحدی چوکیوں پر بھارتی توپ خانے کی مدد سے باقاعدہ حملے کرتے اور اہم شہروں میں مؤثر تخریبی کارروائیاں کرتے۔ اس عرصے میں انہوں نے بعض سرحدی علاقوں میں گھس کر مورچے کھود لیے جہاں سے انہیں نہ ہٹایا گیا۔ بعد ازاں باقاعدہ جنگ کے دوران یہ مورچے بھارتی فوج کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

مذکورہ تین ادوار میں نہ صرف مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیوں میں شدّت بڑھتی گئی بلکہ اس کا دائرۂ کار بھی وسیع ہوتا گیا۔ اس سے پوری طرح عُہدہ برآ ہونے کے لیے مکتی باہنی کے تربیتی کیمپوں میں بھی بتدریج اضافہ کیا گیا۔ شروع میں ان کی تعداد تیس تھی جو اگست میں چالیس ہوگئی اور ستمبر میں پورا سو تک پہنچ گئی۔ ہر کیمپ میں ایک تربیتی مدّت کے دوران پانچ سو سے دو ہزار افراد کو تربیت دینے کی گنجائش تھی۔ تمام کیمپوں سے تربیت پانے والوں کی کل تعداد ایک لاکھ تھی۔

ان شرپسندوں اور باغیوں کے لیے ہتھیار اور دوسرا جنگی سامان حاصل کرنے میں بھارت کو شروع شروع میں دقّت کا سامنا کرنا پڑا، مگر رُوس سے "معاہدۂ دوستی" کے بعد یہ مشکل حل ہوگئی۔ فنِ حرب سے متعلق ایک مطالعاتی اور تجزیاتی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق رُوسی حکومت نے بھارت کو یقین دلایا کہ مکتی باہنی کو دیے گئے ہتھیاروں کی جگہ مزید ہتھیار دیے جائیں گے، تو بھارت نے باغیوں کو اسلحے کی سپلائی میں اضافہ کردیا۔[1] اس کے علاوہ ایک برطانوی خاتون صحافی نے جو تازہ تازہ مشرقی یورپ سے آئی تھیں، مجھے بتایا کہ "مشرقی یورپ میں دوسری جنگِ عظیم کے متروک رُوسی اسلحے کے ڈھیر لگے ہیں اور وہ اب بھارت کو منتقل کیے جارہے ہیں۔" ہتھیار حاصل کرنے کا ایک اَور ذریعہ براہِ راست خریداری تھا جو "بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت" بھارت اور رُوس کی مدد سے غیر ملکی منڈیوں سے خریدتی تھی۔ اس کے لیے "بنگلہ دیش" کے غیر سرکاری سفیر انگلستان اور امریکہ میں فنڈ اکٹھے کرتے تھے۔

یہ تو تھا سرحد کے اُس پار جنگی تیاریوں کا حال! آیئے دیکھیں کہ اس چیلنج سے نپٹنے کے لیے پاکستان کے وسائل کیا تھے؟

---

[1] NEWS REVIEW ON PAKISTAN

مشرقی پاکستان میں پاکستان کے ۱۲۶۰ افسر اور ۴۱۰۶۰ سپاہی متعین تھے جن کے ذمے ۵۵۱۲۶ مربع میل علاقے کا دفاع تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے مشہور گوریلا لیڈر ٹی۔ای۔لارنس نے اپنی کتاب[1] میں لکھا ہے کہ ہر چار مربع میل قطعۂ اراضی کی حفاظت کے لیے بیس سپاہی درکار ہوتے ہیں۔ لارنس نے یہ تناسب صحرائی جنگ کے تناظر میں مقرر کیا تھا جہاں حدِ نگاہ کافی دُور تک جاتی ہے مگر مشرقی پاکستان میں وافر درختوں اور سبزے کی وجہ سے حدِ نظر خاصی محدود تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں تھوڑے علاقے کے لیے زیادہ نفری درکار تھی —— لیکن اگر ٹی۔ای۔لارنس کے فارمولے سے بھی اندازہ لگایا جائے تو مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے ۲۷۵۶۳۰ افراد درکار تھے، یعنی دستیاب وسائل سے تقریباً سات گُنا زیادہ! ایک غیر ملکی صحافی ڈیوڈ لوشک نے مطلوبہ تعداد کا کم از کم اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار لگایا تھا۔[2]

ان نامساعد اور صبر آزما حالات کے باوجود فوج نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پُورے آٹھ مہینے اپنے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ اس نے اہم ضلعی ہیڈ کوارٹرز اور سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز سمیت تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو مکتی باہنی سے محفوظ رکھا۔ تین سو ستّر سرحدی چوکیوں میں سے دو سو ساٹھ چوکیوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔

فوج نے اپنی کارروائی کے لیے بڑے بڑے شہروں میں اپنا اڈّہ یا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا جہاں سے فوجی دستے گرد و نواح کے علاقوں میں باغیوں کی سرکوبی اور تخریبی کارروائیوں کی روک تھام کے لیے جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں یہ فوجی بڑی پُھرتی اور مستعدی سے نقل و حرکت کرتے اور باغی ان کا مقابلہ کیے بغیر بھاگ جاتے۔ بعد میں تھکاوٹ کے آثار اُبھرنے لگے اور ہمارے فوجی صرف اُسی وقت کارروائی کرتے جب یہ ناگزیر ہو جاتی، خواہ مخواہ اصلی یا نقلی تخریب کاروں کا پیچھا نہ کرتے۔ تیسرے مرحلے (اکتوبر — نومبر) میں وہ عموماً اپنے ہیڈ کوارٹر سے چپک کر رہ گئے اور باہر نکل کر خطرہ مول لینے سے گریز کرنے لگے۔ شورش کے ان آٹھ مہینوں کے مختلف ادوار کا گراف بنایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جُوں جُوں مکتی باہنی کی کارروائیاں بڑھتی گئیں، ہماری دفاعی کارروائیاں کم ہوتی گئیں —— بلکہ یُوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جُوں جُوں ہماری کارروائیاں گھٹنے لگیں، مکتی باہنی کی حرکتیں تیز اور مؤثر ہونے لگیں۔

ان کارروائیوں کے مدوجزر کے ساتھ ساتھ بنگالی عوام کا رویّہ بھی بدلتا رہا۔ وہ عموماً جیتنے والی ٹیم کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہمارے فوجی باغیوں کو مار بھگاتے، تو مقامی لوگ ان کا دَم بھرنے لگتے، لیکن جونہی وہ واپس ہیڈ کوارٹر آجاتے اور باغی متعلقہ علاقوں میں گُھس آتے، تو بنگالی اپنے نئے آقاؤں کو خوش آمدید کہتے۔ بعض افراد اتنے ہوشیار تھے کہ انہوں نے بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں ممالک کے قومی پرچم تیار رکھے تھے اور حسبِ ضرورت ایک جھنڈا اپنے مکان پر لہرا دیتے تھے —— صحیح وقت پر صحیح جھنڈے کا صحیح مقام پر ہونا عموماً دافعِ بلا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن سبھی بنگالی اتنے خوش قسمت یا ہوشیار نہ تھے کہ وہ مُرغِ بادنما بن کر اپنی جان بچا لیتے۔ ان میں سے کئی پاک فوج اور مکتی باہنی کی آویزش میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہُوں :

ماہ اگست میں ضلع نواکھلی کے ایک علاقے سے اطلاع ملی کہ وہاں مکتی باہنی نے مصیبت ڈھا رکھی ہے۔ ایک نوجوان

---

[1] SEVEN PILLARS OF WISDOM صفحہ ۱۹۲

[2] PAKISTAN CRISIS صفحہ ۱۳۰

افسر کو سات سپاہیوں سمیت ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا اور چلتے وقت اسے ہدایت کی گئی کہ وہ طاقت کے بجائے "سلیقے اور لچک" سے کام لے کر اس علاقے کو تخریب کاروں سے پاک کرے۔ سلیقے اور لچک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے وہ سات میں سے پانچ سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اطلاع ملنے پر ایک اور کپتان کو کمک دے کر روانہ کیا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ باغی وافر اسلحے ایمونیشن کے ساتھ مورچہ بند ہیں اور باقاعدہ معرکہ آرائی پر تلے ہوئے ہیں۔ دقت یہ تھی کہ ان کے مورچے ایک گاؤں میں واقع تھے جہاں سویلین لوگ بھی بستے تھے۔ نوجوان کپتان نے دور سے کئی بار انتباہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا؛ چنانچہ اس نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے کر چاروں طرف سے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔ دھوئیں کے بادلوں کے ساتھ چیخیں بھی بلند ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی سفید جھنڈا اٹھائے باہر نکلا اور امن کی بھیک مانگنے لگا۔ اس کی درخواست فوراً قبول کر لی گئی، لیکن اتنے میں کئی بے گناہ جانیں ضائع ہو گئیں۔

یہ تو تھا باغیوں کو پناہ دینے والوں کا حشر! جو بنگالی پاک فوج سے تعاون کے "مرتکب" پائے جاتے ان کا حشر کہیں زیادہ عبرتناک ہوتا۔ انہیں نہ صرف ہلاک کر دیا جاتا، بلکہ بعض اوقات ان کی لاشیں درختوں سے ٹانگ دی جاتیں۔

ان حالات میں اہم مسئلہ یہ تھا کہ باغیوں کو معصوم شہریوں سے کس طرح الگ کیا جائے۔ ایک موقع پر جنرل ٹکا خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ سرحد سے ملحق دو میل کی پٹی کو آبادی سے خالی کرا لیا جائے تاکہ جو مشتبہ شخص نظر آئے اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔ ٹکا خاں نے یہ تجویز رد کر دی اور وجہ یہ بتائی کہ اس سے آباد کاری کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا عام معافی کے اعلان کے بعد بھارت سے پناہ گزین بھی لوٹنا شروع ہو جائیں گے جن کی آباد کاری بذاتِ خود بہت بڑا مسئلہ ہو گا۔ سرحدی علاقہ خالی کرا کے اضافی سردردی کیوں مول لی جائے؟

چنانچہ بنگالی عوام اور باغیوں کا باہمی ربط قائم رہا۔ وہ ایک جیسے کپڑے پہنتے اور ایک جیسے خدوخال رکھتے تھے، اس لیے یہ شناخت کرنا مشکل تھا کہ کون معصوم ہے اور کون شرپسند! واحد علامت ہتھیار تھا جو بآسانی چھپایا یا اٹھایا جا سکتا تھا، کیونکہ وہاں اونچی اونچی گھاس، موسمی فصل یا جنگلی سبزہ بہت تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنیئے:

خبر ملی کہ شرپسند راجشاہی کے علاقے روحانپور میں داخل ہو کر لوگوں کو روٹی، رہائش اور نقد رقم دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ فوجیوں کی ایک ٹولی اس گاؤں کی چھان بین کے لیے روانہ کی گئی۔ تلاش کے باوجود کسی شرپسند کا سراغ نہ ملا؛ البتہ ایک کھیت میں کام کرتے ہوئے تین کسان نظر آئے لیکن بے ضرر کسانوں کو چھیڑنا مناسب نہ تھا؛ لہٰذا وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو ایک باریش شخص سے ان کی اچانک ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اسے پکڑ کر پوچھ گچھ شروع کی، مگر اس نے کوئی مدد نہ کی۔ اسے سنگین دکھا کر دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے شرپسندوں کا اتہ پتہ نہ بتایا، تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس نے تینوں کسانوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہیں فوراً حراست میں لے لیا گیا اور ان کی نشاندہی پر اسی کھیت میں سے متعدد گرینیڈ، دھماکا خیز بم اور بنگلہ دیش کے پرچار کے لیے مطبوعہ اشتہار حاصل کیے گئے۔ یہ تینوں مکتی باہنی کے سرگرم رکن نکلے۔

پاک فوج کو دھوکہ دینے کے لیے باغیوں نے اور بھی کئی ہتھکنڈے اختیار کیے۔ مثلاً جیسور سیکٹر میں بینا پول اور راگوناتھ کے درمیان دو پاکستانی سپاہی گشت کر رہے تھے۔ سامنے سے ایک مفلوک الحال شخص آتا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا تھا۔ تھیلے سے باہر سبزی دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے یونہی بھبک ماری اور چلا کر پوچھا: "کون ہو تم؟" تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

اس کے پچھلے کی تلاشی لی گئی تو اس میں سے تخریبی کارروائی کے لیے ٹائم فیوز اور دیگر سامان نکلا۔ اسی طرح ایک بار [illegible] فرنٹ نے دریائے برہم پترا کے پاٹ سے ایک کشتی پکڑی جس پر بظاہر موسمی پھل لدے ہوئے تھے، لیکن اندر بارودی سرنگیں اور گرینیڈ بھرے تھے۔

علاوہ ازیں مدافعت سے بچنے کے لیے باغی عموماً کچے راستوں سے آتے جاتے تھے جبکہ فوجی اکثر پکی سڑکیں استعمال کرتے تھے۔ رنگپور سے ایک باغی نے سرحد پار اپنے ایک رفیق کار کو خط لکھا: "پاک فوج ہمیں کبھی نہیں پکڑ سکتی، کیونکہ وہ عام شاہراہوں، کشتیوں کے اڈوں اور بڑے بڑے گھاٹوں کی رکھوالی میں مصروف رہتی ہے جبکہ ہم متروک راستے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ کشتی کی تلاشی لیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی نچلی سطح میں کیا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عموماً امام مسجدوں اور امن کمیٹی کے ارکان کے گھروں پر نظر نہیں رکھتے جبکہ یہی ہماری پناہ گاہیں ہیں۔ ہمارا طریقۂ کار مکارانہ، مگر ہمارا مقصد عظیم ہے یقیناً فتح ہماری ہوگی۔"

وقت گزرنے کے ساتھ تخریب کاری کی تکنیک میں بھی نفاست آتی گئی۔ مثلاً شروع میں وہ بوبی ٹریپ[1] اور سیفٹی والو[2] استعمال کرتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ ہم ان سے بچنے کی تدبیر پا گئے ہیں (ہم عموماً فوجی قافلے کے آگے خالی چھکڑا یا ریل گاڑی کا خالی ڈبہ چلا دیتے تھے)، تو تخریب کاروں نے دور سے کنٹرول کیے جانے والے (REMOTE CONTROL) اور بجلی سے چلنے والے دھماکہ خیز بم استعمال کرنے شروع کر دیے جن کی مدد سے وہ چلتی گاڑی کو حسب منشا اڑا سکتے تھے۔ اسی طرح وہ پہلے ڈائنامائٹ ساتھ لاتے تھے مگر بعد ازاں ڈرائی بیٹری سیل استعمال کرنے لگے کیونکہ انہیں ٹارچ وغیرہ میں بآسانی لایا جا سکتا تھا۔

بحری علاقوں میں انہوں نے اپنے طریقۂ کار کو بہتر بنایا۔ پہلے وہ بارودی سرنگ وغیرہ کسی ساکن جہاز یا کشتی سے باندھ جاتے تھے، مگر بعد میں لیمپٹ مائن استعمال کرنے لگے جس کے منہ پر مقناطیس لگا ہوتا جو ٹارگٹ کے قریب آ کر خود بخود اس سے چپک جاتا اور مطلوبہ وقت پر پھٹ جاتا تھا۔ جب یہ کام بھی ناکافی لگا تو انہوں نے بھارت کے تربیت یافتہ غوطہ خور بھیجنے شروع کیے جو زیر آب تیرتے ہوئے جہاز وغیرہ کے پاس آتے اور اس سے تباہ کن سرنگ چپکا کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ بھارت نے ایسے تین سو غوطہ خور تیار کیے تھے۔ زیادہ عرصہ زیر آب رہنے کے لیے وہ عموماً بانس یا نرکل کی نالی سطح آب پر رکھتے جس سے سانس لینے میں سہولت رہتی۔ بعض اوقات وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بانس یا کیلے کے تنے سے بارودی سرنگ باندھ دیتے جو اپنی مقناطیسی قوت کی وجہ سے ٹارگٹ سے خود بخود لگ جاتی۔

تخریب کاروں کی کارکردگی کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کے ہاتھوں مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہونے والی چیزوں میں چند جہاز، ۲۳ پل، ریل کی ۱۲۲ پٹڑیاں اور بجلی کی ۹۰ تنصیبات شامل ہیں۔

اتنا زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے جس جذبے کی ضرورت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جو راجشاہی کے علاقے روہانپور میں ماہ جون میں پیش آیا۔ تخریب کاری کے شعبے میں ایک نوجوان بنگالی کو پکڑ کر کمپنی ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا۔ اس سے

---

[1] BOOBY TRAP: کسی چیز سے دھماکہ خیز یا تباہ کن مواد اس طرح باندھ دیا جائے کہ اسے ہلاتے ہی پھٹ پڑے۔

[2] SAFETY VALVE: تخریب کاری کی ایسی ترکیب جس میں تخریب کار دور رہ کر بھی تباہ کن دھماکہ کر سکتا ہے۔

پوچھ گچھ کی گئی مگر اس نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا جب سب ہتھکنڈے بے اثر ثابت ہوئے تو مجبر نے اپنی اسٹین گن اس کے سینے پر رکھ کر کہا: "بتاؤ؛ ورنہ گولیاں تمہارے سینے سے پار ہو جائیں گی"۔ وہ نیچے جھکا' زمین کو بوسہ دیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: "اب میں موت کی آغوش میں جانے کو تیار ہوں، میرا خون اس مقدس سرزمین کو یقیناً آزادی سے ہمکنار کرے گا"

پاک فوج کو نہ صرف ایسے جذبے کا سامنا تھا، بلکہ اس کی مشکلوں میں بنگالی موسم کا بھی بہت دخل تھا۔ خاص طور پر موسم برسات بہت کڑا تھا۔ کیونکہ ہمارے سپاہی عموماً پنجاب یا صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے تھے اور پیراکی یا کشتی رانی سے نابلد تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض کو "آبی جنگ" کی تربیت دی گئی تھی، مگر وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو پانی کے خوف سے آزاد نہ کر سکے۔ اس کے برعکس تخریب کار مچھلی کی طرح پانی سے مانوس تھے اور وہ کبھی تیر کر اور کبھی کشتی میں بیٹھ کر اپنا کام کر جاتے تھے۔ کئی دفعہ ان کے تعاقب میں ہمارے سپاہیوں کی کشتی یا تو خود بخود الٹ گئی یا تخریب کاری کا نشانہ بن گئی۔ بعض جگہوں پر وہ شرپسندوں کے تعاقب میں پیدل پانی یا دلدل میں گھس جاتے جہاں سمندری گھاس یا جونکیں ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتیں۔ میں نے لیفٹیننٹ شاہد کو دیکھا جس کی ٹانگوں پر جونکوں کے ان گنت زخم تھے۔ یہ زخم جنگ کے بعد بھی ایک عرصے تک مندمل نہ ہوئے۔

فوجی کارروائیوں کے دوران بعض فوجی لوٹ مار، قتل و غارت اور آبروریزی کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان معدودے چند اشخاص کی حرکتوں سے پوری فوج کی رسوائی ہوئی۔ آبروریزی کی کل نو وارداتوں کی اطلاع ملی اور نو کے نو مجرموں کو عبرتناک سزائیں دی گئیں، مگر ان سزاؤں سے رسوائی کا داغ نہ دھویا جا سکا۔ مجھے ایسے واقعات کی مجموعی تعداد کا اندازہ نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ایک واقعہ بھی ساری فوج کو رسوا کرنے کے لیے کافی تھا۔

ان غیر ذمہ دارانہ حرکات نے بنگالی عوام کو بدظن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ ہم پہلے بھی ان کے چہیتے نہ تھے لیکن ان واقعات سے وہ ہم سے سخت نفرت کرنے لگے۔ اس نفرت کو کم کرنے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہ کی گئی، لہٰذا مشرقی پاکستان کی اکثر آبادی ہم سے کٹی رہی۔ صرف "اسلام پسند عناصر" نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم سے تعاون کیا۔

ان اسلام پسند اور محب وطن عناصر کو دو گروہوں میں منظم کیا گیا۔ عمر رسیدہ افراد پر مشتمل امن کمیٹیاں قائم کی گئیں اور صحت مند نوجوانوں کو رضاکار بھرتی کر لیا گیا —— یہ کمیٹیاں ڈھاکہ کے علاوہ دیہی علاقوں میں بھی قائم کی گئیں اور ہر جگہ فوج اور مقامی لوگوں کے درمیان رابطے کا مفید ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان کمیٹیوں کے چیئرمین اور ارکان شرپسندوں کے غصے کا کئی بار ہدف بنے اور ان میں سے ۲۵۰ افراد شہید، زخمی یا اغوا ہوئے۔

رضاکاروں کی تنظیم کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ان سے پاک فوج کی افرادی قوت میں اضافہ ہوگا اور دوسرے مقامی لوگوں میں دفاع وطن میں شرکت کا احساس پیدا ہوگا۔ اس تنظیم کی مطلوبہ نفری ایک لاکھ تھی، مگر ان میں سے بمشکل پچاس ہزار افراد کو فوجی تربیت دی جا سکی۔ ستمبر کے مہینے میں پی پی پی کا ایک وفد ڈھاکہ گیا اور اس نے جنرل نیازی سے شکایت کی کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے کارکنوں پر مشتمل نئی فوج کھڑی کر لی ہے۔ جنرل نیازی نے مجھے بلا کر کہا کہ آئندہ سے رضاکاروں کو "الشمس" اور "البدر" کے نام سے پکارا کرو تا کہ پتہ چلے ان کا تعلق صرف ایک پارٹی سے نہیں —— میں نے تعمیل ارشاد کی۔

"البدر" اور "الشمس" رضاکاروں نے پاکستان کی سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ وہ ہر وقت پاک فوج کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ انہیں جو کام سونپا جاتا وہ پوری ایمانداری —— اور بعض اوقات جانی قربانی —— سے ادا

گئے۔ اس تعاون کی پاداش میں تقریباً پانچ ہزار رضا کاروں یا ان کے زیرِ کفالت افراد نے شرپسندوں کے ہاتھوں نقصان اٹھایا۔ ان کی بعض قربانیاں رُوح کو گرما دیتی ہیں، مثلاً نواب گنج تھانے میں واقع ایک گاؤں گالپور میں شرپسندوں کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا جس کی رہنمائی کے لیے ایک رضا کار ان کے ساتھ گیا۔ مشن کامیاب رہا اور باغیوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا لیکن جب وہ واپس اپنے گاؤں پہنچا، تو پتہ چلا کہ شرپسندوں نے اس کے تین بیٹوں کو شہید اور اس کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔

اسی طرح کماسپور (راجشاہی) میں ایک پُل کی حفاظت کے لیے ایک رضا کار تعینات تھا۔ اسے باغیوں نے آدبوچا اور سنگینیں مار مار کر مجبور کرنے لگے کہ "جئے بنگلہ" کا نعرہ لگاؤ، مگر وہ آخری دم تک "پاکستان زندہ باد" کہتا رہا۔

رضا کار اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے مکتی باہنی سے کمزور تھے۔ ان کو بمشکل دو سے چار ہفتوں کی ٹریننگ دی گئی تھی جبکہ مکتی باہنی آٹھ ہفتوں کی بھرپور تربیت حاصل کر چکی تھی۔ اوّل الذکر کے پاس ۳۰۳ کی دقیانوسی رائفلیں تھیں جبکہ موخر الذکر نسبتاً جدید ساز و سامان سے لیس تھے ۔۔۔۔۔ اس تفاوت کی وجہ سے رضا کار شاذ و نادر ہی شرپسندوں کا مقابلہ کرتے، چنانچہ انہیں عموماً پاک فوج کے ساتھ ہی کسی مشن پر روانہ کیا جاتا اور اپنے طور پر کوئی مُہم ان کے سپرد نہ کی جاتی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکتی باہنی کا مقابلہ پاک فوج کو کرنا پڑا جس نے نامساعد حالات میں بڑی تندہی سے اپنے فرائض کو پورا کیا۔ ان حالات میں جس چیز کا سب سے بُرا اثر مورال پر پڑا، وہ شہیدوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال تھی۔ جو لوگ سرحدی علاقوں میں زخمی ہو جاتے تھے انہیں پیچھے ہسپتالوں میں منتقل کرنے میں یہ دقّت تھی کہ چوکیوں کو جانے والے تمام راستوں میں شرپسندوں نے یا تو بارودی سُرنگیں بچھا رکھی تھیں یا گھات سے ان پر چلنے والے ٹریفک پر فائر کرتے تھے، اس لیے زخمیوں کو نکالنے کا واحد ذریعہ ہیلی کاپٹر تھا جس کے استعمال پر یہ شرط عائد تھی کہ پہلے متعلقہ رجمنٹ کا ڈاکٹر یہ تصدیق کرے کہ واقعی زخمی کی حالت اتنی خراب ہے کہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسے نکالنا ضروری ہے۔ یہ ڈاکٹر عموماً سرحدی چوکی سے میلوں پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا ہوتا اور اس کے لیے سرحدی چوکی تک پہنچنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا زخمی کو وہاں سے واپس لانا۔

جو خوش قسمت کسی نہ کسی طور سی ایم ایچ میں پہنچ جاتے، ان کی حالت دیکھی نہ جاتی۔ کسی کے اعضا سرے سے غائب ہوتے اور کسی کا چہرہ بُری طرح مسخ ہوتا۔ کوئی کانوں سے معذور ہو چکا ہوتا اور کوئی آنکھوں سے محروم! ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بچ تو گئے تھے، مگر ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو کر رہ گئے۔

جہاں تک شہدا کا تعلق ہے، شروع میں ہم انہیں فضائی راستے سے مغربی پاکستان بھیجتے رہے، لیکن جولائی، اگست میں جب ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا، کیونکہ اس سے مغربی پاکستان میں غیر ضروری خوف و ہراس پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ انہی دنوں چیف آف جنرل سٹاف ڈھاکہ تشریف لائے۔ تازہ پالیسی سے مورال متاثر ہونے کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی گئی۔ انہوں نے فرمایا: "مُردہ بے کار ہے، خواہ وہ مشرقی پاکستان میں ہو یا مغربی پاکستان میں۔"

شہدا کے وارث بہر طور چاہتے تھے کہ ان کے عزیزوں کی لاشیں انہیں پہنچائی جائیں۔ مجھے وہ خط یاد ہے جو ایک شہید کی بہن نے ۳۱ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا: "آپ جب کراچی سے روانہ ہوئے تو میں نے اپنا گبھرو بھائی آپ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اگر آپ اسے صحیح سالم واپس نہیں لا سکتے، تو اس کی لاش بھجوانا نہ بھُولیے گا۔" یہ بہن پھر کبھی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکی ۔۔۔۔۔ زندہ یا زندۂ جاوید!

باب ۱۴

ٹکّا خاں کی واپسی

مشرقی پاکستان میں شورش بپا رہی اور یحییٰ خاں راولپنڈی میں بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا وہ ۲۵ مارچ کی فوجی کارروائی کا حکم دے کر طویل ذہنی رخصت پر چلے گئے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ افواجِ پاکستان نے خُون پسینے سے جو اہلیت حاصل کی ہے اس سے فائدہ اُٹھا کر حالات کو سدھارنے کے لیے کوئی قدم اُٹھائیں۔ کیا وہ مشرقی پاکستان کے انجام سے مایُوس ہو چکے تھے؟

یحییٰ خاں کی بے عملی کی کئی توضیحات کی گئی ہیں' ان میں سے بعض سیاسی تجزیے پر مبنی ہیں اور بعض محض قیاس آرائیاں! ایک توضیح یحییٰ خاں کے وزیر پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری نے مہیا کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "ان مہینوں میں یحییٰ خاں ذہنی طور پر ماؤف نظر آتا تھا اور مجھ سے بات کرنے سے بھی کتراتا تھا۔"[1] چودھری صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یحییٰ خاں اتنے حساس طبع تھے کہ انہیں فوج کی بربریت سے گہرا صدمہ پہنچا تھا اور وہ حیران تھے کہ وہ اس کی تلافی کس طرح کریں۔

اس کے برعکس یحییٰ خاں کے عملے کے ایک میجر جنرل نے مجھے بتایا کہ جُون میں یحییٰ خاں نے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنایا اور وہ راولپنڈی سے روانہ بھی ہُوئے' مگر کراچی میں اس "گُڑیا" کے چنگل میں ایسے پھنسے کہ ڈھاکہ جانا بھول گئے (غالباً ان کا اشارہ اس خاتون کی طرف تھا جس کی قربت سے صدرِ مملکت راحت پاتے تھے)۔

یحییٰ خاں کے ٹولے کے ایک سینئر رُکن نے بالواسطہ طور پر یحییٰ خاں کے ڈھاکہ نہ آنے کی وجہ یہ بتائی: "جب تک ان بنگالیوں کے ہوش ٹھکانے نہیں لگ جاتے' ہم ان سے بات نہیں کریں گے۔" آخری وضاحت خود یحییٰ خاں سے ملتی ہے جو انہوں نے ایک صحافی کو دی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا: "جب بھی مَیں ڈھاکہ جانے کا ارادہ کرتا ہُوں میرا سٹاف اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے وہاں جانے سے سُود مند نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔"

یحییٰ خاں اگر چاہتے تو ڈھاکہ گئے بغیر بھی ضروری اقدامات کر سکتے تھے' مگر انہوں نے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جس سے صورتِ حال پر خوشگوار اثر پڑتا۔ مارچ والی فوجی کارروائی اور دسمبر کی جنگ کے درمیانی عرصے میں یحییٰ خاں نے صرف دو فیصلے کیے۔ ایک جنرل ٹکّا خاں کی تبدیلی اور دوسرے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان۔ کہا جاتا ہے پہلا اقدام انہوں نے بعض مُلکی اور غیر مُلکی بہی خواہوں کے اصرار پر اُٹھایا تھا' کیونکہ ان کے خیال میں جب تک مشرقی پاکستان کی باگ ڈور ٹکّا خاں کے ہاتھ میں ہے وہاں حالات سدھر نہیں سکتے۔ یحییٰ خاں نے اس تجویز کو تسلیم کرنے کے بعد سب سے پہلے جناب نورالامین کو صوبائی گورنر کا عہدہ پیش کیا' مگر انہوں نے خرابیٔ صحت

---

[1] متحدہ پاکستان کے آخری ایام۔ از پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری۔ صفحہ ۱۵۔

ان بنا پر یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر نگاہِ انتخاب ڈاکٹر اے ایم مالک پر پڑی جو تعلیم کے لحاظ سے دندان ساز پیشے کے لحاظ سے سیاست دان اور عملی طور پر مزدور رہنما تھے۔ انہوں نے یحییٰ خاں کی پیش کش قبول کر لی۔

یحییٰ خاں کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ٹکا خاں کو گورنری سے ہٹا کر جنرل نیازی کی جگہ کمانڈر ایسٹرن کمانڈ بنا دیا جائے یا نیازی کی موجودگی میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے تاکہ صوبے میں تین بڑی شخصیتیں ہو جائیں۔ ڈاکٹر مالک گورنر کی کرسی پہ۔ جنرل ٹکا خاں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی گدی پہ اور جنرل نیازی سپہ سالار کی مسند پہ ـــ لیکن جنرل یحییٰ خاں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور مشرقی پاکستان ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کے سپرد کر دیا۔

جنرل ٹکا خاں اپنی اچانک علیحدگی پر خوش نہ تھے؛ اس کا اظہار ان کے رویے سے بار بار ہوتا تھا۔ انہیں یکم ستمبر کی شام کو آفیسرز میس میں الوداعی پارٹی دی گئی جس میں چھاؤنی کے سینیئر افسروں نے شرکت کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جنرل نیازی نے ٹکا خاں کو خراج پیش کرنا شروع کیا۔ ٹکا خاں گم سم کرسی میں دھنسے سنتے رہے۔ جب وہ جوابی تقریر کرنے کے لیے اُٹھے تو انہوں نے فرمایا:

"مجھے ۷ مارچ کو اچانک راولپنڈی میں بلا کر نئی ذمے داریاں سنبھالنے کا حکم دیا گیا۔ اب دفعتاً مجھے یہ ذمہ داریاں ڈاکٹر مالک کے حوالے کرنے کو کہا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہوا ہے؛ مگر صدر کے فیصلے پر تبصرہ کرنا میرے لیے مناسب نہیں۔ آپ بھی مکمل صورتِ حال سے واقفیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو منجدھار میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میری خواہش تھی جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر جاؤں مگر بڑوں کی مرضی! بہر حال آپ حوصلہ رکھیں؛ آپ کے کمانڈر (جنرل نیازی) بڑے تجربہ کار ہیں؛ وہ آپ کی مناسب رہنمائی فرمائیں گے؛ البتہ ایک بات یاد رکھیے کہ حالات پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دینا' ورنہ یہاں آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

اگلی صبح انہیں الوداع کہنے کے لیے ہم ایئرپورٹ پہنچے۔ صرف سرکاری افسر موجود تھے۔ مجھے ان کی روانگی کا منظر دیکھ کر ان کی آمد کا سماں یاد آ گیا جب ۷ مارچ کی زرد پیلی سہ پہر کو وہ ہشاش بشاش؛ تازہ دم اور پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جہاز سے اُترے تھے۔ آج ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

ٹکا خاں کی روانگی کے اگلے روز (۳ ستمبر) سہ پہر کو نئے گورنر نے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ اس تقریب میں معززین شہر، اعلیٰ سرکاری افسروں اور سفارتی سربراہوں نے شرکت کی۔ اسی موقع پر بعض سیاست دان مثلاً خان اے صبور خاں، فضل القادر چودھری اور سابق گورنر عبدالمنعم خاں بھی نظر آئے۔ تقریب کے دوران میری نگاہ ڈاکٹر اے ایم مالک کے نحیف بدن؛ ڈھلکے ہوئے چہرے اور دھندلائی ہوئی آنکھوں پر مرکوز رہی اور میں سوچتا رہا کہ اس مردِ پیر کا حوصلہ کتنا جوان ہے کہ اس نے اپنے ذمے وہ کام لے لیا ہے جو ٹکا خاں سے نہیں ہو سکا (اور انہیں تبدیل کرنا پڑا)۔

ڈاکٹر مالک کے گورنر بننے سے ڈھاکہ میں کشیدگی اور تناؤ کی فضا خاصی حد تک کم ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کسی غیر کی جگہ گھر کا ایک فرد آ گیا ہے۔ اگرچہ بنگالی عوام ڈاکٹر مالک سے ایسی عقیدت نہ رکھتے تھے جو انہیں حسین شہید سہروردی؛ مولوی فضل الحق یا خواجہ ناظم الدین سے تھی؛ مگر وہ ٹکا خاں کی نسبت انہیں یقیناً زیادہ قابلِ قبول تھے۔ انہوں نے اپنی تقرری کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد بیت المکرم میں نمازِ جمعہ ادا کی جہاں جنرل ٹکا خاں نے کبھی قدم رنجہ نہ فرمایا تھا۔

غیر بنگالی بالخصوص بہاری آبادی میں جنرل ٹکا خاں کے جانے سے عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ ان کا خیال تھا ٹکا خاں کے جانے

سے شر پسند اور تیز ہو جائیں گے اور غیر بنگالی آبادی کی جان، مال اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی ۔ مجھے یاد ہے ۴ ستمبر کو ایک بہاری اخبار نویس نے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں مجھے ٹیلیفون کیا تو میں نے اسے کہا کہ اب تو بنگالی گورنر آ گیا ہے تمہیں سول انتظامیہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۔ اس نے جواب دیا "کون سی سول انتظامیہ سالک صاحب! ہمارا گورنر تو مغربی پاکستان چلا گیا ہے ۔"

دوسرے اہم سیاسی فیصلے یعنی عام معافی کا اعلان ۴ ستمبر کو ہوا۔ اس اعلان کے مطابق تمام زیر حراست شر پسندوں کو رہا کر دیا گیا سوائے ان لوگوں کے جن پر فردِ جرم عائد کی جا چکی تھی ۔ اگرچہ یہ بنیادی طور پر اچھا فیصلہ تھا لیکن اتنی دیر سے کیا گیا کہ اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی کیونکہ ستمبر تک تمام باغی بھارتی تسلط میں جا چکے تھے اور ان میں سے اکثر ان کے ہاتھوں تربیت لے کر مکتی باہنی میں شامل ہو چکے تھے اب ان سے پیچھے مڑنے کی توقع رکھنا عبث تھا؛ البتہ اگر یہ فیصلہ اپریل کے آغاز میں ہوتا تو اس کے مفید نتائج نکل سکتے تھے کیونکہ ان دنوں عوامی لیگ کے تقریباً نوے رہنما ابھی تک صوبے کے اندر تھے اور ذاتی تحفظ کی ضمانت پر سامنے آنے اور حکومت سے تعاون کرنے کے لیے تیار تھے لیکن اب "کلکتہ منتقل ہو کر جلاوطن حکومت" سے عہد ایفا کر چکے تھے ۔۔۔ اس کے علاوہ گوریلا جنگ اور تخریبی کارروائیوں سے بہت سے مفرور بنگالیوں کو امید ہو چلی تھی کہ حالات کا پلڑا ان کی طرف جھک رہا ہے اور وہ جلد یا بدیر مجیب الرحمن کی رہائی اور وطن کی آزادی جیسی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے ۔

عام معافی کے حکم کے تحت ۲۰۰ افراد کو رہا کر دیا گیا ۔ ان میں سے ۱۱۹ قیدیوں کو میرے سامنے جودیب پور (جہاں ۲ ای بی نے پاکستانی فوجیوں اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا تھا) کی کوٹھڑیوں سے نکالا گیا ۔ یہ وہ "شر پسند" تھے جنہیں جانچ پڑتال کے بعد "سفید" (بے ضرر) قرار دیا جا چکا تھا ۔ مزید ۸۱ قیدی دوسرے مقامات پر چھوڑے گئے جو انٹیلی جنس کی اصطلاح میں "سیاہی مائل سفید" (یعنی مشتبہ مگر بے ضرر) سمجھے جاتے تھے ۔ کچھ قیدی ڈھاکہ میں بھی رہا کیے گئے ۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مکتی باہنی کے کسی رکن یا مفرور سیاسی رہنما نے "معافی کے اعلان" سے فائدہ نہ اٹھایا سوائے ان معنوں میں کہ بعض شر پسند وطن پلٹنے والے پناہ گزینوں کا لبادہ اوڑھ کر آزادانہ مشرقی پاکستان میں داخل ہونے لگے ۔ وہ یا تو اسلحہ، بارود، گرنیڈ اور بارودی سرنگیں اپنے ساتھ لاتے تھے یا اندر داخل ہو کر مقررہ جگہ سے یہ چیزیں حاصل کر لیتے تھے ۔

حکومت نے وطن واپس آنے والوں کے لیے سرحدوں کے ساتھ ساتھ "استقبالیہ کیمپ" قائم کیے جہاں راشن، نقدی اور طبی امداد کا اہتمام تھا مگر ان کیمپوں میں بہت کم لوگ آئے ۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا اعتماد بحال نہیں ہوا تھا ۔ وہ ہماری ان خبروں کو محض پراپیگنڈہ سمجھتے تھے کہ حالات معمول پر آ گئے ہیں اور بھارت کے اس پراپیگنڈے کو حقیقت گردانتے تھے کہ واپس جانے سے ان کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی ۔

بعض بنگالی یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اعلانِ معافی کا اطلاق مجیب الرحمن پر بھی ہوگا ۔ اس امید کو تقویت ان افواہوں سے ملی کہ غیر ملکی طاقتیں مجیب کی رہائی کے لیے یحییٰ خاں پر دباؤ ڈال رہی ہیں ۔ ان قیاس آرائیوں کو مزید ہوا جنرل یحییٰ کے ایک با اعتماد جنرل نے ڈھاکہ میں ایسے سوال پوچھ کر دی کہ "اگر مجیب الرحمن کو جسمانی طور پر ٹھکانے لگانے کے بجائے سیاسی طور پر ختم کر دیا جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؟" انہوں نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ مجیب الرحمن متحدہ پاکستان سے وفاداری کے عہد پر دستخط کرنے کو تیار ہے مزید سوال کیا کہ "آیا اس سے نام نہاد تحریکِ آزادی کی ہوا نہیں نکل جائے گی؟" میں نے عرض کیا کہ "اول تو مجیب کے انجام کے بارے میں جنرل یحییٰ خاں پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں اب وہ اس سے کیسے پھر سکتے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ

مجیب رہائی کے بعد پھر قلابازی نہیں کھائے گا؟" مزید بحث سے جان چھڑاتے ہوئے جنرل صاحب نے فرمایا: "ارے بھئی! میں تو یونہی بحث برائے بحث کے طور پر آپ سے بات کر رہا تھا تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔"

درحقیقت یہ محض بحث برائے بحث نہ تھی۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی ہاتھ کار فرما تھا کیونکہ میں نے ایک معتبر شخص سے سنا کہ ایک دوست ملک نے پاکستان اور "بنگلہ دیش" کے نمائندوں کی بیرونِ ملک ملاقات کروائی ہے اور یحییٰ خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ مجیب الرحمٰن کی جاں بخشی کر دیں گے مگر وقت کا تعین ان پر چھوڑ دیا جائے۔

انہی دنوں ایک جرمن صحافی بھٹو سے ملاقات کے بعد ڈھاکہ پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مغربی پاکستان میں ایک نیا سیاسی تصفیہ زیرِ غور ہے اور بھٹو نے مجھے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر وہ اقتدار میں آ گئے تو مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیں گے کیونکہ مجیب کو سزا دینے کا وعدہ یحییٰ خاں نے کر رکھا ہے، بھٹو نے نہیں۔"

نئے سیاسی سمجھوتے کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ان ۷۸ نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا جو عوامی لیگ کے مفرور ہونے سے خالی ہوئی تھیں۔ ضمنی انتخابات کرانے کی ذمہ داری میجر جنرل راؤ فرمان علی کو سونپی گئی۔ انہوں نے اسے دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں کو نوازنے کا ذریعہ سمجھا جو گزشتہ چند مہینوں سے فوج سے تعاون کر رہی تھیں؛ چنانچہ انہوں نے ان جماعتوں کو اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کرنے کو کہا۔ انہوں نے درج ذیل بولی دی:

پاکستان جمہوری پارٹی	۴۶
جماعتِ اسلامی	۴۴
کونسل مسلم لیگ	۲۶
کنونشن مسلم لیگ	۲۱
نظامِ اسلام پارٹی	۱۷
میزان	۱۵۴

مختلف جماعتوں کی طرف سے ۱۵۴ سیٹوں کا مطالبہ کیا گیا جب کہ خالی نشستیں ۷۸ تھیں۔ سب کو مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ یحییٰ خاں کا حکم تھا کہ نورالامین (پاکستان جمہوری پارٹی) کو زیادہ سیٹیں دی جائیں تاکہ وہ مرکز میں مخلوط حکومت بنا سکیں۔

جنرل فرمان علی ابھی "مانگ" اور "رسد" میں تناسب کا حساب لگا رہے تھے کہ جنرل پیرزادہ کا حکم ملا: "قیوم لیگ کو کم از کم اکیس اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اٹھارہ نشستیں دی جائیں۔" اس پر جنرل فرمان علی نے کہا: "اس طرح میرے پاس دائیں بازو کی مقامی جماعتوں کو مطمئن کرنے کے لیے گنجائش باقی نہیں رہے گی۔"

"اچھا، تو پی پی پی کے لیے اٹھارہ کے بجائے تیرہ سیٹیں کر دو۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یحییٰ خاں تین سیاست دانوں ـــــ یعنی نورالامین، بھٹو اور قیوم خاں ـــــ کو بیک وقت وزارتِ عظمیٰ کا جھانسہ دے رہے تھے۔ پتہ نہیں اس ڈرامے کے مرکزی کردار مغربی پاکستان میں کیا کھیل کھیل رہے تھے، لیکن مشرقی پاکستان میں یہ تاثر عام تھا کہ ضمنی انتخابات سراسر ڈھونگ ہیں۔

ضمنی انتخابات میں اپنی جماعت کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ایک ریٹائرڈ ایئر مارشل ڈھاکہ تشریف لائے۔ یکم نومبر کو شام ساڑھے پانچ بجے ایک اخبار نویس کے ہمراہ میری ان سے ملاقات ہوئی جو خاصی دیر جاری رہی۔ انہوں نے ضمنی انتخابات کے متعلق جب میری رائے پوچھی تو میں نے عرض کیا: "انٹر کانٹی نینٹل کی یخ بستہ فضا میں ٹھہرنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ آپ باہر نکل کر عوام کی بے کسی کا ملاحظہ کریں۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ ظلم و ستم میں پسے ہوئے عوام کو ضمنی انتخابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں تو اپنی بقا کی فکر کھائے جا رہی ہے کیونکہ وہ باری باری پاک فوج، مکتی باہنی اور رضاکاروں کے عتاب کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ۔ ۔"

"اگر مسئلہ اتنا ہی گمبھیر ہے تو تمہارے خیال میں اس صورت حال سے کون نجات دلا سکتا ہے؟"

"میرے خیال میں یہ جرنیلوں، فیلڈ مارشلوں اور ایئر مارشلوں کے بس کی بات نہیں۔ اس وقت ملک کو ایک ایسے بلند قامت سیاسی مدبر کی ضرورت ہے جو پوری قوم کو یکجا کر سکے۔"

"میرے خیال میں تو اس کا حل مجیب الرحمٰن ہے جس کی رہائی بلا تاخیر عمل میں آنی چاہیے۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

"مگر وہ تو غدار ہے۔ یہ سب اسی کا تو کیا دھرا ہے؟"

"اگر تمہاری افواج تمام قاتلوں کو (اعلانِ معافی کے ذریعے) بخش سکتی ہیں تو انہیں مجیب کی رہائی کا کڑوا گھونٹ بھی حلق سے اتار لینا چاہیے کیونکہ اس نے کسی ایک شخص کو بھی اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ مغربی پاکستان، مجیب الرحمٰن کی رہائی کی خبر سننے کے لیے تیار ہے۔"

چند روز بعد وہ مجیب الرحمٰن کے بیوی بچوں کو دلاسہ دے کر واپس مغربی پاکستان چلے گئے۔

جب دوسرے سیاست دان ضمنی انتخابات کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، بھٹو بار بار اصرار کر رہے تھے کہ اقتدار بلا تاخیر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی بنا پر عوامی نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ ملک کو در پیش بحران کے پیش نظر کرسی کا یہ مطالبہ کئی لوگوں کو بے وقت کی راگنی لگا مگر بھٹو کے حامی کہہ رہے تھے کہ قیادت کے بحران کا واحد حل انتقالِ اقتدار ہے۔

جنرل یحییٰ نے غیر سرکاری طور پر بھٹو کو اقتدار میں یوں شامل کر لیا کہ انہیں آٹھ رکنی وفد کا قائد بنا کر عوامی جمہوریہ چین بھیج دیا۔ اس وفد کے دوسرے ارکان میں پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خاں اور فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن شامل تھے۔ یہ وفد نومبر کے شروع میں پیکنگ پہنچا اور چینی قائدین سے برصغیر کی تازہ صورت حال کے متعلق بات کی۔ وہاں سے روانگی سے قبل بھٹو نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا: "(ان مذاکرات سے) پاکستان کے خلاف جارحیت کی روک تھام ہو گئی ہے[1]۔" اس سے یحییٰ خاں کے چند روز پہلے کے اعلان کی تصدیق ہوتی تھی جس میں کہا گیا تھا: "پاکستان پر حملے کی صورت میں چین ہماری مدد کرے گا۔"

۱۹ نومبر ۱۹۷۱ء کو میں عید کے موقع پر چند روز کے لیے راولپنڈی آیا تو میری ملاقات وفد کے ایک قریبی ذریعے سے ہوئی جس نے چینی مدد کے بارے میں میرے سوال کے جواب میں کہا: "ہاں چینی ہمارے عظیم دوست ہیں۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

سنا ہے غیر ملکی حمایت کی تلاش میں جن دروازوں پر دستک دی گئی ان میں واشنگٹن بھی شامل تھا۔ وہاں بھی امریکہ کو وہ دو طرفہ معاہدہ یاد

---

[1] روزنامہ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی۔ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۷۱ء

دلایا گیا جو اس نے پہلے مارشل لا سے قبل (چھٹے عشرے میں) کیا تھا۔ وہاں سے جو جواب ملا وہ بھی چینی جواب سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان دو عظیم طاقتوں کے بارے میں پروفیسر جی ڈبلیو چودھری لکھتے ہیں:

"یحییٰ خاں نے مجھے نکسن اور چینی قائدین سے اپنی خط کتابت دکھائی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بنگالیوں سے سیاسی تصفیے کے آرزو مند تھے۔ [1]"

بھارت نے بھی انہی دنوں اپنی سفارتی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں لیکن اسے ہماری نسبت زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے پہلے ہی روس سے "معاہدۂ دوستی" کر لیا تھا جو درحقیقت ایک دفاعی معاہدہ تھا جس کی شق نمبر ۸ اور شق نمبر ۹ کے ذریعے بھارت کسی وقت بھی روس سے فوجی مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس معاہدے کے دفاعی پہلوؤں کی تصدیق بھارتی جنرل ڈی۔ کے۔ پلیٹ کے مضمون مطبوعہ ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے لکھا: "اس معاہدے میں فوجی مقاصد بھی پنہاں ہیں۔"

جوں جوں افق پر جنگ کے بادل گہرے ہوتے گئے، اس معاہدے کے تحت بھارت اور روس کے درمیان باہمی تعاون کی رفتار بڑھتی گئی۔ پہلے روس کے نائب وزیر خارجہ نکولائی فروبین کی قیادت میں ایک پانچ رکنی وفد دہلی آیا، پھر روسی فضائیہ کے سربراہ کی سرکردگی میں ایک اور چھ رکنی وفد بھارت پہنچا اور آخر میں روسی وزیر دفاع مارشل گریچکو خود تشریف لائے اور جنگی تیاریوں کا بنفس نفیس جائزہ لیا۔ انہی دنوں یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ دہلی میں ایک "دفتر رابطہ" قائم کیا گیا ہے جس میں روسی ماہرین اور ہوا باز مستقل طور پر متعین کیے گئے ہیں۔

بھارت کا اصل گٹھ جوڑ تو روس سے تھا مگر اس نے دیگر اہم ممالک کی حمایت کو بھی نظر انداز نہ کیا؛ چنانچہ وزیراعظم اندرا گاندھی ۲۴ اکتوبر کو امریکہ، انگلستان اور مغربی جرمنی روانہ ہوئیں۔ ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اگر وہ ان ممالک کو بھارت کی حمایت پر آمادہ نہیں کر سکتیں تو کم از کم انہیں پاکستان کی مدد کرنے سے باز رکھ سکیں گی۔ وہ یقیناً اپنے موخر الذکر مقصد میں کامیاب ہوئیں۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان مسلح تصادم کے روز افزوں امکانات کو ساری دنیا تشویش کی نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر تباہی کو روکنے کے لیے کوئی مثبت اقدامات نہیں کیے جا رہے تھے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھبیسویں اجلاس میں اندرونی معاملات میں بھارتی مداخلت کے خلاف پاکستان کی شکایات پر غور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کم کرنے کے لیے وہاں اقوام متحدہ کے مبصرین متعین کر دیے جائیں۔ پاکستان نے عالمی برادری کا یہ فیصلہ مان لیا مگر بھارت نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ فی الحقیقت بھارت کو ایسی کوئی تجویز نہ بھاتی تھی جو حالات کو سدھارنے کے لیے مفید ثابت ہو سکے، کیونکہ اگر حالات سدھر گئے تو صدیوں کا سنہرا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا!

---

[1] متحدہ پاکستان کے آخری ایام۔ از جی ڈبلیو چودھری۔ صفحہ ۱۹۰

باب ۱۴

بحران کی دہلیز پر

مُلکی اور غیر مُلکی سیاست سے بحرانی صورت ذرا نہ سُدھری۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ یُوں لگتا تھا ان کا رُخ پہلے سے متعین ہو چُکا ہے اور اب دھارا اسی رُخ پر بہتا رہے گا۔ خود ڈھاکہ میں زندگی خاصی تلخ ہو گئی تھی۔ مشکل ہی سے کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب لُوٹ مار، آتش زنی، سیاسی قتل یا بم پھٹنے کی کوئی نہ کوئی واردات نہ ہوتی۔ مثلاً ۲۲ اکتوبر کو دن دہاڑے مشرقی پاکستان کے سابق گورنر منعم خاں کو ان کے گھر میں ہلاک کر دیا گیا۔ چند روز بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کی حدود میں ایک صوبائی وزیر کی کار کو بھک سے اُڑا دیا گیا۔ پھر چوری کی ایک کار میں آتشیں مادّہ لاد کر اسے موتی جھیل کے کمرشل ایریا میں کھڑا کر دیا گیا اور وقتِ مقررہ پر یہ سارا مادّہ پھٹ پڑا جس سے پانچ افراد ہلاک اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ اگلے روز اسٹیٹ بنک کی پُرشکوہ عمارت میں بم پھٹا۔ اس سے اگلے روز گورنر ہاؤس کے ساتھ والی عمارت میں ٹیلی وژن اسٹیشن کی بالائی منزل کو آگ لگ گئی۔

یہ واقعات اپنی جگہ پر بہت اہم تھے، مگر جب روزمرّہ کا معمول بن گئے، تو لوگوں نے ان میں دلچسپی لینا بند کر دی؛ چنانچہ تخریب کاروں نے مقامی اور غیر مُلکی لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے انٹر کانٹی نینٹل کو منتخب کیا۔ وہاں غسل خانے میں معقول مقدار میں آتشیں مادّہ رکھ کر اسے آگ لگا دی جس سے ہوٹل کا مقبول ترین حصّہ دھڑام سے گر پڑا۔ کئی ہفتوں تک مرمّت کا کام جاری رہا اور ہر آنے جانے والا پُوچھتا "یہ کیا ہُوا ہے؟" یُوں بالواسطہ طور پر مکتی باہنی کی تشہیر ہوتی رہی۔

۱۱ اکتوبر کو تخریب کاروں نے اپنی کارروائیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ وہ ڈھاکہ شہر میں چھوٹی توپیں (مارٹرز) لے آئے۔ اس کا اندازہ مجھے ۱۱ اکتوبر اور ۱۱ اکتوبر کی درمیانی رات کو شہر سے چھاؤنی کی طرف جاتے ہوئے ہُوا۔ جب میں ہوائی اڈّے کے پاس پی آئی اے بکنگ کے نزدیک پہنچا تو یکے بعد دیگرے دو بم فائر ہونے کی گونج سُنائی دی۔ مَیں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی؛ ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ مَیں نے جیپ دیوار کی آڑ میں کھڑی کر دی اور دھماکوں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ ان کا رُخ کدھر ہے؟ "تفتیش" پر معلوم ہُوا کہ شہر کے شمالی حصّے سے مارٹر کے گولے ہوائی اڈّے اور چھاؤنی کے ملحقہ حصّے پر پھینکے گئے ہیں لیکن مارٹر میں نشانہ باندھنے کے لیے سائٹ (SIGHT) نہ ہونے کی وجہ سے بم ٹارگٹ سے دُور جا گرے ہیں۔ اس تجربے سے مقامی انتظامیہ کو یقیناً تشویش لاحق ہُوئی، کیونکہ آئندہ "سائٹ" حاصل کر کے بم نشانے پر بھی پھینکے جا سکتے تھے۔

ڈھاکہ کے مضافات میں تخریب کاروں کے کئی گڑھ تھے کیونکہ "عمل صفائی" (SWEEP OPERATION) شہروں تک محدود ہونے کی وجہ سے یہ علاقے باغیوں کے لیے نسبتاً محفوظ تھے۔ مضافات کے حال کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا لیجیے:

ڈھاکہ سے باہر سدھیر گنج پاور ہاؤس تھا جہاں سے بجلی کے تار مختلف اطراف کو جاتے تھے۔ تخریب کاروں نے یہ تار کاٹ کر

بجلی منقطع کردی۔ مرمت کے کام کے لیے مغربی پاکستان سے واپڈا کا عملہ منگوایا گیا جس میں دو اسسٹنٹ انجینیئر، ایک لائن سپرنٹنڈنٹ، ایک فورمین اور ایک لائن مین شامل تھے۔ یہ جماعت ۳۰ اکتوبر کو کام میں مصروف تھی کہ مکتی باہنی نے ان پر دن دہاڑے حملہ کر کے پانچوں کے پانچوں افراد کو موقع ہی پر ہلاک کر دیا۔ ایک کی لاش (اسسٹنٹ فورمین بدرالسلام) وہ ٹرافی کے طور پر ساتھ لے گئے، باقی چار لاشیں اگلے روز پانچ بجے شام مغربی پاکستان روانہ کر دی گئیں۔

ڈھاکہ اور اس کے مضافات سے صوبے کے باقی حصوں کی طرف جاتے ہوئے اکثر احساس رہتا کہ ہم دشمن کے علاقے (ENEMY TERRITORY) سے گزر رہے ہیں، لہٰذا ہر شخص عموماً اپنے ساتھ حفاظتی دستہ رکھتا۔ بعض اوقات اس حفاظتی دستے پر بھی راستے میں فائرنگ ہوتی مگر اکا دکا باغی اسے دیکھ کر روپوش ہو جاتے۔ اگر کوئی افسر بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ جاتا، تو وہ سکون کا سانس لیتا اور عموماً اسے ایک نمایاں کامیابی کے طور پر اپنے دوستوں سے فخریہ بیان کرتا۔

اندرون صوبہ جن فوجی کمانڈروں کو نظم و نسق اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری دی گئی تھی، ان کا کام بڑا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ ان کے فرائض میں متعلقہ علاقوں میں صنعتی اداروں، بنکوں، تار گھروں اور دیگر اہم تنصیبات کی حفاظت کے علاوہ علاقے کو شرپسندوں سے پاک رکھنا تھا، مگر ان کے وسائل صرف ایک بٹالین (چھ سات سو افراد) یا ایک کمپنی (سو ڈیڑھ سو افراد) تک محدود تھے۔ وہ اس افرادی قوت کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے مختلف مقامات پر بھیج دیتے تھے۔ ٹکڑی جتنی چھوٹی ہوتی، باغیوں کے لیے اتنا ہی تر نوالہ ہوتی — اگر وہ انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک جگہ مجتمع رکھتے، تو زیادہ تر علاقہ شرپسندوں کے رحم و کرم پر ہوتا۔

افرادی قوت کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نیم فوجی تنظیموں سے کئی افراد لیے جاتے جن میں رضاکار (مغربی پاکستان) پولیس، رینجرز اور ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز شامل تھے۔ بھانت بھانت کی یہ نفری کبھی بھی ذہنی اور جسمانی طور پر فوجی یونٹ کی طرح متحدہ فورس نہ بنتی۔ ان کا مورال بھی عموماً نیچے ہی ہوتا — انہیں عام طور پر فوجی پلاٹون کے ساتھ ملا دیا جاتا تاکہ نسبتاً زیادہ تعداد دیکھ کر باغی بھی جرأت نہ کریں اور خود ان میں بھی اعتماد پیدا ہو۔

اگرچہ اس حکمت عملی سے بعض چوکیوں پر متعین نفری دس سے بڑھ کر تیس ہو گئی مگر طاقت کا سرچشمہ وہی دس افراد رہے جو باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ نیم فوجی تنظیموں کے افراد کو جہاں بھی فوج سے علیحدہ کوئی ذمہ داری سونپی گئی وہ بالعموم قابل اعتماد ثابت نہ ہوئے — کبھی تو مکتی باہنی اور بھارتی فوج کی مشترکہ یلغار سے ان کے قدم اکھڑ جاتے اور کبھی وہ محض بزدلی — اور کہیں کہیں نمک حرامی — کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (نمک حرامی کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی جب پتہ چلا کہ مکتی باہنی کے کئی افراد رضاکاروں میں بھرتی ہو گئے تھے) — اوّل الذکر کی ایک مثال ۲۹ اکتوبر کے ایک واقعے سے ملتی ہے جب نواب گنج تھانے پر باغیوں نے حملہ کر دیا۔ وہاں متعین ۳۹ رضاکاروں میں سے ۳۲ بھاگ گئے اور سات پکڑے گئے۔ تھانے پر مکتی باہنی کا قبضہ ہو گیا۔ اسی طرح لہا گنج تھانے میں، ۵ بنگالی پولیس مین تھے جنہیں تفتیشی کمیٹی (آئی ایس ایس سی) نے "سفید" (بے ضرر) قرار دیا تھا اور وہ ۴ ستمبر والے اعلان معافی کے بعد اپنی ملازمت پر بحال کر دیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ مغربی پاکستان پولیس اور ویسٹ پاکستان رینجرز کے تیس سپاہی تھے۔ ۲۸ اکتوبر کو اس تھانے کے بنگالی سپاہی اچانک بھاگ گئے — وہ آئندہ شب واپس آ گئے، مگر مکتی باہنی کی کمک کے ساتھ — انہوں نے آتے ہی شب خون مارا اور تیس کے تیس مغربی پاکستانی سپاہی شہید کر دیے — یوں یہ تھانہ بھی شرپسندوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسی طرح کی وارداتیں نواکھلی، فریدپور، تنگیل اور دیگر اضلاع میں بھی ہوئیں۔

سرحدوں کے قریب مکتی باہنی کا کام اور بھی آسان تھا کیونکہ وہاں بھارتی آقاؤں کی توپیں سرحد سے ان کی بھرپور اعانت کرتی تھیں اور وقتِ ضرورت بھارتی فوج سرحدوں کے اندر بھی داخل ہو جاتی تھی۔ بھارتی توپوں کی گولہ باری کا سلسلہ جون میں شروع ہوا اور تخریب کاری کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، حتیٰ کہ اکتوبر میں شاید ہی کوئی دن گزرتا جب سینکڑوں بھارتی گولے پاکستان کی سرزمین پر نہ پھٹتے۔ سرکاری اندازے کے مطابق ایک دن میں مختلف سائز کے پانچ سو سے دو ہزار گولے برستے۔ اس گولہ باری کے چار مقاصد تھے:

(الف) اس سے امن کی حالت کو بتدریج جنگ میں بدلنے کی بھارتی پالیسی میں مدد ملتی تھی جس کا پہلا مرحلہ سرحدوں کو گرم رکھنا تھا۔

(ب) سرحدی علاقوں میں تخریب کاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

(ج) سرحد کے ساتھ ایسی جگہوں پر قبضہ ہو جاتا تھا جو باقاعدہ جنگ کے دوران مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔

(د) پاکستانی فوج سرحدوں کو نظر انداز کر کے اندرونِ صوبہ "صفائی" پر مکمل توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

بھارت کو اس حکمتِ عملی سے روکنے کے لیے پاکستان نے ۳ دسمبر (باقاعدہ جنگ کا اعلان) سے پہلے کوئی مؤثر کارروائی نہ کی۔ صرف اخباری اور سفارتی ذرائع سے چیخ پکار جاری رکھی، مگر کسی نے اس پر کان نہ دھرا، چنانچہ بھارت نے سرحدی علاقے میں بہت سے موزوں ٹیلوں اور جنگی نقطۂ نگاہ سے مفید مقامات پر قبضہ کر لیا، جن کا مجموعی رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل بنتا تھا۔ اس کے باوجود صدر مملکت کو ۱۲ اکتوبر کی نشری تقریر میں اس بات پر اصرار تھا کہ "آپ کی بہادر افواجِ وطن کی مقدس سرزمین کے ایک ایک انچ کے دفاع کے لیے پوری طرح مستعد اور تیار ہیں۔"

قوم کو دھوکا دینے والے یحییٰ خاں واحد شخص نہ تھے، جنرل نیازی اس میدان میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ انہوں نے متعدد بار اعلان کیا: "اگر جنگ چھڑ گئی تو میدانِ کارزار بھارت کی سرزمین بنے گی۔" اسی جنونی کیفیت میں وہ کبھی آسام اور کبھی کلکتہ پر قبضہ کرنے کی دھمکی دیتے۔ میں نے رائے عامہ کے نقطۂ نظر سے ان سے گزارش کی کہ آپ ایسی بلے پرکی نہ اڑائیں کیونکہ اس سے بیجا توقعات بڑھتی ہیں جنہیں آپ کبھی پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس پر انہوں نے کسی کتاب سے رٹا ہوا یہ جملہ دہرایا کہ "دھوکہ دہی بھی جنگ جیتنے کا ایک گُر ہے ــــ خواہ شیطانی سہی۔"

انہی دنوں (۲۴ اکتوبر) انہوں نے مجھے صبح صبح اپنے دفتر میں طلب فرمایا اور پوچھا:

"تمہارے دوست (غیر ملکی نامہ نگار) کیا کہتے ہیں؟"

"ان کا خیال ہے کہ جنگ چھڑنے کو ہے۔"

"میں بھی اس کے لیے تیار ہوں، میرے دفاعی انتظامات مکمل ہیں، ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پوزیشن میں ہیں۔ میرے پاؤں بڑے مضبوط ہیں ...."

"..... مگر فضائیہ اور بحریہ کی حمایت تو محدود ہے!"

"کوئی بات نہیں، میں نے فضائیہ اور بحریہ کی مدد کے بغیر جنگ لڑنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

"..... پھر بھی میرا خیال ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف دشمن ہے، اس سے نپٹنے کے لیے آپ کے پاس وسائل بہت محدود ہیں، مجھے ڈر ہے کہ ....."

کس چیز کا ڈر ہے؟۔۔۔

"مجھے ڈر ہے کہ جنگ کی صورت میں سرحدوں کے باہر اور سرحدوں کے اندر دشمن کو آپس میں ملنے کے لیے ہماری پتلی سی دفاعی لائن میں سوراخ ڈالنا ہوگا جو زیادہ مشکل نہیں کیونکہ اس کی حیثیت سینڈوچ میں پتلے سے قتلے جیسی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ بھارت شگاف ڈالنے کے لیے سرحد کے جس نقطے کو منتخب کرنا چاہے کر سکتا ہے کیونکہ پہل اس کے ہاتھ میں ہے۔۔۔"

"اوئے تمہارے خدشات سراسر بے بنیاد ہیں۔ تم افرادی قوت کا حساب لگا کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگیں جرنیلوں کے زور سے جیتی جاتی ہیں سپاہیوں کی تعداد سے نہیں ـــ اور تمہیں معلوم ہے کہ جرنیلی کا زور کیا ہوتا ہے ـــ؟ صحیح وقت پر، صحیح مقام پر افواج کی صحیح تعداد کو متعین کرنا" یہ جملہ سن کر مجھے لمحے بھر کو یہ احساس ہوا کہ شاید جنرل نیازی کی یہ شہرت کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا مبالغے پر مبنی ہے۔

بڑ ہانکنے کی جو طرح جنرل نیازی نے ڈالی وہ ان کے کئی ماتحتوں نے بھی اپنائی۔ میں مشرقی پاکستان کے اندر مختلف دوروں پر جنرل نیازی کے ساتھ گیا۔ ان موقعوں پر ہر جگہ متعلقہ میجر جنرل اور متعلقہ بریگیڈیئر ان کو صورت حال (بریفنگ) سے آگاہ کرتے ـــ بریفنگ میں عموماً وسائل، مشن اور تقسیم وسائل کے ذکر کے بعد تان اس پر ٹوٹتی کہ "اگر وسائل محدود اور حالات نامساعد ہیں تو کوئی بات نہیں سر! آپ میرے سیکٹر کے متعلق کوئی فکر نہ کریں۔ جب تک میں یہاں ہوں دشمن کو ناکوں چنے چبوا دوں گا ـــ" اس طرز گفتگو کو عموماً بہادری اور اس کے برعکس کلمات کو بزدلی تصور کیا جاتا ـــ ہمارے ہاں اتنی اخلاقی جرأت ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ بزدلی کا داغ لے کر بھی کوئی حق گوئی سے کام لے۔

فوجی کمانڈر اپنے سینیئر کمانڈروں کی نظروں میں نوکری بنانے کے لیے خواہ کچھ بھی کہتے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ مہینوں کی مسلح شورش کی وجہ سے ہمارے سپاہیوں کی کارکردگی کافی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ اس عرصے میں نہ صرف انہیں (مارشل لا اور آئی۔ ایس ڈیوٹی کی وجہ سے) پیشہ ورانہ تربیت جاری رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا بلکہ ان کو ایک دن کا بھی آرام اور سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے کئی سپاہیوں کو جوتے، جرابیں اور چارپائیاں تک میسر نہ تھیں۔ نفسیاتی محاذ پر حالت اور بھی دگرگوں تھی۔ ان میں سے جو سوجھ بوجھ رکھتے تھے وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اگر بنگالی ہمارے ساتھ رہنے پر رضامند نہیں تو ان کو طاقت کے زور سے اپنے ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور، جو ان پڑھ سپاہی مغربی پاکستان سے یہ سن کر گئے تھے کہ حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے اور کافر کو اس کی حرکتوں کا مزہ چکھانا ضروری ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا سامنا تو بنگالی مسلمانوں سے ہے ہندو تو شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسا حق و باطل کا معرکہ ہے جس میں مسلمان کو مسلمان کا سامنا ہے ـــ ان مادی اور نفسیاتی عناصر نے اکثر سپاہیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آیا ان حالات میں جان کی قربانی دینا واقعی عظیم کارنامہ ہے جس کے عوض شہادت کا رتبہ حاصل ہوگا۔

فوجی مفکر کہہ گئے ہیں کہ کسی بھی کمانڈر کی ۷۵ فیصد توجہ اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ اس کے زیر کمان افسروں اور سپاہیوں کی روح کا اندازہ کیا ہے ـــ مگر ہمارے ہاں اس نفسیاتی پہلو کو سراسر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ صرف زیر کمان سپاہیوں کے سر اور رائفلوں کے بٹ گننے پر اکتفا کیا گیا ـــ وہ جانتے تھے مسلح شورش کو کچلنے میں ہمارے ۲۳۷ افسر ـــ ۱۳۶ جونیئر کمیشنڈ افسر اور ۳۵۵۹ سپاہی جان کی قربانی دے

اندرونی گڑبڑ کو روکنے کے لیے کارروائی INTERNAL SECURITY

چکے ہیں؛ مگر اس بات کا انہیں کوئی احساس نہ تھا کہ باقی بچنے والوں میں سے کتنے ذہنی طور پر جنگ سے الگ ہو چکے ہیں۔

نفسیاتی اثر اور مورال میں کمی کا اثر سپاہیوں کی کارکردگی میں بھی نظر آنے لگا۔ شروع شروع میں وہ بڑی مستعدی اور جانثاری سے شرپسندوں کا کھوج لگانے اور ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرتے، مگر بعد میں صرف "بوقتِ ضرورت" گشت پر نکلتے اور وہ بھی بے دلی سے۔ پھر ایک وقت (اکتوبر/نومبر) ایسا بھی آیا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کوئی فوجی دستہ متعلقہ علاقے میں نظر نہ آتا۔ نمونتہً تین واقعات حاضر ہیں:

نومبر کے شروع میں بھارتی فوج کی نمبر ایک ناگا بٹالین کے سپاہی جیسور سیکٹر کے علاقہ دھرما دہا میں گھس آئے۔ پہلی رات انہوں نے تشویش میں گزاری۔ دوسری رات بھی چوکس رہے — مگر کئی دن اور کئی راتیں گزرنے کے بعد انہیں کسی نے نہ چھیڑا؛ حالانکہ ان کے مورچے سرحد سے ڈیڑھ میل اندر واقع تھے — ۱۲ نومبر کو ہمارا ایک فوجی دستہ اچانک ادھر جا نکلا، تو پتہ چلا کہ ہمارے علاقے میں دشمن مورچے کھودے بیٹھا ہے۔ اگلی رات ان پر حملہ کر کے انہیں وہاں سے بھگایا گیا اور چار سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا جو جنگ کے آخر تک ہمارے پاس رہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ کومیلا کے جنوب میں بلونیا کے مقام پر پیش آیا جہاں ۱۰ نومبر کو اچانک پتہ چلا کہ اس خدار سرحدی علاقے کا آدھا حصہ دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے۔ آگے آگے مکتی باہنی والے مورچہ بند ہیں اور پیچھے ان کی پشت پناہی کے لیے بھارتی سپاہی بیٹھے ہیں۔ انہیں وہاں سے پسپا کرنے کے لیے کئی دنوں تک وسائل اور خیالات اکٹھے کیے جاتے رہے — بالآخر انہیں وہاں سے مار بھگایا گیا۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ جیسور سیکٹر میں بوہرہ کے مقام پر ہوا جہاں ۱۲ نومبر کو بھارتی سپاہی گھس آئے۔ انہیں وہاں ہمارا نام و نشان نہ ملا، تو انہوں نے آہستہ آہستہ جموں و کشمیر بٹالین اور نمبر ۲ سکھ لائٹ بٹالین جمع کر لیں — ہمیں ان کی موجودگی کا علم ۱۹ نومبر کو ہوا؛ چنانچہ جیسور سیکٹر کے انچارج بریگیڈیئر محمد حیات کو یہ علاقہ دشمن سے خالی کرانے کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ ۲۲ ایف ایف اور ۳۸ ایف ایف کی دو کمپنیوں سے دشمن پر حملہ کیا گیا جو ناکام رہا۔ ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ۳۸ ایف ایف کو اپنا زیادہ تر جنگی ساز و سامان چھوڑ کر اپنی جان بچانا پڑی۔ اس حادثے سے ایک طرف یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے سپاہیوں کے پائے ثبات میں لغزش آگئی ہے اور دوسری طرف یہ واضح ہو گیا کہ دشمن نے شوقیہ مورچے نہیں کھودے اس کا ارادہ وہیں جمے رہنے کا ہے؛ چنانچہ اسے پسپا کرنے کے لیے ایک اور کوشش کی گئی جس کے لیے ڈویژن کے زیر کمان ۲۱ پنجاب (آر اینڈ ایس) اور ۶ پنجاب کو مستعار لیا گیا۔ انہیں دو جماعتوں "الف" اور "ب" میں تقسیم کر کے بالترتیب لیفٹیننٹ کرنل امتیاز وڑائچ اور لیفٹیننٹ کرنل شریف کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں توپخانے کی ایک فیلڈ رجمنٹ اور ٹینکوں کا ایک سکواڈرن بھی دیا گیا۔

مذکورہ بالا فوج کے ساتھ منصوبے کے مطابق ۲۱ نومبر کو صبح چھ بجے حملے کا آغاز ہوا۔ شروع میں پیش قدمی کی رفتار حوصلہ افزا رہی لیکن جونہی ہمارے فوجی درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے وہاں چھپے ہوئے دشمن کے ٹینک ان پر آگ برسانے لگے ساتھ ہی سرحد پار سے دشمن کی توپوں کے منہ بھی کھل گئے۔ ہمیں اتنی مزاحمت کی توقع نہ تھی کیونکہ ہمارے "ماہرین" کی نظر میں اس علاقے میں ٹینک نہیں آسکتے تھے۔ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ آڑے وقت میں پاک فضائیہ سے مدد طلب کی گئی جو فوراً پہنچ گئی مگر ادھر سے بھارتی طیارے بھی فضا میں آگئے۔ دشمن کا پلہ بھاری رہا۔ ہمارے دو طیارے اور چھ ٹینک تباہ ہو گئے۔ دشمن اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ حملہ ترک کر دیا گیا؛ البتہ دشمن کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کے سامنے فوجی دستے متعین کر دیے گئے۔ دشمن نے اپنی کسی مجبوری یا مصلحت

کی وجہ سے ۳ دسمبر تک مزید پھیلنے کی کوئی قابلِ ذکر کوشش نہ کی جس سے ہمیں یہ ڈھنڈورا پیٹنے کا موقع مل گیا کہ ہم نے ۲ دسمبر تک دشمن کو وہیں روک کے رکھا۔

دشمن کو وہیں بند رکھنے کے لیے اس کے تینوں جانب جو حصار باندھا گیا وہ خالص فوجی نقطۂ نظر سے نامناسب تھا، کیونکہ اس حصار بندی میں جیسور سیکٹر میں متعین ہماری فوج کا بیشتر اور طاقت ور حصہ صرف ہوگیا تھا جس سے سرحد کے باقی حصوں کے دفاع کے لیے بہت کم نفری رہ گئی تھی ـــ اگر دشمن حصار پر مامور فوج کو مقامی چھیڑ چھاڑ میں مصروف رکھ کر کسی اور حصے پر حملہ کر دیتا تو اس کا کام بہت آسان ہو جاتا، مگر دشمن نے ہماری اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھایا، کیونکہ اس وقت تک بھارت کے مقاصد محدود تھے۔ وہ صرف مقررہ وقت پر اور مناسب حالات میں بھرپور پیش قدمی کر کے مشرقی پاکستان کو نگلنا چاہتا تھا۔ وہ قبل از وقت اپنے ارادوں سے پردہ سرکانا نہیں چاہتا تھا۔

۲۱ نومبر کو بوہرہ کے مقام پر ہمیں جو واقعہ پیش آیا اسے جنرل نیازی کے ہیڈ کوارٹر (ایسٹرن کمانڈ) نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ میں ان دنوں مغربی پاکستان آیا ہوا تھا۔ میں نے راولپنڈی میں یہ خبر سنی کہ دشمن نے بگ طیاروں، بکتر بند گاڑیوں اور توپخانے کی مدد سے بوہرہ (جیسور) پر حملہ کر دیا ہے، حالانکہ حقیقتِ حال یہ تھی کہ دشمن ایک ہفتہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ہم نے اسے پسپا کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ہم ناکام رہے تھے۔

اسی ہفتے (۲۰ نومبر تا ۲۵ نومبر) ایسٹرن کمانڈ نے واویلا کیا کہ بھارت نے چار اور مقامات یعنی ضلع سلہٹ میں ذکی گنج اور اٹگرام، ضلع دیناج پور میں ہلی اور ضلع رنگپور میں پاچاگڑھ پر بھی بھرپور حملہ کر دیا ہے ـــ درحقیقت دشمن سرحد کے ساتھ ساتھ چند اہم مقامات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باقاعدہ جنگ چھڑنے پر اسے پیش قدمی کرنے میں سہولت ہو، مگر ایسٹرن کمانڈ نے اسے بھرپور جنگ کا آغاز قرار دیا تاکہ ایک تو جیسور میں ۳۸ ایف ایف کی طرح سلہٹ اور رنگپور میں متعلقہ فوجی یونٹوں کی پسپائی کا جواز نکل سکے، دوسرے جی ایچ کیو پر واضح ہو جائے کہ ٹائیگر نیازی کتنے دباؤ کا کس پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

جیسور، سلہٹ اور رنگ پور سیکٹرز میں ان جھڑپوں کے بعد جنرل نیازی وہاں تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے پسپا ہونے والی یونٹوں کو برا بھلا کہا اور یہ فیصلہ صادر فرمایا: آئندہ کوئی فوجی دستہ یا پلٹن اس وقت تک پسپا نہیں ہوگی جب تک کہ اس کی تین چوتھائی نفری زخمی یا شہید نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی پسپائی جی او سی کی ذاتی اجازت کے بغیر نہیں ہوگی۔ (بعد میں ان احکامات کی توثیق تحریری طور پر بھی کی گئی)۔

جنرل نیازی ۲۲ نومبر سے ۲ دسمبر تک تقریباً روزانہ سرحدی علاقوں کے دورے پر جاتے رہے۔ مجھے یاد ہے ۲۷ نومبر کو وہ ہلی تشریف لے گئے جہاں غیر ملکی صحافیوں کی ایک جماعت بھی پہنچی ہوئی تھی۔ یہ جماعت درحقیقت سرکاری طور پر وہاں بھیجی گئی تھی تاکہ بھارتی جارحیت کی تازہ واردات دیکھ سکے (چند روز پہلے بھارتی حملے کے دوران دشمن کا ایک ٹینک تباہ ہو کر ہمارے علاقے میں رہ گیا تھا)، وہیں ایک غیر رسمی اخباری کانفرنس شروع ہو گئی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ اخباری کانفرنس کے آخر میں ایک صحافی نے پوچھا:

"آپ کے خیال میں بھرپور جنگ کب شروع ہوگی؟"

"جنرل نیازی نے چکن تکے کی پلیٹ سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے فرمایا،

لیے بھرپور جنگ تو پہلے ہی شروع ہو چکی ہے۔"

ان کے اس جواب پر کسی کو اعتبار نہ آیا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ اگر بھارت نے فضائیہ ٹینک اور توپ خانے سے بھرپور جنگ شروع کر دی ہوتی تو جنرل نیازی تین پلیٹ چکن تکوں کے بعد اخبار نویسوں سے چٹکلے بازی کرنے کے بجائے کسی تہہ خانے میں بیٹھ کر رو رہے ہوتے۔

صحافیوں کی یہ جماعت جب تباہ شدہ بھارتی ٹینک دیکھنے روانہ ہوئی تو جنرل نیازی نے ڈھاکہ روانگی کا ارادہ کیا۔ انہیں ہرگز خدشہ نہ تھا کہ ان کے ہیلی کاپٹر پر کہیں بھارتی جیٹ نہ جھپٹ پڑیں۔ وہ جنتے کھیلتے ایک نوجوان خاتون صحافی کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر ڈھاکہ لے آئے تاکہ فلیگ اسٹاف ہاؤس میں اسے رات کو خصوصی انٹرویو* دے سکیں۔

---

* یہ انگریزی اصطلاح EXCLUSIVE INTERVIEW کا ترجمہ ہے جس کا مطلب ایسا انٹرویو ہے جس کے دوران کوئی اور صحافی موجود نہ ہو۔

حصّۂ سوئم

جنگ

باب ۱۵

شکست کی تیاری

اگرچہ جنرل نیازی نومبر کے آخر میں اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے دعویٰ کر چکے تھے کہ وہ بھارت سے بھرپور (ٹوٹل) جنگ لڑ رہے ہیں، مگر میدانِ جنگ میں اُن کی سپاہ کی تنظیم و ترتیب سے اس کی نفی ہوتی تھی۔ ان کے زیرکمان تمام فوج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر ۲۷۰۰ کلومیٹر سرحدوں کے ساتھ ساتھ بکھری ہوئی تھی جو تخریب کاروں، شرپسندوں اور سرحدی جھڑپوں کے لیے تو موزوں ہو سکتی تھی مگر بھرپور جنگ کے لیے نہیں کیونکہ اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ یہ تقاضے کیا تھے اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے کونسی دفاعی حکمت عملی مناسب تھی، اس کا جائزہ لینے سے پہلے آئیے اُس خطۂ زمین پر ایک نظر ڈال لیں جس کا دفاع جنرل نیازی کے سپرد تھا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کوئی ۱۶۰۰ کلومیٹر فاصلہ تھا۔ مشرقی بازو تین اطراف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا تھا۔ چوتھی طرف خلیج بنگال تھی جس پر بھارتی بحریہ کا غلبہ تھا اور وہ بآسانی اس کی ناکہ بندی کر سکتی تھی۔ صرف جنوب مشرقی سرحد پر ایک چھوٹی سی پٹی تھی جو برما کی طرف کھلتی تھی، مگر یہ علاقہ پہاڑیوں اور جنگلوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا۔ یہاں میزو قبائل اور جنگلی درندوں کا دور دورہ تھا۔ اس علاقے میں چوری چھپے تخریب کاری، شرانگیزی یا محدود گوریلا کارروائی تو ممکن تھی مگر روایتی انداز میں ٹینکوں اور توپوں کی جنگ بعید از قیاس تھی۔

باقی صوبہ زیادہ تر آبی نوعیت کا تھا جسے دریائے جمنا، دریائے گنگا اور دریائے میگھنا نے چار واضح حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر حصّے میں چھوٹے چھوٹے دریا، نالے اور جھیلیں تھیں جنہیں فضا سے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی ماہر فنکار نے مختلف لکیروں، چوکوروں اور کونوں سے ایک شاہکار ترتیب دیا ہے۔ ان دریاؤں اور نالوں سے جو زمین بچی تھی اسے درختوں، فصلوں اور جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں دو بڑے جنگل تھے جو سندربن (جیسور کے قریب) اور مادھوپور (تنگیل کے قریب) میں واقع تھے۔ ان میں اچھی خاصی فوج پناہ لے سکتی تھی اور اسلحے اور ایمونیشن کے بڑے ذخائر بآسانی چھپائے جا سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں موسم کا مزاج متلوّن تھا۔ سردیاں اور گرمیاں مختصر اور برسات طویل ترین۔ بارشیں عموماً اپریل میں شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتیں مگر سرکاری لحاظ سے موسم برسات مئی سے ستمبر تک شمار ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی موسم برسات گزرا ہو جس میں سیلاب کی یلغار نہ ہوتی ہو۔ عموماً ہر سال وسیع علاقہ زیر آب آجاتا اور کشتیوں کے علاوہ آمدورفت کے تمام ذرائع مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ سیلاب اُترنے کے بعد بھی خاصے عرصے تک زمین اتنی سیلی سیلی رہتی کہ وہاں فوجی مقاصد کے لیے وسیع پیمانے پر ٹرکوں یا ٹینکوں کی نقل و حرکت ناممکن سمجھی جاتی۔

زمین کی یہ دریا دامنی، اور برسات کی یہ فراوانی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ بھارتی حملے کے لیے بہترین مہینے دسمبر سے مارچ ہوں گے۔ بھارت نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان مہینوں کا انتظار کرنے کے بجائے اس عرصے کو بہت مفید (اس کے نقطۂ نظر سے) طریقے سے گزارا۔ اس نے ایک طرف ہماری افواج کو ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے کے لیے مکتی باہنی کو استعمال کیا اور دوسری طرف اپنی عسکری قوت کو زیادہ منظم اور مؤثر بنانے پر پوری توجہ دی۔

آئیے ایک نظر بھارت کی اس عسکری قوت پر بھی ڈال لیں جس کا ہمیں مشرقی پاکستان میں سامنا تھا۔ بھارت کی آٹھ ڈویژن تازہ دم فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر صف آرا تھی (دو اور ڈویژن چین کی طرف متعین تھے، مگر بوقت ضرورت ان کا رخ بھی مشرقی پاکستان کی طرف موڑا جا سکتا تھا)۔ ان آٹھ ڈویژنوں میں سے دو مغربی بنگال میں تھے تاکہ وہ حکم ملنے پر جیسور کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ یہ ۲ کور کے ماتحت تھے۔ ہمارے شمال مغربی علاقے پر چڑھائی کے لیے تین ڈویژنوں پر مشتمل ۳۳ کور تھی۔ عین شمال میں ۱۰۱ کمیونی کیشن زون تھا جو ایک لڑاکا ڈویژن کے طور پر لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی کمان ایک میجر جنرل کے سپرد تھی۔ رہ گئی مشرقی سرحد تو وہاں بھارت کے تین ڈویژن پڑے تھے جن کی کمان ۴ کور کے حوالے تھی۔ ہر ڈویژن کے ساتھ جو ٹینک اور توپخانہ ضروری ہوتا ہے، وہ بھی موجود تھا۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس رسالے اور آرٹلری کی کئی رجمنٹیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(الف) فیلڈ رجمنٹ (توپخانہ) : ۴۸ توپیں (بعد میں ۶۰ کر دی گئیں)

(ب) میڈیم رجمنٹ (توپخانہ) : ۱۰ توپیں (بعد میں ۱۲ کر دی گئیں) ان توپوں میں روسی ساخت کی ۱۳۰ ملی میٹر دہانے والی توپیں بھی شامل تھیں جو ۳۰ کلومیٹر تک مار کرتی تھیں۔

(ج) ٹی ۵۵ ٹینک : ایک رجمنٹ

(د) پی ٹی ۷۶ ٹینک : ایک رجمنٹ اور دو سکواڈرن

(ہ) شرمن ٹینک : ایک رجمنٹ[1]

ہمارے ٹینک رات کو استعمال نہیں ہو سکتے تھے مگر بھارت کے اکثر ٹینکوں میں انفرا ریڈ شیشے نصب تھے جن کی مدد سے انہیں تاریکی میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اس کے بعض ٹینک پانی میں تیر کر رکاوٹ عبور کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں بھارت کے پاس معقول تعداد میں بکتر بند گاڑیاں تھیں جن کی مدد سے بیک وقت دو پلٹنوں کی نفری گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہ کر میدانِ جنگ میں نقل و حرکت کر سکتی تھی۔

بھارت کی فضائی قوت اسّی سکواڈرنوں (ایک سکواڈرن میں عموماً ۸ طیارے ہوتے ہیں) پر مشتمل تھی جس میں مگ ۲۱، کینبرا (بمبار)، ایس یو ۷ (لڑاکا بمبار) اور ہنٹ (زمینی کمک دینے والے طیارے) شامل تھے۔ ان طیاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے بھارت نے مشرقی پاکستان کے ارد گرد ہوائی اڈوں کا جال بچھا دیا تھا۔ دریاؤں کی رکاوٹ عبور کرنے کے لیے باربردار طیارے اور ہیلی کاپٹر مہیا کیے گئے تھے۔

---

[1] بھارتی توپخانے کی ایک رجمنٹ میں عموماً ۲۰ توپیں ہوتی ہیں جبکہ ٹینکوں کی رجمنٹ ۴۵ ٹینکوں (چار سکواڈرنوں) پر مشتمل ہوتی ہے۔

بھارت کی بحری قوت میں سب سے قابلِ ذکر اُس کا (AIRCRAFTCARRIER) یعنی طیّارہ بردار بحری بیڑہ تھا جسے "وکرنت" (VIKRANT) کہتے تھے۔ اس میں دیکھ بھال کرنے والے چھ طیّارے، ۱۴ سمندری عقاب (لڑاکا بمبار) اور آبدوزوں کے خلاف استعمال ہونے والے تین سی ہاک طیّارے شامل تھے۔ اِس بیڑے کی حفاظت کے لیے معقول تعداد میں ڈسٹرائر (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATES) تھے۔ اس کے علاوہ بھارتی بحریہ کے پاس چار بڑے جنگی جہاز (بیاس، برہم پترا، کاموترا اور کرلبارتی)، دو آبدوزیں (کندھاری اور کالواری)، ایک سُرنگیں صاف کرنے والا جہاز اور پانچ مسلح کشتیاں (گن بوٹ) تھیں۔

اس برّی، بحری اور فضائی قوت کے علاوہ بھارت کے پاس ایک چھاتہ بردار بریگیڈ، تین بریگیڈ گروپ، بارڈر سیکورٹی فورس کی ۳۴ پلٹنیں اور ایک لاکھ "مکتی باہنی" تھی۔ بھارتی قوت میں، مَیں نے اُس بنگالی آبادی کا ذکر نہیں کیا جو کسی پلٹن یا "باہنی" میں بھرتی ہونے کے بجائے اپنے اپنے گھروں میں تھی مگر اس کی ہمدردیاں بھارت اور اس کی آلۂ کار مکتی باہنی کے ساتھ تھیں۔

اُوپر بھارت کی صرف اس عسکری قوت کا ذکر کیا گیا ہے جو خالصتہً مشرقی پاکستان کے محاذ پر متعین تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کے پاس (مشرقی پاکستان میں) صرف تین انفنٹری ڈویژن تھے جو ضروری ساز وسامان سے بھی پوری طرح لیس نہ تھے۔ پاکستان ائیر فورس کا صرف ایک اسکواڈرن ڈھاکہ میں تھا جس میں ۱۶ سیبر طیارے تھے۔ ہوائی اڈہ بھی ایک ہی تھا جس کے خراب یا تباہ ہونے کی صورت میں سارے جہاز بیکار ہو سکتے تھے۔ ڈھاکہ چھاؤنی کے شمالی جانب زیرِ تعمیر اڈّہ ابھی قابلِ استعمال نہ ہُوا تھا۔ اگر اس آڑے وقت میں مزید طیارے وہاں بھیج بھی دیے جاتے تو ہوائی اڈّوں کی کمی کے پیشِ نظر ان کی افادیت مشکوک ہو کر رہ جاتی۔ ہمارا کُل بحری سرمایہ ایک ریئر ایڈمرل اور چار مسلح کشتیوں (گن بوٹ) پر مشتمل تھا۔ یہ کشتیاں پندرہ بیس سال پہلے سمگلنگ کی روک تھام کے لیے خریدی گئی تھیں۔

یہ تھی ہماری کُل دفاعی پونجی، اِس میں اضافہ کرنے کے لیے رضاکاروں، مجاہدوں، اسکاؤٹوں اور ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (ای پی سی اے ایف) کی نیم عسکری نفری اکٹھی کی گئی جس کی کُل تعداد ۷۳ ہزار بنتی تھی۔ کہا جاتا ہے وسائل کی کمی کو جنرل کا ذہن پورا کر دیتا ہے مگر اس میدان میں بھی ہماری عزت جنرل نیازی جیسے آدمی کے ہاتھ میں تھی۔

بے شک بھارت کے وسائل ہم سے کئی گُنا زیادہ تھے مگر غور طلب بات یہ تھی کہ وہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا؟ دوسرے لفظوں میں بھارت کے عزائم کیا تھے؟ اگرچہ آج یہ سوال لایعنی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جنگ کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، مگر اُن دنوں اس سوال کا جواب اِتنا واضح نہ تھا۔ بہت سے فوجی دماغ اس ٹوہ میں بیٹھے تھے کہ دشمن کے ارادوں کو قبل از وقت بھانپ کر دفاعی اقدامات کیے جائیں۔ اُن کی سوچ بچار کا نچوڑ یہ تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان کے ایک حصّے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے "آزاد بنگلہ دیش" کا نام دے کر اس پر بنگالی پناہ گزینوں کو آباد کر دے۔

اس بھارتی مقصد کو محور بنا کر مشرقی پاکستان میں موجود فوج کو سارے صوبے خاص طور پر سرحدی علاقوں میں بکھیر دیا گیا تاکہ مکتی باہنی یا اس کے سرپرست کسی قابلِ ذکر خطّۂ زمین پر قبضہ نہ کر لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سپاہیوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھارت کو آٹھ ماہ تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، مگر کیا واقعی بھارت اسی مقصد کے لیے کام کر رہا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ بھارت سارے مشرقی پاکستان کو ہڑپ کرنے کے درپے تھا اور سرحدی علاقے میں چھوٹی چھوٹی جگہوں پر قبضہ کرنے کی بھارتی کوشش اس کے عظیم منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔

بھارتی عزائم کا غلط اندازہ لگانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ جنرل نیازی پر یا جی ایچ کیو پر؟ اس سوال کا خاطر خواہ جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو "مشن" کیا دیا تھا۔ یہ بات صیغۂ راز میں نہیں کہ ایسٹرن کمانڈ کو مشرقی پاکستان کے دفاع کا فرض سونپا گیا تھا اور یہ بات ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر (جنرل نیازی) کی پر چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ اس مشن کو پورا کرنے کے لیے دشمن کے عزائم کا اندازہ لگائے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے فوجی اسٹریٹیجی وضع کرے۔

مشرقی پاکستان کے مخصوص حالات میں بہترین فوجی اسٹریٹیجی کیا تھی؟ اور جنرل نیازی نے کس اسٹریٹیجی کو اپنایا؟ آئیے اس مسئلے پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ مشرقی پاکستان کے دفاع کے چار طریقے تھے:

اوّل: تمام تر توجہ ڈھاکہ پر مرکوز کر دی جائے اور جتنے وسائل دستیاب ہیں انہیں استعمال میں لا کر ڈھاکہ کے گرد دفاعی حصار بنا دیا جائے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ دفاعی حصار تین بڑے دریاؤں (جمنا، برہم پترا اور میگھنا) کے کناروں پر استوار کیا جا سکتا تھا۔ اس حکمت عملی کے دو واضح نقصان تھے۔ ایک یہ کہ ہر چیز اس دفاعی حصار پر مرکوز کرنے سے مشرقی پاکستان کا بیشتر حصہ جس میں جیسور، کشتیا، راجشاہی، بوگرہ، رنگ پور، سلہٹ، کومیلا اور چاٹگانگ شامل تھے کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے قبضے میں چلا جاتا۔ دوسرا یہ کہ اس دفاعی حصار کو توڑنے کے لیے بھارت کو بمشکل چار ڈویژن فوج درکار ہوتی اور وہ باقی چار ڈویژن باآسانی مغربی محاذ پر منتقل کر دیتا جہاں ہمیں زندگی میں پہلی بار (اور شاید آخری مرتبہ) قریب قریب عددی برابری حاصل ہوئی تھی۔ یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ ہم قیام پاکستان سے کہتے آئے تھے کہ "مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا"۔ اس لیے مغربی محاذ پر بھارتی فوج کی بھرمار اس قومی اسٹریٹیجی میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھی۔

دوئم: اپنے سارے وسائل سرحدوں کے دفاع پر لگا دیے جائیں اور دباؤ پڑنے پر بوقت ضرورت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا جائے حتیٰ کہ ہم ڈھاکہ کے اردگرد جمع ہو جائیں۔ بظاہر ایک معقول تدبیر تھی لیکن دو وجوہ نے اسے ناقابل عمل بنا دیا تھا۔ ایک تو بھارت کی فضائی برتری کی وجہ سے دن کے وقت پسپا ہونا مشکل تھا، دوسرے رات کو جگہ جگہ مکتی باہنی کا سامنا کرنا پڑتا۔

سوئم: اس مکتبۂ فکر کے مطابق مشرقی پاکستان کا بہترین دفاع اس میں تھا کہ کسی ایک جگہ کو "آخری دم تک" بچانے کے بجائے "متحرک جنگ" کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر میں قباحت یہ تھی کہ اس بھاگم بھاگ میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے تعاون سے زمین ہمارے لیے تنگ ہو سکتی تھی۔ صوبے کے اندر اور باہر مخالفت کے پیش نظر یہ اسٹریٹیجی مناسب نہ تھی۔

چہارم: اس طریقۂ کار کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سرحدی شہروں، خصوصاً اُن شہروں کو جو حملہ آور کے راستے میں پڑتے تھے "دفاعی قلعوں" میں تبدیل کر لیا جائے۔ ان میں طویل لڑائی کے لیے راشن، ایمونیشن اور دیگر جنگی سامان جمع کر لیا جائے اور اردگرد مورچے کھود لیے جائیں تاکہ اُوپر سے دشمن جتنی ضربیں بھی لگاتا جائے انہیں بلا نقصان سہا جائے اور وقت ضرورت انہی "دفاعی قلعوں" کو بنیاد بنا کر دشمن پر حملہ بھی کیا جائے۔ یہ طریقۂ کار اگرچہ بہت پرانا اور کسی حد تک فرسودہ تھا، مگر موجودہ حالات میں اس میں دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ اس طرح وسیع علاقہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے اس کا جگہ جگہ دفاع کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے ناکافی وسائل کو مخصوص مقامات پر مجتمع کر کے مؤثر دفاع کی صورت پیدا کر سکتے

تھے۔ خیال تھا اول تو دشمن کو ہر دفاعی قلعہ فتح کرکے آگے بڑھنا پڑے گا جو آسان کام نہ ہوگا اور اگر اس نے اسے "غیر مفتوح" چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اسے ہر وقت پیچھے سے حملے کا ڈر رہے گا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ہر قلعہ کو محصور کرکے آگے بڑھے گا جس کا مطلب ہوگا اسے ہر قلعے کو محصور کرنے کے لیے معقول تعداد میں فوج تعینات کرنا پڑے گی اور پیش قدمی کے لیے مزید نفری درکار ہوگی یعنی دگنی فوج لگانی پڑے گی۔ اس حکمت عملی کو فوجی مبصر عموماً لوہار کے "ہتھوڑے" اور "آہرن" سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی ہتھوڑا حملہ کرنے والے کا اور آہرن حملہ سہنے والا۔ اس کی حمایت میں عموماً یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہتھوڑا چلانے والے بازو تھک جاتے ہیں مگر "آہرن" نہیں ٹوٹتی۔

مذکورہ بالا طریقوں میں سے جنرل نیازی نے طریقہ نمبر ۳ منتخب کیا اور سرحد کے قریب چیدہ چیدہ شہروں کو دفاعی قلعوں میں (بدل) دیا۔ ان شہروں میں جیسور، جھنیدہ، بوگرہ، رنگ پور، جمال پور، میمن سنگھ، سلہٹ، بھیرب بازار، کومیلا اور چٹاگانگ شامل تھے۔ (ہر) دفاعی قلعے میں ۴۵ دن کا راشن اور ۶۰ دن کا گولہ بارود جمع کرنے کو کہا گیا۔ ان کے علاوہ بعض شہروں اور قصبوں کو مضبوط مقام (STRONG POINT) کا درجہ دیا گیا۔ یہ مقامات عام شہروں سے زیادہ اور دفاعی قلعوں سے کم دفاعی صلاحیت رکھتے تھے۔

ان دفاعی قلعوں پر مبنی ایسٹرن کمانڈ نے جو فوجی اسٹریٹیجی وضع کی، اُس کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

(الف) سرحدی چوکیوں پر متعین ہمارے فوجی اُس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ مقامی جنرل آفیسر کمانڈنگ اُنہیں پسپا ہونے کا حکم نہیں دیتا۔

(ب) پسپا ہوتے ہوئے حتی الامکان مزاحمت کی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم زمین ہاتھ سے جائے، اور

(ج) بالآخر یہی فوج واپس آکر دفاعی قلعوں میں مورچہ بند ہو جائے اور آخری وقت تک لڑتی رہے۔

جنرل حمید (چیف آف اسٹاف) جب ڈھاکہ آئے تو انہیں اس منصوبے کی تفصیلات پیش کی گئیں۔ انہوں نے اصولی طور پر اتفاق کیا۔ بعد میں یہ منصوبہ جی ایچ کیو روانہ کیا گیا جہاں پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس منصوبے کو درج ذیل تصریحات کے ساتھ منظور کرکے ایسٹرن کمانڈ کو لوٹا دیا گیا:

(ا) راجشاہی کے سامنے سرحد پار انگلش بازار پر حملے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

(ب) فرخا بند کو تباہ یا مفلوج کرنے کے لیے چھاپہ مار فوج کے اقدامات کو منصوبے میں شامل کیا جائے۔

(ج) چٹاگانگ میں ایک پلٹن ضرور رکھی جائے (تاکہ وہ سمندری راستے سے آنے والی کسی کمک کو وصول کر سکے)۔

(د) ڈھاکہ کو مشرقی پاکستان کے دفاع کی کُنجی سمجھا جائے۔

ایسٹرن کمانڈ نے حسب الحکم ان تصریحات کو اصلی پلان میں شامل کر لیا اور جی ایچ کیو کو تعمیلِ ارشاد سے آگاہ کر دیا۔

اب یہ اندازہ لگانا باقی تھا کہ دشمن کے حملے کا رُخ کس طرف ہوگا یعنی کس جانب سے وہ پوری طاقت سے حملہ کرے گا اور کس طرف سے اضافی کوشش کرے گا۔ اس رُخ کا اندازہ کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ اسی کے مطابق دفاعی فوج کو بھی متعین کرنا تھا۔ اس سلسلے میں فوجی رواج کے مطابق مختلف مفروضوں (مفروضہ نمبر ایک، مفروضہ نمبر دو، مفروضہ نمبر تین اور مفروضہ نمبر چار) کو زیرِ بحث لایا گیا اور اتفاقِ رائے اس بات پر ہوا کہ اصلی اور بڑا حملہ کلکتہ کی جانب جیسور سیکٹر میں ہوگا اور ذیلی اقدام مشرق میں تریپورہ کے علاقے سے کومیلا سیکٹر میں ہوگا۔ اسی سوچ کے مطابق تمام وسائل کو حسبِ ذیل طریقے سے بانٹ دیا گیا:

(۱) جیسور سیکٹر

اس سیکٹر میں ایک ڈویژن (نمبر ۹) تھا جس کی کمان میجر جنرل محمد حسین انصاری کے سپرد تھی۔ اس ڈویژن میں دو بریگیڈ تھے۔ ۱۰۷ بریگیڈ اور ۵۷ بریگیڈ۔ ان کے ہیڈ کوارٹر بالترتیب جیسور اور جھنیدہ میں واقع تھے۔ پیدل فوج کے علاوہ اس ڈویژن کے پاس توپخانے کی دو رجمنٹیں اور دیدبانی اور کمک رسانی کے لیے ایک آر اینڈ ایس بٹالین تھی۔

(۲) شمالی بنگال

اس محاذ پر میجر جنرل نذر حسین کا سولہواں ڈویژن تھا جس کا ہیڈ کوارٹر ناٹور میں تھا۔ اس ڈویژن میں بھی دو بریگیڈ تھے۔ ایک بریگیڈ (۲۳) رنگ پور میں تھا اور دوسرا (۲۰۵) بوگرہ میں۔ اس ڈویژن کے پاس رسالے اور توپخانے (فیلڈ) کی ایک ایک رجمنٹ اور ہلکی توپوں (مارٹر) کی دو بیٹریاں تھیں[1]

(۳) مشرقی سرحد

مشرقی سرحد کا دفاع میجر جنرل عبدالمجید قاضی کے سپرد تھا جو ۱۴ ڈویژن کی کمان کر رہے تھے۔ اس ڈویژن کا ایک بریگیڈ (۲۷) میمن سنگھ میں تھا اور دوسرا (۲۱۲) سلہٹ میں۔ اس کے علاوہ جنرل قاضی کے پاس توپخانے کی ایک رجمنٹ، مارٹر توپوں کی دو بیٹریاں اور چار ٹینک تھے۔ جنرل قاضی کا مستقل ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ تھا۔

(۴) چٹاگانگ سیکٹر

اس سیکٹر کا دفاع بریگیڈیر عطا کے سپرد تھا جس کے پاس ۹۷ بریگیڈ تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر چٹاگانگ میں واقع تھا۔

مذکورہ بالا تقسیم کے بعد اندازہ ہوا کہ زمین زیادہ ہے اور سپاہی تھوڑے۔ چنانچہ ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نیم عسکری جمعیت یعنی مجاہدوں، رضاکاروں، اسکاؤٹوں، پولیس اور ای پی سی اے ایف کی نفری کو بھی متعلقہ جرنیلوں کے حوالے کیا گیا تا کہ وہ اپنے اپنے دفاع کو مزید "گھنا" کر سکیں۔ جنگ کے دوران جب دباؤ پڑا، تو ہماری دفاعی لائن میں یہی نفری سب سے کمزور نکلی۔

جب جنگ کے بادل گہرے ہونے لگے تو جنرل نیازی نے دشمن کو "دھوکا" دینے کے لیے دو عبوری ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور چار عبوری بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کر دیے۔ ایک ڈویژن ہیڈ کوارٹر کا انچارج ای پی سی اے ایف کے ڈائرکٹر جنرل میجر جنرل جمشید کو بنایا گیا جو پہلے ہی ڈھاکہ میں تھے اور دوسرا ہیڈ کوارٹر میجر جنرل رحیم خان کی قیادت میں چاندپور روانہ کر دیا گیا۔ جنرل رحیم ان دنوں جنرل نیازی کے نائب کے طور پر ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۱۴ ڈویژن کا ۲۷ بریگیڈ جو میمن سنگھ میں مقیم تھا اسے مشرقی سرحد پر بھراب بازار منتقل کر دیا گیا، مگر اس کی ایک پلٹن میمن سنگھ میں روک لی گئی۔ ایک اور پلٹن ملا کر ایک نیا بریگیڈ (زیر قیادت بریگیڈیر قادر) تشکیل دیا گیا۔ جنرل جمشید کے پاس یہ ایک بریگیڈ اور اپنی نیم فوجی (ای پی سی اے ایف) نفری تھی۔

۵۳ بریگیڈ آڑے وقت میں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے مخصوص تھا۔ نیازی نے اسے فینی میں جنرل رحیم کے زیر کمان کر دیا۔ جنرل رحیم کے ڈویژن کا دوسرا بریگیڈ (۱۱۷) ۱۴ ڈویژن سے لیا گیا جو کومیلا میں متعین تھا۔ اب بھی وہیں رہا۔ اس طرح جنرل رحیم کے پاس فینی

---

[1] ایک بیٹری میں عموماً ۱۲ ہلکی توپیں ہوتی ہیں۔

جہاں تک ہم عبوری بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں کا تعلق ہے، ان کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ جنرل نیازی کو اپنی ان عبوری تخلیقات پر بڑا فخر تھا، وہ اکثر اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے دعوے کرتے کہ "جب دشمن کو ان ہیڈ کوارٹروں کا پتہ چلے گا، تو وہ بوکھلا اُٹھے گا کہ راتوں رات اتنی زیادہ فوج کہاں سے آ گئی، یقیناً اس سے اس کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ حملے کا ارادہ ترک کر دے گا۔"

پتہ نہیں ان حربوں سے جنرل نیازی دشمن کو دھوکا دے رہے تھے یا اپنے آپ کو، کیونکہ وطن کے دفاع کے لیے جو نفری پہلے موجود تھی اب بھی وہی رہی۔ ہیڈ کوارٹر بنانے سے اس کی کارکردگی میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہ آئی۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر تو درکنار اگر مشرقی پاکستان میں چڑیاں اور کوّے بھی معمول سے زیادہ نظر آتے، تو اس کی اطلاع مکتی باہنی اور بھارتی فوج کو مل جاتی تھی۔

مزید نفری حاصل کرنے کے لیے جنرل نیازی نے نومبر کے وسط میں میجر جنرل جمشید اور اپنے چیف آف سٹاف بریگیڈیر باقر صدیقی کو راولپنڈی بھیجا۔ اس دو رکنی ٹیم نے جی ایچ کیو کو بتایا کہ ساری سرحدوں پر دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے، کئی سرحدی علاقے دشمن کے قبضے میں جا چکے ہیں، موجودہ وسائل ناکافی ثابت ہو رہے ہیں، اس لیے مزید دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجی جائے۔ جی ایچ کیو کے لیے سوچنے کا مقام یہ تھا کہ ان دو ڈویژنوں سے مشرقی پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں کتنا اضافہ اور مغربی پاکستان کی جنگی قوت میں کتنی کمی واقع ہو گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دو ڈویژن بھیجنے کے بجائے آٹھ پلٹنیں ڈھاکہ بھیج دی جائیں۔ ان میں سے پانچ پلٹنیں نومبر کے آخری عشرے میں ڈھاکہ پہنچ گئیں اور ان کے فوراً حصے بخرے کر کے مختلف کمانڈروں میں تقسیم کر دیے گئے۔ ان پلٹنوں کی نہ صرف وحدت اور یگانگت ٹوٹ گئی، بلکہ ان کی جنگی صلاحیت بھی خاصی متاثر ہوئی۔ ایک کمپنی کہیں، دوسری کہیں اور بٹالین ہیڈ کوارٹر کہیں! باقی تین پلٹنیں ابھی باقی تھیں کہ ۳ دسمبر کو جنگ چھڑ گئی اور بین الصوبائی رابطہ منقطع ہو گیا۔

۱۹ نومبر کو عید الفطر تھی۔ عید کا چاند نظر آنے کے بعد راولپنڈی سے پیغام آیا کہ انٹیلی جنس کی تازہ اطلاع کے مطابق عید کے روز حملے کا خطرہ ہے۔ مزید انکشاف کیا گیا کہ اس حملے کا زور کومیلا کی جانب ہو گا اور ذیلی اقدام جیسور سیکٹر میں رو پذیر ہو گا۔ جی ایچ کیو نے ایسٹرن کمانڈ کو مشورہ دیا کہ وہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اپنے دفاعی انتظامات میں ضروری رد و بدل کرے۔

جنرل نیازی نے اس مشورے پر کوئی عمل نہ کیا، حالانکہ اس کی ساری نفری مکتی باہنی اور شر پسندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور باقاعدہ جنگ کے لیے ان کی ترتیب نو ضروری تھی۔ البتہ نئی اطلاع کی روشنی میں جنرل نیازی نے اپنی ساری دفاعی پوزیشن کا جائزہ لیا، تو اندازہ ہوا کہ مشرقی سرحد پر کومیلا اور فینی کے درمیان ہماری حالت نرم ہے۔ اگر حملہ مشرق ہی سے آ رہا ہے، تو غالباً اس کا رخ یہی "نرم پٹی" ہو گا۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں مقیم ۵۳ بریگیڈ فوراً فینی روانہ کر دیا گیا۔ ۲۰ نومبر کو جنرل رحیم بھی چند سٹاف افسر اور بہت سے جنگی نقشے لے کر چاند پور پہنچ گئے۔ جنرل رحیم اس علاقے کے دفاع کے بارے میں خاصے پُر امید تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک بریگیڈ کومیلا میں ہے اور دوسرا فینی میں۔ دونوں کے درمیان اگر دشمن نے سر دیا، تو اسے دبا کر کچل دیا جائے گا۔ اطلاعاً جیسور سیکٹر کے انچارج میجر جنرل انصاری کو بھی متوقع خطرے سے آگاہ کر دیا گیا۔

خوش قسمتی سے دشمن نے عید کے دن بھرپور حملہ نہ کیا، البتہ بعض سرحدی علاقوں پر پہلے کی نسبت دباؤ بڑھ گیا۔ اس دباؤ کو

بھرپور حملے کا نام دینا اور اسے کامیابی سے روکنے کو ایک کارنامہ قرار دینا حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روز دشمن اپنی عسکری قوّت کو حرکت میں نہیں لایا تھا۔ ڈھاکہ شہر پر ایک بھی ہوائی حملہ نہ ہوا۔ کہیں بھی بھارتی طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی نہ دی، بلکہ سارے صوبے میں بسیں، ریل گاڑیاں، کشتیاں اور موٹر لانچیں حسبِ معمول چلتی رہیں اور تو اور خود جنرل نیازی روزانہ کے معمول کے مطابق صبح سویرے ہیلی کاپٹر پر روانہ ہوتے اور دن بھر چکّر لگا کر شام کو بخیر و عافیت کسی خاتون صحافی کو "خصوصی انٹرویو" دینے کے لیے ڈھاکہ لوٹ آتے۔ حالانکہ جب ۳ دسمبر کو بھرپور جنگ شروع ہوئی تو چوتھے دن ہی جنرل نیازی بلک بلک کر رونے لگے جس کا تفصیلاً ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

انہی دنوں (اواخر نومبر) کا ذکر ہے کہ جنرل نیازی نے اخبار نویسوں کو اپنی دفاعی جنگ کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میرے سپاہی کھلے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ آہستہ آہستہ سکڑ کر ایک مکّے کی شکل اختیار کر لیں گے اور پھر دشمن کا جبڑا توڑ دیں گے۔" ساتھ ہی انہوں نے اپنے ماتحت کمانڈروں کو حکم دے دیا کہ جب تک سرحدی چوکی پر متعیّن نفری میں تین چوتھائی شہید یا زخمی نہیں ہو جاتے، کوئی فرد پیچھے نہ ہٹے۔ مجھے یہ آرڈر عجیب لگا، کیونکہ جس ہاتھ کی تین چوتھائی انگلیاں ٹوٹ جائیں اس ہاتھ سے مکّا کیسے بن سکتا تھا۔ میرا تو ایک ناخن بھی زخمی ہو تو پوری طرح مٹھی بند نہیں ہوتی۔

میرا خیال خام سہی مگر اہلِ نظر بھی کہتے ہیں کہ جنرل نیازی نے اپنی "دفاعی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا"۔ اُن کی صلاحیتوں سے قطع نظر امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ وہ اپنی فوج کو تسبیح کے دانوں کی طرح سرحد کے ساتھ ساتھ بکھیر کر اپنی شکست کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

باب ۱۶

یوم الحساب

۳ دسمبر بڑا تاریخی دن تھا —— ملک کے لیے بھی اور جنرل نیازی کے لیے بھی۔ ملک اس روز بھارت کی دوسری بھرپور جارحیت کا شکار ہوا اور جنرل نیازی اس دن آخری مرتبہ ڈھاکہ سے باہر نکلے۔ وہ میمن سنگھ تشریف لے گئے تھے۔ شام کو واپس آئے، تو میں اپنے دفتر میں بیٹھ کر اخبارات کے لیے دن بھر کی رُوداد لکھنے لگا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر بریگیڈیئر باقر صدیقی کا فون آیا۔ وہ خاصے جھنجلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا "تم کیسے پریس آفیسر ہو؟ ریڈیو پاکستان نے جنگ چھڑنے کی خبر نشر کردی ہے اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں؟" میں نے لجاجت سے کہا "میں سمجھ رہا تھا جنگ کی خبر سب سے پہلے آپ بتائیں گے۔"

"چھوڑو باتیں نہ بناؤ، فوراً ٹیک ہیڈکوارٹر پہنچو۔"[1]

ٹیک ہیڈکوارٹر ایک چھتنار درخت تلے زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس میں تین چار میٹر گہرے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کی چھت پر گھاس پھوس ڈال کر اسے ہوا بازوں سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں کوئی چھ زینے نیچے اُتر کر ایک تنگ گیلری میں داخل ہوا اور دونوں جانب تین تین کمرے چھوڑ کر سیدھا آپریشن رُوم میں پہنچ گیا۔ یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ اس کی دیواروں پر مختلف سیکٹروں کے فوجی نقشے لگے تھے۔ ایک طرف دو میزوں پر کوئی نصف درجن ٹیلیفون اور وائرلیس سیٹ رکھے تھے۔ ایک افسر صرف ٹیلیفون سننے پر مامور تھا —— یہ کمرہ مشرقی پاکستان میں تمام فوجی کارروائیوں کا محور تھا۔ احکام یہاں سے جاتے تھے اور مختلف حصّوں سے صورتِ حال کی خبریں بھی یہیں موصول ہوتی تھیں۔

جس وقت میں "آپریشن رُوم" میں داخل ہوا جنرل نیازی چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈی پتلون اور سلیٹی رنگ کی بش شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی رومال (اسکارف) تھا۔ ان کی پُشت دیوار کی طرف تھی۔ تیس چھتیس حاضرین میں میجر جنرل راؤ فرمان علی اور ریئر ایڈمرل محمد شریف بھی شامل تھے۔ جنرل نیازی گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ محدود سی جگہ میں ٹہلتے بھی جاتے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی یا بُحران کے کوئی آثار نہ تھے؛ البتہ ماحول اتنا گھمبیر تھا کہ ان کے منہ سے جو لفظ نکلتا سیدھا دل میں اُترتا جاتا تھا۔ ان کے خطاب کا لُبِّ لباب یہ تھا کہ اب تمام بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب

---

[1] ٹیک ہیڈکوارٹر انگریزی الفاظ TACTICAL HEADQUARTERS سے لیا گیا ہے۔ جنگ کے دوران فوجی کمانڈر اپنے مستقل ہیڈکوارٹر سے ٹیک ہیڈکوارٹر منتقل ہو جاتے ہیں۔ جنرل نیازی کا ٹیک ہیڈکوارٹر چھاؤنی کے اندر ہی اپنے مستقل ہیڈکوارٹر سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

انہیں بین الاقوامی سرحدیں پار کرنے کی آزادی ہے۔ اب بادل چھٹ چکے ہیں۔

سامعین کے چہروں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ گزشتہ آٹھ ماہ سے شرپسندوں کے خلاف صف آرا تھے، مگر اس پابندی کے ساتھ کہ ان کے تعاقب میں بین الاقوامی سرحد پار نہ کرنے پائے۔ اب بین الاقوامی سرحد کا تقدس پامال ہو چکا تھا۔ ان کے خیال میں اب دونوں پارٹیوں کو آزادی ہوگی اور فیصلہ ہو کر رہے گا۔ طمانیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب تک مغربی پاکستان کی سرحدیں خاموش تھیں، صرف مشرقی پاکستان کی پٹائی ہو رہی تھی۔ خیال تھا کہ اب ہمارا تنومند بازو بھی اپنا زور دکھانے لگا اور ہم پر ہونے والے ظلم و استبداد کا بدلہ لے گا۔ اب بھارت کو پتہ چلے گا کہ "مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا" کے کیا معنی ہیں۔

تقریر کے بعد سب لوگ چلے گئے، تو جنرل نیازی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اعلان جنگ کے موقع پر ان کی طرف سے "آرڈر آف دی ڈے" یا "فرمان امروز" تیار کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تاکید کی کہ ان کے زیر کمان افسروں اور جوانوں پر دو باتیں واضح کی جائیں۔ ایک یہ کہ اب دشمن جہاں بھی ملے جدھر بھی ملے، سرحدوں کا خیال کیے بغیر اسے تہس نہس کر دیں اور دوسری بات یہ کہ آخری دم تک دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، کیونکہ فرار یا جان بچا کر بھاگنے کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ میں چلنے لگا تو انہوں نے فرار والا جملہ کٹوا دیا۔

میں اسی شام "فرمان امروز" کا مسودہ تیار کر کے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے مسودے سمیت مجھے بریگیڈیئر باقر صدیقی کے حوالے کر دیا، مگر وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کی نوک پلک نہ سنوار سکے۔ بات اگلے روز پر جا پڑی۔ مسودہ منظور ہوا اس کی نقلیں بنیں اور تمام محاذوں پر افسروں اور جوانوں کو بھیجنے کا اہتمام ہونے لگا، مگر اب محاذ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ واحد ذریعہ ہیلی کاپٹر تھے، لیکن ان کی تعداد کم اور ان کے کام زیادہ تھے، چنانچہ یہ پلندہ ڈھاکہ ہی میں پڑا رہا اور بالآخر وہیں نذر آتش کرنا پڑا۔

مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کی ابتدا پاک فضائیہ کے حملوں سے ہو چکی تھی جس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ پہل بھارت نے کی ہے اور پاکستانی جیٹ طیارے جوابی کارروائی کے لیے سات بھارتی اڈوں پر تباہی پھیلا کر آئے ہیں۔ ان کے بعد ہماری بری فوج بھی پیش قدمی کر چکی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ریڈیو پاکستان کے ذریعے پہنچیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے بھرپور جنگ کا پہلی بار احساس ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات دو بج کر چالیس منٹ پر ہوا جب بھارتی طیاروں نے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ہلہ بول دیا۔ میں اس وقت اڈے سے تھوڑی دور اپنے مکان کی بالائی منزل میں سو رہا تھا۔ بھارتی طیاروں اور ہماری طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں پلنگ سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا جہاں سے ایئرپورٹ کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

رات چاندنی کو معصوم بچے کی طرح گود میں لیے انسان کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کر رہی تھی اور اوپر جھلمل جھلمل کرتے ستارے خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان گولیوں اور گولوں کی بھرمار تھی۔ ٹریسر گولیوں کی روشنی تیزی سے آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی اور دھماکوں کی آواز بار بار کانوں سے ٹکراتی۔ تیز رفتار بھارتی طیارے بے ضمیر روح کی طرح بے قرار پھرتے اور ہماری طیارہ شکن توپیں نفرت کے شعلے ان پر پھینکنے کی کوشش کرتیں۔ یہ منظر پو پھٹنے تک جاری رہا۔ اُدھر سورج نکلا اور اِدھر

ہنگامہ رک گیا جیسے چور شرفا کے جاگنے سے پہلے پہلے اپنا کام مکمل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔

حملہ ختم ہونے کے بعد میں نے حجامت بنائی، استری شدہ وردی پہنی اور ٹیک ہیڈ کوارٹر چل دیا۔ وہاں کوئی خاص سرگرمی نظر نہ آئی سوائے صبح کی کانفرنس کے جس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر نظر پاک بحریہ اور فضائیہ کی کارکردگی پر بھی ڈال لیں تاکہ زمینی جنگ کا جائزہ لیتے وقت یہ اندازہ رہے کہ ہماری نیوی اور ایئر فورس کو کیا ہوا؟

جنگ کی پہلی زد پاک فضائیہ پر پڑی۔ بھارت کے جدید طیاروں کا مقابلہ ہمارے پرانے سیبر طیاروں اور صاحب کمال ہوا بازوں نے خوب ڈٹ کر کیا۔ جدید اور قدیم کے علاوہ تعداد کے لحاظ سے مقابلہ ایک اور دس کا تھا۔ ہمارے پاس طیاروں کا ایک اسکواڈرن اور چودہ دن کا گولہ بارود تھا۔ بھارت کے پاس کم از کم دس سکواڈرن اور ان گنت اسلحہ تھا۔ ہمارے جہازوں نے پہلے دن ۳۲ فضائی معرکوں میں حصہ لیا اور مجموعی طور پر تیس ہزار راؤنڈ چلائے۔ یہ فضائیہ کی تاریخ میں ایک دن میں ایمونیشن کا سب سے زیادہ خرچ تھا۔ فضائیہ کے علاوہ دیگر ہتھیاروں نے بھی ایک دن میں ستر ہزار گولیاں اور گولے پھونک دیئے۔ اس سے حکام بالا کو تشویش ہوئی کہ اگر ایمونیشن کے یومیہ خرچ کی یہی شرح رہی تو تمام ذخیرے سات سے دس دن میں ختم ہو جائیں گے۔ ان دنوں اندازہ یہی تھا کہ ہمیں ایک طویل جنگ لڑنا پڑے گی جس کے لیے ایمونیشن کے خرچ میں کفایت شعاری برتنا ضروری ہوگی، چنانچہ ایمونیشن کے اسراف پر پابندی لگا دی گئی اور صرف ضرورت کے مطابق طیاروں اور توپوں کو فائر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہئیے کہ اس طرح بچائے ہوئے ایمونیشن کے ذخائر کو چند روز بعد آگ لگا کر ضائع کرنا پڑا۔

پہلے دن کے فضائی حملے میں بھارتی فضائیہ کے دس بارہ طیارے تباہ ہوئے مگر وہ ڈھاکہ ایئرپورٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ صرف چار بم ایئرپورٹ کے نواح میں گرے جن سے ہماری جنگی صلاحیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس براہ راست بمباری کو بے سود سمجھ کر ہندوستان کو اپنی فضائی اسٹریٹیجی بدلنا پڑی اور اس نے ہمارے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے وہ مگ ۲۱ کی جگہ ایس یو ۷ (SU-7) اور ہنٹر (HUNTER) طیارے فضا میں لے آیا۔ یہ طیارے سرحدوں پر اپنی بری فوج کی مدد کے علاوہ گھاٹوں، پتنوں اور مسافر بردار کشتیوں پر حملے کرنے لگے۔ اس لائحہ عمل سے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر دباؤ کچھ کم ہوا جس کی وجہ سے ۵ دسمبر کو ہماری فضائیہ کو کومیلا اور چند دوسرے علاقوں میں اپنی بری فوج کی اعانت کا موقع ملا۔ جنگی علاقوں میں بھارتی فضائیہ سے براہ راست ٹکر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہمارے طیاروں کو سرحدوں تک جانے اور واپس آنے میں اتنا وقت اور اتنا ایندھن خرچ کرنا پڑتا تھا کہ فضائی جنگ کے لیے ان میں بہت کم سکت رہ جاتی تھی۔ (ان کی کل فضائی صلاحیت صرف ۲۵ منٹ تھی۔)

پانچ دسمبر کا سارا دن اور پھر اگلی رات ہماری توپوں اور طیاروں نے دشمن کے جہازوں کو ایئرپورٹ پر پھٹکنے نہ دیا لیکن ۶ دسمبر کی صبح ہمارے سیبر ایک سرحدی محاذ سے واپس آئے اور ایئرپورٹ پر فضائی چھاتہ تانتے (COMBAT AIR PATROLLING) کے لیے اڑنے والے تھے کہ ہندوستان کے دس مگ ۲۱ طیارے امڈ آئے۔ ہماری طیارہ شکن توپوں نے انہیں للکارا مگر بے سود۔ وہ روسی ساخت کے پانچ پانچ سو کلوگرام وزنی چھ بم گرانے میں کامیاب ہو گئے جن میں سے دو بم رن وے (RUNWAY) پر پڑے۔ ان بموں کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ پہلے سیدھے زمین میں دھنس جاتے اور پھر چند ثانیے بعد پھٹتے جس سے متاثرہ زمین میں بہت بڑا شگاف پڑ جاتا۔ یہ دونوں بم ایک دوسرے سے کوئی بارہ سو میٹر کے فاصلے

پر گرے اور دونوں جگہوں پر وسیع اور گہرے شگاف چھوڑ گئے۔ ہر گڑھا تقریباً دس میٹر گہرا اور بیس میٹر چوڑا تھا۔ اس نقصان کی وجہ سے رن وے قابلِ استعمال نہ رہا۔ مرمت کا کام بڑی تندہی سے شروع کیا گیا۔ فضائیہ اور فوج کے ایم۔ای۔ایس کے محکمے اس کام میں جُت گئے۔ مقامی انجینئرنگ بٹالین کے جوانوں اور چند "بہاری" مزدوروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اوپر سے بھارتی فضائیہ پے در پے حملے کرتی رہی اور ادھر یہ لوگ درمیانی وقفوں میں مصروفِ کار رہے۔ عین میدانِ جنگ میں کام کرتے کرتے گیارہ آدمی ہلاک اور بیس زخمی ہو گئے۔

اگلی رات، ۶ اور ۷ دسمبر کی درمیانی شب، گڑھوں کو بھرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ چھ سے آٹھ گھنٹے کام کرنے کی مہلت مل جائے تو رن وے قابلِ استعمال ہو جائے گا مگر بھارتی طیاروں کے تابڑ توڑ حملوں کی مدافعت کا کام صرف طیارہ شکن توپوں کے سپرد تھا کیونکہ ہمارے جہاز پرواز سے عاری تھے۔ دشمن کی یلغار کامیاب رہی اور رن وے کے اہم مقامات پر تین اور شگاف پڑ گئے جنہیں پُر کرنے کے لیے مزید ۳۶ گھنٹے درکار تھے۔ اتنی طویل مہلت کہاں ملتی؟ کوشش جاری رہی مگر ہم رن وے مرمت کر کے دوبارہ اپنی فضائیہ کو اڑانے کا موقع فراہم نہ کر سکے۔ گویا ۷ دسمبر کی صبح سے ہماری فضائیہ بیکار ہو کر رہ گئی۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دشمن کے کم از کم ۲۲ اور زیادہ سے زیادہ ۲۴ طیارے تباہ ہوئے جن میں سے سات ہماری فضائیہ نے مار گرائے اور باقی ہماری طیارہ شکن توپوں کا شکار ہوئے۔

ڈھاکہ ایئرپورٹ سے تقریباً ۵ کلومیٹر شمال میں کرمیٹولہ ایئرپورٹ "زیرِ تعمیر" تھا جس کا مرکزی رن وے مکمل ہو چکا تھا مگر دیگر سہولتیں مفقود تھیں۔

پرانے اور نئے ہوائی اڈوں کے ناکارہ ہو جانے کے بعد یہ تجویز بھی زیرِ غور آئی کہ ڈھاکہ ایئرپورٹ کے قریب ایوب نگر (دارالحکومت ثانی) کی وسیع سڑکوں کو رن وے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر وہاں سے ہمارے سیبر طیارے پرواز کر سکیں، مگر اُتر نہ سکیں، تو کم از کم دشمن کو نقصان پہنچا کر پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگا دیں۔ اس تجویز کے حامیوں کا کہنا تھا کہ اپنے سیبر طیارے زمین پر کھڑے کھڑے دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ انہیں دشمن پر تباہی برسانے کے بعد ضائع کر دیا جائے۔ جب یہ تجویز پاکستان ایئرفورس ڈھاکہ کے بیس کمانڈر کو پیش کی گئی تو انہوں نے "فنی وجوہات" کی بنا پر اسے ناقابلِ عمل قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں ہماری فضائیہ کا کردار ختم ہو گیا۔

اب ڈھاکہ میں فضائیہ کے "لڑاکا پائلٹوں" کا کوئی مصرف نہیں رہ گیا تھا، چنانچہ انہیں ایک دوست ملک کے توسط سے مغربی پاکستان بھجوا دیا گیا جہاں ہماری فضائیہ ابھی سرگرم تھی۔ دس پائلٹ ۸ دسمبر کو اور چار ۹ دسمبر کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ پیچھے ہیلی کاپٹروں کے پائلٹ اور ان کے انسٹرکٹر رہ گئے۔ ان کے علاوہ آرمی ایوی ایشن کے پائلٹ اور ہیلی کاپٹر بھی ڈھاکہ ہی میں رہے۔

پی۔ اے۔ ایف کو اس مختصر رول پر کوئی افسوس نہ تھا، کیونکہ امن کے زمانے میں یہ بات تسلیم کی جا چکی تھی کہ موجودہ وسائل کے مطابق ہماری فضائیہ جنگ کے زمانے میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ فعال نہ رہ سکے گی۔ یہاں وہ ۴۸ گھنٹے جی لیے۔ یہ ان کی سخت جانی، حوصلے اور فنی مہارت کا کمال تھا۔

پاک فضائیہ کی عدم موجودگی میں ڈھاکہ کے فضائی دفاع کی ساری ذمہ داری ہماری طیارہ شکن توپوں پر آن پڑی جو مشرقی

پاکستان میں سب سے پہلے گرجیں اور سب سے آخر میں خاموش ہوئیں۔ میں نے کچھ وقت ان بہادر توپچیوں کے ساتھ بھی گزارا۔ مجھے یاد ہے دھوپ خوب چلچلا رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہمارے توپچی بھوری ٹوپیاں پہنے کھلے میدان میں دشمن کے جہازوں کے منتظر تھے۔ جونہی بھارتی طیارے نمودار ہوتے یہ فوراً توپ کا دہانہ ان کی سیدھ میں کرتے، جلدی جلدی نشانہ باندھتے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ گولوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ادھر آگ کی حدت، اُدھر ایمان کی حرارت اور پھر گرم گرم میدانِ جنگ! روح کو گرما دینے والا عجیب منظر تھا۔ میں نے جنگ کے انتہائی نازک وقت میں جو لمحے ان توپچیوں کے ساتھ گزارے میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مشرقی پاکستان میں ہماری بحریہ کی حالت فضائیہ سے چنداں بہتر نہ تھی۔ اس کی کل طاقت کومیلا، راجشاہی، جیسور اور سلہٹ نامی چار کشتیوں پر مشتمل تھی۔ ریئر ایڈمرل محمد شریف ان کے سربراہِ اعلیٰ تھے۔ یہ کشتیاں درحقیقت بحری راستوں سے اسمگلنگ کو روکنے کے لیے خریدی گئی تھیں۔ ان پر ۴۰/۶۰ ملی میٹر کی ہلکی توپیں نصب تھیں اور ہر کشتی کے عملے کی تعداد ۲۹ تھی۔ ان کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۲۰ ناٹ (بحری میل) تھی۔

ریئر ایڈمرل شریف نے جنگ سے پہلے اپنے "وسائل" میں اضافہ کے لیے مقامی طور پر مزید ۱۰ کشتیاں حاصل کر لی تھیں جن میں سے بعض پر ۱۲.۷ ملی میٹر بھاری مشین گن اور بعض پر ۵۰. ایم ایم یا ۳۰. ایم ایم براؤننگ مشینیں لگوائی گئی تھیں۔ یہ کشتیاں شرپسندوں کے تعاقب یا سرکوبی کرنے کے لیے بہت مفید تھیں، مگر ان کا بھارتی بحری بیڑے سے کوئی مقابلہ نہ تھا جس میں ایئر کرافٹ کیریئر (AIR CRAFT CARRIER) کے علاوہ کئی ڈسٹرائیر (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATE) شامل تھے۔

پاک بحریہ کو ایک ناممکن کام کا سامنا تھا۔ وسائل محدود اور فرائض غیر محدود۔ صوبے کے اندر ہزاروں میل لمبے دریاؤں اور نالوں کو شرپسندوں سے پاک رکھنے کے علاوہ اس کے ذمے ہمارے چھ سو کلومیٹر طویل ساحل سمندر کا دفاع بھی تھا جو برما کی سرحد پر واقع ٹیکناف (TEKNAF) سے لے کر مغربی بنگال کے پاس پسّر (PASSAR) تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کراچی اور چٹاگانگ کے درمیان ہزاروں میل آبی گزرگاہیں تھیں جن پر بھارت کو بالادستی حاصل تھی۔

جنرل نیازی کی طرح بلند بانگ دعوے کے بجائے ریئر ایڈمرل شریف نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور بری اور بحری سطح پر اپنے اعلیٰ افسروں کو جنگ سے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ ان حالات میں نیوی سے کسی قسم کے مؤثر دفاع کی توقع نہ رکھنا۔ انہوں نے محدود وسائل کے پیشِ نظر صرف چٹاگانگ اور کھلنا کے قریب منگلا کے بحری اڈوں پر توجہ دی اور باقی ساحل سمندر اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چٹاگانگ کے دفاع کے لیے ایک ساحلی دفاعی بیٹری قائم کی گئی جس کے پاس دو توپیں تھیں۔ توپ کا دہانہ صرف ۴ انچ تھا اور اس کی مار بارہ ہزار میٹر تک تھی۔ چٹاگانگ ایئرپورٹ کی حفاظت کے لیے رضاکاروں کی مدد سے ہنگامی طور پر ایک طیارہ شکن بیٹری کھڑی کی گئی اور چٹاگانگ کے ساحلی علاقے پر نظر رکھنے کے لیے میرین بٹالین رکھی گئی۔

منگلا پورٹ کا دفاع ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کی ایک کمپنی کے سپرد تھا۔ بحریہ کی طرف سے وہاں چند کشتیاں (GUNBOAT) رکھی گئی تھیں جن میں سے اکثر ہنگامی طور پر مشین گن فٹ کر کے مسلح کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں ۲۵ پونڈ وزنی گولے والی دو توپیں تھیں ——— یہ تھی کُل پونجی جس سے ہمیں ایک بھرپور جنگ لڑنا تھی۔

۴ دسمبر کو جب اچانک جنگ چھڑ گئی تو گشتی کشتیاں[1] اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ راجشاہی نامی کشتی چٹاگانگ کے مستقر سے نکل کر سینڈ ہیپ کی آبنا (CHANNEL) میں گھوم رہی تھی۔ سلہٹ کسی فنی خرابی کی وجہ سے بے کار کھڑی تھی صرف کومیلا گودی میں چاق و چوبند موجود تھی۔

بحریہ کے ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ سے یہ حکم پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں تمام کشتیاں بندرگاہوں کے محفوظ ٹھکانوں میں سمٹ آئیں۔ ۳ دسمبر کو اعلانِ جنگ کے بعد کشتیاں تو بندرگاہ میں آ گئیں لیکن ان ۲۳ غیر ملکی جہازوں اور سات کوسٹروں (COASTERS) کا کیا بنے گا جو کھلے سمندر میں لنگر انداز تھے۔ انہیں نہ بندرگاہ کے اندر سمویا جا سکتا تھا اور نہ وہاں سے غائب کیا جا سکتا تھا۔ ان کو کسی قسم کی ہدایت دینے کے لیے کوئی مواصلاتی رابطہ بھی نہ تھا کیونکہ وہ اپنے وائرلیس سیٹ صرف مقررہ وقت پر کھولتے تھے۔ رابطے کی واحد ترکیب یہ تھی کہ کوئی جیالا ہمت کرے اور ذاتی طور پر جا کر ان کو تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ چنانچہ بحریہ کا ایک جواں سال افسر چند جاں نثاروں کو ساتھ لے کر ایک کشتی پر روانہ ہو گیا۔ وہ فرداً فرداً ہر جہاز کے پاس گیا اس کے کیپٹن کو جنگی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ اپنی سلامتی کے لیے اپنے اپنے ملک کے جھنڈے سر بلند کر لیں۔

چٹاگانگ میں جنگ کا دھماکہ ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات کوئی دو بجے سنائی دیا جب دشمن کے جہازوں نے تیل کے ایک ذخیرے کو نذرِ آتش کر دیا۔ اگلے روز علی الصبح ایک ہلکا سا بے ضرر طیارہ آہستہ آہستہ سمندر سے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ چٹاگانگ ایئر پورٹ پر متعین طیارہ شکن بیٹری کے نوآموز رضاکاروں نے سوچا کیا بے جان سی شئے پر ایمونیشن ضائع کرنا ہے کوئی جیٹ طیارہ آئے گا تو مقابلے کا مزہ بھی آئے گا۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب یہی بے ضرر سا طیارہ ریفائنری کو بھک سے اڑا گیا۔ اس کے بعد پانچ کینبرا (CANBERRA) طیاروں کا ایک پرا نمودار ہوا جس کو مستعد رضاکاروں نے نشانہ بنایا اور ان میں سے دو کو مار گرایا۔

اسی اثنا میں یہ غیر مصدقہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات دشمن "قطبدیہ" جزیرے پر اتر گیا ہے۔ یہ جزیرہ چٹاگانگ کے قریب ہی تھا اور دشمن کے وہاں اترنے سے چٹاگانگ کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ چٹاگانگ پورٹ کے انچارج کموڈور نے سوچا کہ اگر دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہے تو گشتی کشتیوں (GUN BOATS) کو بچا بچا کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ اس نے "کومیلا" بطور گھاٹ اور "راجشاہی" کو اس مشن کے ساتھ روانہ کر دیا کہ وہ صورتِ حال کا جائزہ لیں اور حسبِ ضرورت کارروائی کریں۔

جب "راجشاہی" مقررہ مقام پر پہنچی تو اسے دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ یہ ابھی وہیں تھی کہ اوپر سے دشمن کے چار ہنٹر طیارے حملہ آور ہو گئے۔ راجشاہی نے اپنی ۴۰/۶۰ ملی میٹر توپ سے انہیں دُور رکھنا چاہا، مگر ناکام رہی۔ اُلٹا اس کو چھ ضربیں آئیں جن سے انجن کو آگ لگ گئی اور پانی بھی غپ غپ اندر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ آگ اور پانی جو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دشمن چلے

---

[1] گن بوٹ (GUN BOAT) اور پیٹرول بوٹ (PATROL BOAT) ایک ہی طرح کی کشتیوں کو کہتے تھے جن کا کام اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے گشت کرنا اور وقتِ ضرورت اسمگلروں پر فائر کرنا تھا۔

...ایسا آتی ... ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تعاون پر اُتر آئے ہیں تاکہ اس بے چاری ... کو دبا دیں۔ راجشاہی کے کیپٹن اور اس کے ساتھیوں نے اسے بچانے کی جان توڑ کوشش کی۔ اِس جدّوجُہد میں کیپٹن سمیت پانچ آدمی زخمی ہوگئے جن میں سے ایک چل بسا، مگر انہوں نے ہمّت نہ ہاری اور پانی اور آگ سے برسرِ پیکار رہے۔ دشمن کے طیارے گن بوٹ سے شعلے بھڑکتے دیکھ کر واپس چلے گئے۔ بوٹ کے عملے کی کوششیں بالآخر بار آور ثابت ہوئیں اور 'راجشاہی' کو بچا لیا گیا۔

'کومیلا'، 'راجشاہی' سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی لیکن یہ بھی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکی کیونکہ خود اس پر دشمن کے طیارے ٹوٹ پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہر پائلٹ نشانہ بازی میں دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے ہر حملے کے بعد کشتی یوں ڈول جاتی تھی جیسے کمزور حریف طاقتور باکسر کا گھونسا کھا کر لڑکھڑا جاتا ہے۔ 'کومیلا' کے عملے کے کئی ارکان بھی زخمی ہوچکے تھے مگر انہوں نے اسے بچانے کی کوشش جاری رکھی۔ اچانک ہوائی جہاز کا ایک نشانہ سیدھا تیل کی ٹنکی میں لگا جس سے اس میں آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں یہ آگ پھیل کر اُس حصّے میں پہنچنے والی تھی جہاں بارُود کے چھ سو گولے رکھے تھے؛ چنانچہ کیپٹن نے حکم دیا کہ 'کومیلا' کو چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچائی جائے؛ لہٰذا دو افسروں اور ۲۱ ارکان پر مشتمل عملہ حفاظتی پیٹیوں سمیت سمندر میں کود گیا۔ اِدھر کُودنے سے پانی اُچھلا اور اُدھر بارُود کو آگ لگ جانے سے دھماکے دار شعلہ بلند ہوا۔ 'کومیلا' کے پرخچے اُڑ گئے۔

تیسری کشتی 'بلور گھاٹ' جو ہوائی حملوں سے محفوظ رہی، 'کومیلا' کے عملے کو اُٹھانے اور چٹا گانگ پورٹ پہنچانے میں کامیاب ہوگئی۔

کھلنا کے قریب منگلا پورٹ نسبتہً چھوٹی اور غیر اہم تھی۔ وہاں دفاعی جمعیت بھی کم تھی۔ بحری طاقت میں سے صرف جیسور گن بوٹ وہاں تھی۔ باقی پانچ کشتیاں وہ تھیں جو ہنگامی طور پر "وسائل بڑھانے" کی خاطر تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سے دو تو جنگ کے پہلے روز ہی تباہ ہوگئیں اور باقی تین قریب ترین جنگل میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئیں۔

جہاں تک بحری جنگ کا تعلّق ہے، پاکستان بحریہ ۲۴ گھنٹوں ہی میں دم توڑ گئی؛ البتّہ ساحلوں پر پہرہ دینے، 'دفاعی قلعوں' کا دفاع کرنے اور صوبے کے اندر فوجی جوانوں اور ساز و سامان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے میں یہ آخری وقت تک فعّال رہی۔

جب فضائیہ اور بحریہ جنگ کے ابتدائی ایّام ہی میں اپنا اپنا کردار ادا کرکے میدانِ جنگ سے غائب ہوگئیں تو ساری ذمّہ داری جنرل نیازی اور ان کے زیرِ کمان پینتالیس ہزار ریگولر فوج اور تہتّر ہزار نیم عسکری نفری پر آن پڑی۔ اب جنگ ... کا فیصلہ دو باتوں پر تھا، فوج کی جسمانی بہادری اور اس کے کمانڈر کی اخلاقی جراُت۔ آئیے پہلے جنرل نیازی کی ایک جھلک دیکھتے چلیں؛

جنرل نیازی ہر روز صبح ۸/۱۰ بجے "آپریشن رُوم" میں چیدہ چیدہ افسروں کی کانفرنس بلاتے۔ وہ ہر افسر سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور بول چال اور حرکات و سکنات سے بالکل نارمل لگتے؛ البتّہ ایک بات ذرا عجیب سی لگتی کہ وہ مشرقی پاکستان میں جنگ پر توجّہ دینے کے بجائے شروع شروع میں مغربی پاکستان میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے۔ انھوں نے آپریشن رُوم کی مغربی دیوار پر مغربی پاکستان محاذ کا بہت بڑا نقشہ لگوا رکھا تھا جس پر وہاں کی جنگی صورتِ حال دکھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پِن لگے تھے۔ دن میں دو مرتبہ (اور بعد میں ایک مرتبہ) جی ایچ کیو سے مغربی محاذ کی صورتِ حال کا نچوڑ تار (سگنل) کے ذریعے

ڈھاکہ پہنچایا تھا۔ ایک افسر کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ اس سگنل میں درج اطلاع کو نقشے پر سُرخ اور سبز پن لگا کر واضح کر دیا کرے۔ سُرخ پن دشمن کی پوزیشن ظاہر کرتے تھے اور سبز ہماری ——

میں جنرل نیازی کی اس میٹنگ میں روزانہ حاضری دیتا۔ حالانکہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے دیکھا کر مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد سے چند سنٹی میٹر دور بھارت کی جانب تین چار سبز پن لگے تھے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے قدم دشمن کی سرزمین پر ہیں۔

۴ دسمبر کو دوپہر کے قریب میں "آپریشن روم" میں داخل ہوا تو سارا ماحول خوشی سے چہکتا ہوا پایا۔ حیران تھا کہ چند گھنٹوں میں کونسا میدان مار لیا ہے؟ پتہ چلا: "امرتسر فتح ہو چکا ہے اور فیروز پور فتح ہونے والا ہے۔ ہماری فوجیں اس کے قرب و جوار میں پہنچ چکی ہیں۔"

میں نے پوچھا: "اگر یہ خبر درست ہے تو جی ایچ کیو سے آنے والے سگنل میں اس کا ذکر کیوں نہیں؟"

ایک صاحب بولے: "اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک وہاں ہماری پوزیشن مستحکم نہیں ہو جاتی، جی ایچ کیو اس کا دعویٰ نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں جنرل نیازی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ کر پہلوانوں کی طرح ڈنٹر پیلنے لگے۔ انہوں نے طعنے کے انداز میں کہا: "دیکھا تم نے؟ جب میں کہا کرتا تھا کہ اگر جنگ چھڑی تو میدانِ جنگ بھارت کی زمین بنے گی، تو تم مجھے غیر ضروری خوش فہمی نہ پیدا کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ مگر اب دیکھ لو! اگر میں نہیں، تو میرا بڑا بھائی (مغربی پاکستان) تو جنگ کو ہندوستان کے علاقے میں لے گیا ہے۔" اس کے فوراً بعد انہوں نے ٹیلیفون گھما کر گورنر مالک کو بھی یہ خوشخبری سُنا دی۔ گورنر نے کہا: "جنرل صاحب! ہمارا اڈے کا کیا حال ہے؟"[1]

جنرل نیازی نے حکم دیا کہ امرتسر فتح ہونے کی خبر مشرقی پاکستان کے کونے کونے میں تمام فوجیوں تک پہنچا دی جائے کیونکہ "اس سے ان کے مورال پر خوشگوار اثر پڑے گا۔" ایڈمرل شریف نے کہا: "بہتر ہوگا کہ پہلے اس خبر کی تصدیق کرالی جائے۔" میں سب سے جونیئر تھا، مجھے ہی حکم ملا کہ پتہ کرو خبر کہاں سے آئی؟ میں نے ساتھ والے آپریشن روم سے پوچھا۔ جواب ملا پی اے ایف بیس ڈھاکہ کے آپریشن روم سے اطلاع آئی ہے۔ سنا ہے وہاں پشاور سے ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے ہاٹ لائن پر اطلاع دی ہے۔ میں نے ڈھاکہ بیس ٹیلیفون کیا اور کہا: "کیا آپ نے امرتسر اور فیروز پور کے متعلق خبر سُنی ہے؟"

"جی ہاں"

"کہاں سے اطلاع آئی؟"

"ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے۔"

جب ڈھاکہ میں اس خوشخبری کا کھوج نہ مل سکا تو راولپنڈی ٹیلیفون کھڑکائے گئے۔ وہاں سے بھی اس کی تصدیق نہ

---

[1] یہ گورنر اے۔ ایم۔ مالک کا آبائی گاؤں تھا جو حصہ بسیکٹر میں سرحد سے چند میل اندر واقع تھا۔ اس دن بھارتی فوجیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔

ہوگئی۔ بالآخر یہ خبر سراسر بے بنیاد نکلی۔ خوشی کی جو لہر اچانک اٹھی تھی، وہ فوراً یاس میں ڈوب گئی۔

اگلی صبح ۸ ۱/۲ بجے کانفرنس ہوئی۔ سبز پن وہیں تھے جہاں پہلے روز تھے۔ ریڈیو پاکستان پر کان لگائے کہ شاید کوئی تازہ خبر سننے میں آئے۔ وہاں بھی ہر بلیٹن میں یہی جملہ سننے میں آتا: "ہماری بہادر افواج اپنے دمدمے مضبوط کر رہی ہیں۔" ایک صاحب نے تنگ آکر کہا: "انہیں اور ڈیلے بھیجو تاکہ جلدی سے یہ کام نپٹا کر آگے بڑھ سکیں۔"

۶ دسمبر کو جنرل نیازی مغربی محاذ سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے صبح کی کانفرنس میں جی ایچ کیو سے آمدہ تار کے اقتباسات پڑھوانے بند کر دیے اور دیوار پر سے مغربی پاکستان کے نقشے ہٹوا دیے۔ وہ دوبارہ مشرقی پاکستان کے خول میں سمٹ آئے جہاں تاریکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

مشرقی پاکستان کے نقشوں پر سبز اور سرخ پن کے بجائے اسی رنگ کی پنسلوں سے لکیریں کھینچ کر پاکستانی اور ہندوستانی افواج کی پوزیشن دکھائی گئی تھی۔ سبز تیر ہماری پسپائی اور سرخ تیر دشمن کی چڑھائی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

آیئے ان تیروں کے چکروں سے نکل کر خود محاذِ جنگ پر چلیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ جنگ کا رنگ کیا ہے۔

باب ۱۷

جیسور سیکٹر (۹ ڈویژن)

جیسور سیکٹر مشرقی پاکستان کا جنوب مغربی علاقہ تھا جس کے شمال میں دریائے گنگا، مشرق میں دریائے میگھنا اور جنوب میں خلیج بنگال تھی، مغربی جانب مغربی بنگال کی مشرقی سرحد لگتی تھی۔ اس علاقے کے اہم شہر کھلنا، جیسور، جنیدہ، کشتیا، باریسال اور فرید پور تھے۔

اس سیکٹر کا بارڈر چھ سو کلومیٹر کے لگ بھگ تھا، اندرونی مواصلاتی نظام خصوصاً سڑکیں اور ریل کی پٹریاں شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا فاصلہ بین الاقوامی سرحد سے کہیں تیس اور کہیں ساٹھ کلومیٹر بنتا تھا۔ جنوب سے شمال کی طرف جاتے ہوئے اس سڑک پر اہم شہر کھلنا، جیسور، جنیدہ اور کشتیا پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ دو سڑکیں جیسور اور جنیدہ سے مشرق کی طرف جاتی تھیں جنہیں بوقتِ ضرورت فوجی کارروائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جیسور اور جنیدہ سے مشرق میں ایک چھوٹا سا دریا "مادھومتی" بہتا تھا جو دفاعی نقطۂ نظر سے بہت مفید تھا۔ مجموعی طور پر سارا سیکٹر میدانی تھا جس میں آزادانہ طور پر فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت ہو سکتی تھی، البتہ ٹینکوں کے لیے اسے ناموزوں سمجھا جاتا تھا کیونکہ راستے میں کئی چھوٹے بڑے نالے پڑتے تھے۔

دریائے گنگا کے جنوبی کنارے بین الاقوامی سرحد پر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جسے راجہ پور کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس سے لے کر نیچے (جیسور سے شمال مغرب میں) درسنہ تک کا علاقہ بریگیڈیئر منظور کے ماتحت تھا جنہوں نے اپنے ۵۷ بریگیڈ کا ہیڈ کوارٹر جنیدہ میں بنا رکھا تھا۔ جیسور سیکٹر کا نچلا نصف حصہ یعنی درسنہ سے خلیج بنگال تک بریگیڈیئر محمد حیات کے پاس تھا جن کا (۱۰۷) بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جیسور میں تھا۔ یہ دونوں بریگیڈ ۹ ڈویژن کے زیر کمان تھے جس کے جی او سی میجر جنرل محمد حسین انصاری (حیا گانگ فیم) تھے۔ زمانۂ امن میں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی جیسور میں تھا لیکن جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے وہ دریائے مادھومتی اور جنیدہ کے درمیان منگورہ کے مقام پر منتقل ہو چکے تھے۔ دو بریگیڈوں کے علاوہ اس ڈویژن میں ای پی سی اے ایف کے سپاہی اور رضاکار وغیرہ بھی تھے جن کے ذمے کھلنا کا دفاع تھا۔ وہاں کے کمانڈر کرنل فضل حمید تھے۔

جنرل نیازی نے مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے "دفاعی قلعوں" پر مبنی جس اسٹریٹیجی کا انتخاب کیا تھا، اس کے تحت اس سیکٹر میں جیسور اور جنیدہ کو "قلعوں" کی حیثیت حاصل تھی جبکہ کشتیا اور کھلنا وغیرہ اہم مقام (STRONG POINT) سمجھے جاتے تھے۔ دفاعی منصوبہ یہ تھا کہ دشمن کو پہلے تو راجہ پور، درسنہ، بینا پول اور دیگر سرحدی مقامات پر روکا جائے اور پھر آہستہ آہستہ "تھوڑی سے تھوڑی زمین زیادہ سے زیادہ وقت میں" چھوڑتے ہوئے دفاعی قلعوں میں آیا جائے اور پھر وہاں آخری دم تک ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ قیاس یہ تھا کہ دشمن جیسور اور جنیدہ میں سے اوّل تو دونوں یا پھر ایک "قلعے" کو مسخر کرنے کے بعد ہی آگے۔

بڑھنے کی سوچے گا، ورنہ ہندو کا اتنا دل گردہ کہاں کہ وہ اپنے پیچھے ایک ایک قلعے میں ایک ایک بریگیڈ کی پروا کیے بغیر سیدھا ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کرے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر اس نے کسی قلعے کو فتح کرنے کے بجائے اسے محض محصور کرنے پر اکتفا کیا تو حصار باندھنے والی فوج محصور فوج (یعنی ایک بریگیڈ) سے کم نہ ہوگی یعنی جیسور سیکٹر میں اگر اس نے دفاعی قلعوں کو محصور کرکے آگے بڑھنا چاہا، تو اس کے دو بریگیڈ (یعنی ایک ڈویژن) تو حصاربندی میں صرف ہو جائیں گے آگے بڑھنے کے لیے اسے علیحدہ فوج درکار ہوگی جو وافر تعداد میں اس کے پاس موجود نہ تھی۔

ہمارے تخمینے کے مطابق بھارت جیسور سیکٹر میں تین راستوں سے حملہ کرسکتا تھا:

(ا) کلکتہ سے بنیاپول اور جیسور

(ب) کشن گڑھ سے درسنہ اور چوآڈانگا

(ج) مرشد آباد سے راجہ پور اور کشتیا

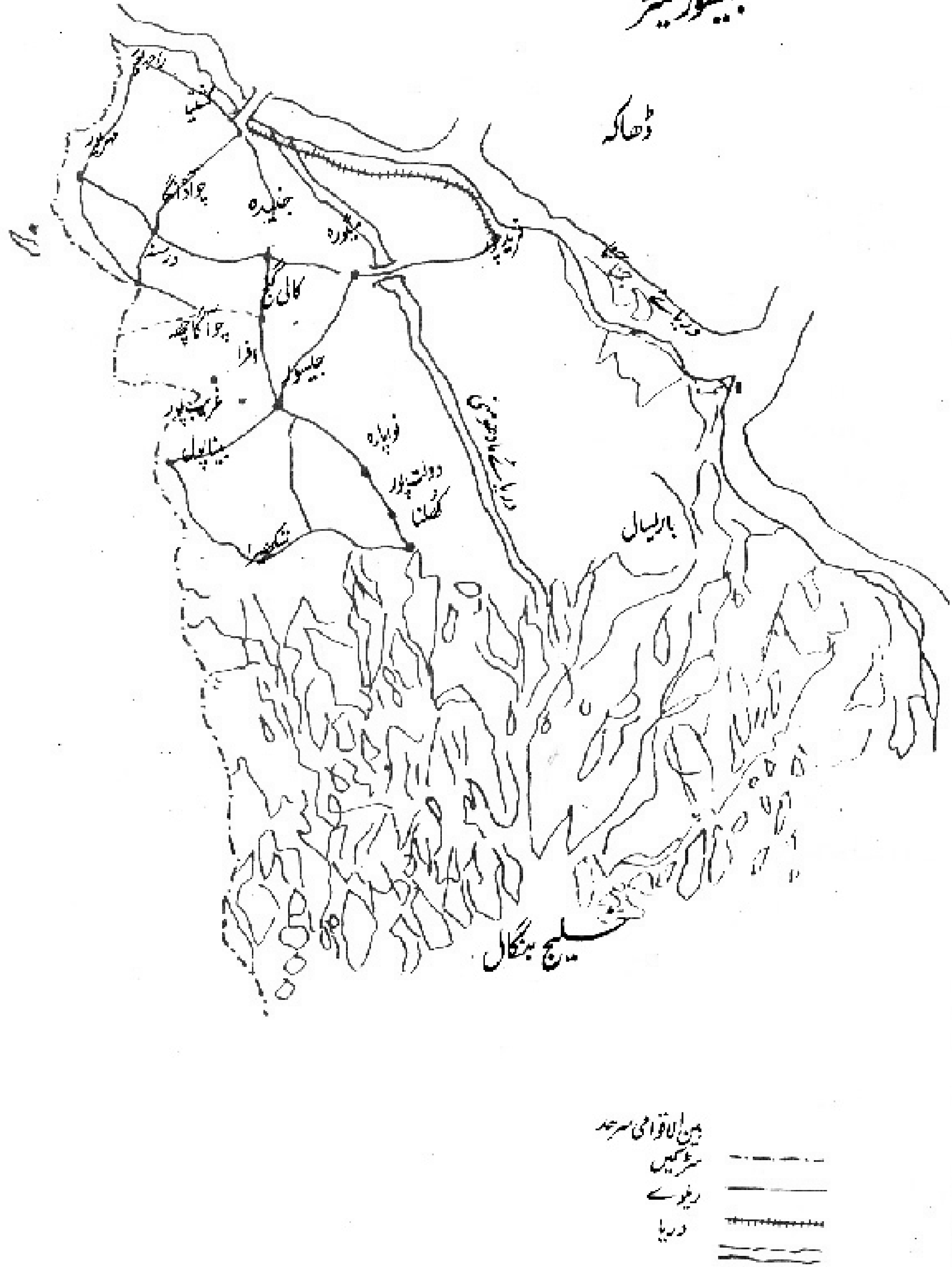
فوجی ذہن عموماً حملے کا رُخ متعین کرتے وقت رسل و رسائل کے ذرائع کو بہت اہمیت دیتے ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا تین راستے ہی بھاری تعداد میں ٹرکوں، توپوں اور ٹینکوں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوسکتے تھے، لیکن بھارتی منصوبہ بندوں کی داد دیجیے کہ انہوں نے متوقع راستوں میں سے کسی کو بھی نہ اپنایا۔ انہوں نے باقاعدہ جنگ سے پہلے ہمارے علاقے میں جہاں جہاں قدم جما رکھے تھے، وہیں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہوگا ۲۱ نومبر کو جیسور سیکٹر میں ایک جھڑپ ہوئی تھی جس میں ہمارے چھ ٹینک اور دو سیبر طیارے تباہ ہوچکے تھے اور ایسٹرن کمانڈ نے شور مچایا تھا کہ بھرپور جنگ چھڑ گئی۔ یہ واردات بوہرہ یا غریب پور[1] کے مقام پر ہوئی تھی جہاں راتوں رات بھارت نے قبضہ کرلیا تھا اور ہم اسے پسپا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ ۹ ڈویژن کے وسائل کام میں لاتے ہوئے دشمن کے مورچوں کے سامنے حصار باندھ دیا تھا تاکہ وہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ (یہ بریگیڈیر محمد حیات کے ۱۰۷ بریگیڈ کا علاقہ تھا) دوسرا سرحدی علاقہ جو باقاعدہ جنگ سے قبل دشمن کے قبضے میں جاچکا تھا، درسنہ کے قریب جیبن نگر تھا جو بریگیڈیر منظور کے ۵۷ بریگیڈ میں واقع تھا۔ جنگ چھڑنے پر جیسور سیکٹر میں دشمن نے انہی مقامات سے آگے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ آئیے پہلے بریگیڈیر محمد حیات کے علاقے کا حال دیکھیں۔

غریب پور کے مقام پر ۵۰ مربع کلومیٹر علاقہ بھارت کے قبضے میں تھا۔ وہاں سے جیسور تک توپ کے گولے کا فاصلہ بمشکل ۱۱ یا ۱۲ کلومیٹر بنتا تھا۔ نومبر والے واقعہ کے بعد اگرچہ دشمن نے پیش قدمی روک لی تھی، مگر وقتاً فوقتاً جیسور کی طرف گولے پھینک کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ ۳ دسمبر کو بھرپور جنگ چھڑنے کے بعد گولہ باری میں مزید شدت آگئی اور دشمن نے حصار توڑ کر آگے بڑھنے کی کوششیں شروع کردیں۔ ہماری طرف سے تین پلٹنیں یعنی ۶ پنجاب، ۱۲ پنجاب، ۲۱ پنجاب اور ۲۲ فرنٹیئر فورس کی ایک کمپنی اسے روکے ہوئے تھی جن کی پوزیشن برندہ آٹھ آر (R-8) اور محمد پور کے علاقے میں تھی۔ دشمن نے گھیرا توڑ کر جیسور کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر ہماری فوج نے زبردست مزاحمت کی۔ دشمن بار بار اس حصار سے سر ٹکراتا اور ہر بار پسپا ہوکر اپنے کچھار میں دب جاتا۔ یہ رسّا کشی ساٹھ گھنٹے جاری رہی، گویا ۶ دسمبر کی صبح تک دشمن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

---

[1] یہ دونوں مقامات قریب قریب تھے۔

جیسور سیکٹر


ڈھاکہ
جھنیدہ
جیسور
کالی گنج
نوپارہ
دولت پور
کھلنا
باریسال
خلیج بنگال
بین الاقوامی سرحد
سڑکیں
ریلوے
دریا

اسی حصار پر جیسور کے دفاع کا انحصار تھا، کیونکہ اگر ایک دفعہ بند ٹوٹ جاتا، تو ریلا سیدھا جیسور میں رکتا، کیونکہ درمیان میں کوئی دفاعی لائن نہ تھی، بلکہ زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ جیسور کے دفاعی قلعے میں راشن اور ایمونیشن تو وافر مقدار میں تھا، مگر وہاں لڑنے والے نہ تھے۔ وہی سپاہی جو سرحد کے ساتھ ٹنگے ہوئے تھے، اُنھی کو واپس آکر جیسور کے اردگرد مورچے سنبھالنے تھے۔ یہ سپاہی جیسور سے قریب ترین مقام پر بیناپول (۴۳ کلومیٹر) اور بعید ترین مقام پر شکھیرہ (۹۰ کلومیٹر) میں تھے۔ بریگیڈیر محمد حیات جو ایک عمدہ فوجی کمانڈر سمجھے جاتے تھے، اِس نکتے کو بخوبی جانتے تھے کہ اگر غریب پور والا حصار ٹوٹ گیا، تو سرحدوں سے سپاہی واپس لاکر جیسور کا دفاع منظّم کرنے سے پہلے دشمن جیسور میں داخل ہو جائے گا۔ بہت سے ذرائع نے تصدیق کی ہے کہ انھوں نے جنگ چھڑنے سے پہلے اپنے جی او سی میجر جنرل ایم۔ایچ۔ انصاری کو اِس خطرے سے آگاہ کیا تھا اور اجازت چاہی تھی کہ وہ سرحدوں سے کچھ نفری واپس بلاکر جیسور میں رکھ لیں تاکہ دشمن کو کم از کم اتنی دیر کے لیے روکا جاسکے کہ باقی نفری جیسور پہنچ جائے۔ جنرل انصاری نے جو ۴۵ کلومیٹر پیچھے منگورہ کے مقام پر بیٹھے تھے، اِس اقدام کی اجازت نہ دی کیونکہ جنرل نیازی نے کہہ رکھا تھا کہ جب تک تین چوتھائی آدمی شہید یا زخمی نہ ہو جائیں، سرحدوں سے کوئی پیچھے نہ ہٹے۔

بریگیڈیر حیات نے یہ سرکاری حکم مان لیا، لیکن اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ غریب پور کا حصار ٹوٹنے کے بعد جیسور میں قلعہ بند ہونے کے بجائے کھلنا کی طرف پسپا ہونا مفید ہوگا تاکہ سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی نفری کو اکٹھا کرنے کا وقت مل سکے۔ اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے جنگ سے قبل اہم ہتھیاروں کا ایمونیشن جیسور سے کھلنا منتقل کر دیا تھا۔ یہ کارروائی جنگی منصوبے کے سراسر منافی تھی۔ دفاعی منصوبے میں کہا گیا تھا کہ سرحدوں سے پسپا ہو کر "جیسور" اور "جنیدہ" کے دفاعی قلعوں میں بھرپور لڑائی لڑی جائے گی اور اگر بفرض محال اِن قلعوں کو چھوڑنا پڑا، تو پسپائی منگورہ کی طرف ہوگی نہ کہ کھلنا کی طرف۔ بریگیڈیر حیات کے افسروں کا کہنا ہے کہ منگورہ یا مادھوتی کی طرف پسپائی کا کسی منصوبے میں ذکر نہ تھا، اس لیے منصوبے کے منافی کارروائی کا الزام سراسر غلط ہے، جبکہ ایسٹرن کمانڈ کے بریگیڈیر باقر صدیقی کا کہنا ہے کہ یہ بات زبانی طور پر جنرل انصاری کو بتائی گئی تھی اور تحریری طور پر اس کا ذکر دفاعی منصوبے میں اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ جونیئر افسر "پیچھے کی طرف دیکھنا شروع نہ کر دیں"۔

پسپائی کا تعین کس طرف اور کس سطح پر کیا گیا تھا، اِس سے قطع نظر بریگیڈیر حیات نے کھلنا کو ترجیح دی اور جنگ کے تیسرے روز (۵ دسمبر) ایک پٹھان کمانڈنگ آفیسر کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا: "دیکھنا، کہیں سوتے ہوئے پکڑے نہ جانا، اگر ہمیں جیسور چھوڑنا پڑا، تو ہمارا رُخ منگورہ کی طرف نہیں کھلنا کی طرف ہوگا۔"

اِدھر بریگیڈیر حیات اپنی پسپائی کا رُخ متعین کر رہے تھے اور اُدھر دشمن گھیرا توڑنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہمارے سپاہیوں کو پیچھے دھکیل کر اپنے گلے کا طوق ذرا وسیع کر لیا تھا، مگر مکمل طور پر گھیرا توڑنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ گھیرا کھلا ہونے کے بعد اب ہماری پلٹنوں کی دفاعی لائن قائم کھولا، سنتوش نگر اور امرت بازار کی سیدھ میں آگئی تھی۔ گھیرے کی نئی پوزیشنوں کی وجہ سے ساتھ والی پلٹن (۲۲ ایف ایف) کی پوزیشن کو بھی بدلنا پڑا۔ اس پلٹن کی ایک کمپنی کو جو بیناپول کی سرحدی چوکی پر تھی چھ کلومیٹر پیچھے سارچہ کے مقام پر منتقل کر دیا گیا اور دوسری کمپنی جو راگھوناتھ میں تھی، اُسے بھی پیچھے ہٹا کر جھنگر گاچہ میں متعین کیا گیا۔ گویا مجموعی طور پر ہمارا حصار سرحد سے اور پیچھے آگیا تھا۔

قت

بریگیڈیر حیات کے بریگیڈ (۱۰۷) کو بھارت کے ۹ ڈویژن کا سامنا تھا۔ اس نے چھ دسمبر کو حصار توڑنے پر اپنی پوری طا

صَرف کردی۔ پہلا دھاوا صبح کے وقت بولا جو ناکام رہا، دوسرا حملہ ۱۱ بجے کے قریب کیا، جو بے اثر ثابت ہُوا، البتہ دوپہر کو اُس کی تیسری کوشش جزوی طور پر کامیاب ہوگئی۔ اس کا ہراول دستہ ہماری ایک پلاٹون (تقریباً ۳۰ آدمی) کو روندتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔ بدقسمتی سے اس شگاف کو پُر کرنے کے لیے فالتو نفری دستیاب نہ تھی۔ جو سپاہی جہاں موجود تھے، انہیں وہاں سے ہٹانے سے ایک اور شگاف پیدا ہوسکتا تھا، چنانچہ ۸ پنجاب کے سیکنڈ اِن کمانڈ (نائب سالار) میجر یحییٰ نے جسیور میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی کہ ہماری دفاعی لائن میں شگاف پڑنے سے دشمن کے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں جلیسور / جنیدہ روڈ کی طرف دوڑی جارہی ہیں۔ بریگیڈیر حیات کو یہ پیغام کوئی تین بجے سہ پہر (۶ دسمبر) ملا۔ ۲۲ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل شمس اُس وقت اُن کے پاس تھے۔ بریگیڈیر حیات نے شمس سے کہا کہ وہ اپنی پلٹن کو مینا پول / جلیسور روڈ سے ہٹا کر کُھلنا / جلیسور روڈ پر "نوال بارہ" کے مقام پر لے جائیں اور ایک کمپنی کو جلیسور شہر کے چوک میں چھوڑ جائیں تاکہ باقی پلٹنوں کو صحیح سمت میں جانے میں رہنمائی کرسکے۔ پسپائی ـــــ جانب کُھلنا ـــــ کی اطلاع وائرلیس پر باقی پلٹنوں کو بھی دے دی گئی۔

بریگیڈیر حیات اور اُن کے ہیڈ کوارٹر نے ساڑھے پانچ بجے شام جلیسور کو خیرباد کہا جب وہاں دشمن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انہوں نے کُھلنا کی طرف روانگی میں اتنی عجلت دکھائی کہ جلیسور میں مدفون ایمونیشن کے ذخیرے بھی نذرِ آتش نہ کرسکے۔ غیرملکی صحافیوں نے جو بھارتی افواج کے ساتھ تھے مجھے بتایا کہ انہوں نے ہمارے بریگیڈ کمانڈر کا خالی خیمہ دیکھا جس کی ایش ٹرے میں آدھا جلا ہُوا سگریٹ رکھا تھا، وہاں کلرکوں کے دفتر دیکھے جہاں ٹائپ کی مشینوں میں ابھی تک کاغذ چڑھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی عجلت کا کوئی جواز نہ تھا، کیونکہ یہ ہیڈ کوارٹر چھ دسمبر کی شام کو خالی کیا گیا اور بھارتی دستے ۷ دسمبر کی دوپہر کو جلیسور میں داخل ہُوئے۔ دراصل بھارت اندھادھند جلیسور میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اس "دفاعی قلعے" کو مسخر کرنے میں بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے وہ اگرچہ ۶ دسمبر کی شام یا سہ پہر کو اس کے گرد و نواح میں پہنچ چکا تھا، مگر داخل ہونے سے پہلے بھرپور تیاری ضروری سمجھتا تھا۔[1]

بریگیڈیر حیات کے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ چھ دسمبر کی شام کو جلیسور سے منگورہ جانے والی سڑک دشمن کے قبضے میں جاچکی تھی، اس لیے اس طرف پسپائی میں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ تاثر حقیقت کے برعکس ہے کیونکہ رات گئے اسی راستے سے ہمارے کئی افسر منگورہ گئے اور انہیں وہاں دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ لیفٹیننٹ کرنل احسان جو اسی راستے سے گزرے بتاتے ہیں کہ انہوں نے راستے میں اپنی ملٹری پولیس کے دستے دیکھے جن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ جلیسور سے منگورہ جانے والی ٹریفک کی رہنمائی کریں۔ انہیں جگہ جگہ سڑک کے مرمّت شدہ حصّے نظر آئے تاکہ ٹریفک بلا رکاوٹ گزر سکے۔ اس کے علاوہ جلیسور سے جنیدہ جانے والی سڑک پر بھی چھ دسمبر کی رات کو ۱۰ بجے تک ہمارے آدمی بلا روک ٹوک گزرتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بریگیڈیر محمد حیات دِلی طور پر منگورہ کی طرف ہٹنا چاہتے، تو وہ ہٹ سکتے تھے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ بریگیڈیر حیات نے جو راستہ اختیار کیا، اُدھر کیا پیش آیا ـــــ

۶ اور ۷ دسمبر کی درمیانی رات ۱۰۷ بریگیڈ کے لیے بڑی بھگدڑ کی رات تھی۔ اِس بریگیڈ میں جتنی نفری تھی اُسے پتہ تھا کہ اگر پسپا

[1] ایسٹرن کمانڈ کی فراہم کردہ اطلاع پر ریڈیو پاکستان ۸ دسمبر تک دعویٰ کرتا رہا کہ جسیور ہمارے پاس ہے اور وہاں گھمسان کی جنگ ہورہی ہے۔

ہونا پڑا، تو جیسور جانا ہو گا۔ ان میں سے کوئی بھی کھلنا جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اکثر نے "نواں پارہ" کا پہلے کبھی نام تک نہ سنا تھا۔ افسر کھلنا کی طرف مراجعت میں پوشیدہ حکمت سے ناآشنا تھے۔ وہ حکم کے بندھے ہوئے بھاگم بھاگ جیسور پہنچے جہاں چوک میں ۲۲ ایف ایف کی کمپنی (میجر بابر) نے انہیں کھلنا کی راہ پر ڈال دیا۔ اس بھگدڑ میں ایک ایمبولینس گاڑی 'نواں پارہ' کے بجائے "غریب پور" کی طرف دوڑتی نظر آئی۔ اُسے روک کر ڈانٹا گیا کہ "بدھو، تمہیں اتنا بھی اندازہ نہیں کہ نواں پارہ کدھر ہے، تم مخالف سمت میں منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو۔" ڈرائیور نے سنجیدگی سے جواب دیا: "سر! مجھے سمت کا اندازہ ہے مگر میں غریب پور سے زخمیوں کو نکالتے وقت بعض سپاہیوں سے وعدہ کر آیا تھا کہ انہیں دوسرے پھیرے میں لے جاؤں گا، وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

۱۰۷ بریگیڈ کو دراصل ایک ہی جست میں نواں پارہ نہیں پہنچنا تھا۔ اُسے راستے میں سب سے پہلے[1] سنگ میل نمبر ۳۰ پر روکا گیا۔ وہاں اُس کے قدم نہ جم سکے، تو وہ سنگ میل نمبر ۲۵ پر جا اٹکا، وہاں دشمن کو آتے دیکھا، تو مزید پانچ میل پیچھے ہٹ گیا۔ پہلا معرکہ ۸ دسمبر کو سنگ میل نمبر ۲۰ پر پڑا اور پھر ایک ہی جست میں سنگ میل نمبر ۹ (دولت پور) تک پسپا ہو گیا۔ وہاں اُس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کی صبح کو یہ بریگیڈ دولت پور چھوڑ کر کھلنا جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ ڈھاکہ سے جنگ بندی کی اطلاع آگئی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بریگیڈیئر حیات نے یہ پرائیویٹ جنگ بڑی مہارت سے لڑی اور وہ دشمن کا ایک ڈویژن اپنے تعاقب میں دولت پور تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

کھلنا کا ہنگامی بریگیڈ جو کرنل فضل حمید کے زیر کمان تھا، جیسور خالی ہونے کی خبر سن کر بدک اٹھا۔ اُس نے اسی رات (۶ اور ۷ دسمبر) اپنا بوریا بستر لپیٹا اور نقل و حمل کا جو ذریعہ ملا، اُسے قابو کر کے ڈھاکہ کی طرف کوچ کر گیا۔ کھلنا میں نیوی کے سب سے سینیئر افسر کمانڈر گل زریں تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے اعلیٰ افسروں کو اطلاع دیے بغیر ایک گن بوٹ میں سوار ہو کر سمندر کی طرف نکل گئے۔ جس طرح جیسور افراتفری میں چھوٹا، اس سے کہیں زیادہ بھاگم بھاگ میں کھلنا خالی ہو گیا۔

اب آئیے جنرل انصاری کے دوسرے بریگیڈ (۵۷) کی طرف جس کی قیادت بریگیڈیئر منظور کے سپرد تھی۔ بریگیڈیئر منظور اپنی شرافت اور ملائمت کے لیے مشہور تھے۔ ان کے بریگیڈ کو بھارت کے ۴ پہاڑی ڈویژن[2] کا سامنا تھا۔ بریگیڈیئر منظور کے پاس دو مکمل پلٹنیں (۲۹ بلوچ اور ۱۸ پنجاب) اور ایک کمپنی تھی جو ۱۲ پنجاب (آر اینڈ ایس) سے تعلق رکھتی تھی۔ بھاری ہتھیاروں میں ان کے پاس توپ خانے کی ایک رجمنٹ اور (M-24) ٹینکوں کا ایک سکواڈرن تھا۔ یہ ٹینک درحقیقت ایسٹرن کمانڈ کی "ملکیت" تھے جو آڑے وقت میں کسی بھی بریگیڈ کو دیے جا سکتے تھے۔ انہیں کشتیا کے پاس رکھا گیا تھا تاکہ وہ دریائے گنگا کے دونوں جانب کسی بھی مقام پر استعمال کیے جا سکیں۔

دسمبر کے ابتدائی ایام میں بریگیڈیئر منظور اپنے ہیڈ کوارٹر (جھنیدہ) میں بیٹھے تھے کہ اُن کو خبر ملی دشمن "جیبن نگر" (جہاں وہ پہلے ہی اپنے قدم جما چکا تھا) سے پھیل کر درسنہ کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ درسنہ ایک سرحدی قصبہ تھا جس کے ہاتھ سے جانے سے گورنر مالک کے آبائی قصبے چواڈانگا کے لیے راستہ کھل جاتا تھا اور اگر دشمن چواڈانگا پہنچ جاتا، تو وہ اگلی

لہ ان دنوں سڑک پر میلوں کے نشان تھے۔ کلومیٹر کا نظام ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔

لہ۲ 4 MOUNTAIN DIVISION

[illegible] جنیدہ یا [illegible] جا سکتا تھا۔ بریگیڈیئر منظور نے دشمن کو سرحدی علاقے میں روکنے کے لیے خود آگے جانا مناسب سمجھا، مگر اُن کی آمد سے جنگی صورتِ حال پر کوئی اثر نہ پڑا۔ جنگ کے پہلے دن ہی دشمن نے جھپٹ کر درسنہ پر قبضہ کر لیا۔ بریگیڈیئر منظور نے اب ساری توجہ چوآڈانگا پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے سرحدی چوکیوں سے اپنی ساری نفری بُلا کر وہاں جمع کی اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ دشمن ایسا بے مروّت نکلا کہ اس نے بریگیڈیئر منظور کی توقّعات پر پُورا اُترنے کے بجائے اپنے لیے ایک نئی جہت کا انتخاب کیا۔ قیاس تھا کہ اس کا رُخ جیسور جنیدہ روڈ پر واقع کالی گنج کی طرف ہوگا تاکہ ۵۷ بریگیڈ اور ۱۰۷ بریگیڈ ایک دوسرے سے کٹ جائیں۔ دشمن کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے جنرل انصاری نے اپنے کرنل سٹاف کرنل آفریدی کو بھیجا جنہوں نے ۵ پنجاب کی دو کمپنیوں اور "جیسّن نگر" سے اُکھڑی ہوئی ۳۸ ایف ایف کے اجزا کو ملا کر ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) قائم کر لی اور کالی گنج کے قریب دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ تعجّب کی بات کہ اِدھر بھی دشمن طلوع نہ ہُوا۔ آخر وہ گیا کہاں؟

بھارتی فوج مکتی باہنی کی اُنگلی پکڑے برساتی نالوں سے بچتی، کھیتوں اور کچّے راستوں سے ہوتی ہوئی چوآڈانگا اور جنیدہ کے درمیان سادھوہٹی کے مقام پر جا نکلی جہاں اُس کا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی رات کو پہلے پہل اس کی صرف ایک کمپنی اور چند ٹینک (ایک ٹروپ) وہاں پہنچے۔ اس کمپنی کے کمانڈر بھارتی میجر نے بعد میں بتایا کہ وہ پہلی رات کا پتا رہا کہ مجھے کہاں ڈالا گیا ہے۔ ایک طرف جنیدہ ہے، دوسری طرف چوآڈانگا۔ میں دو جبڑوں میں پس کر رہ جاؤں گا۔ رات رام رام کرتے گزری، مگر ہماری طرف سے اس کی گوشمالی کو کوئی نہ پہنچا۔ اگلی صبح دس بجے راشن ڈھونے والی چند گاڑیاں چوآڈانگا سے جنیدہ جا رہی تھیں۔ بھارتی میجر نے بوکھلا کر قبل از وقت اُن پر فائر کروا دیا۔ وہ گاڑیاں واپس چوآڈانگا چلی گئیں اور یُوں بریگیڈیئر منظور کو اطلاع ملی کہ اُن کا اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ بلا تاخیر سادھوہٹی پر حملہ کر کے رکاوٹ کو دُور کر دیں، دوسرا یہ کہ وہ چوآڈانگا (جو STRONG POINT تھا) کو اپنا مسکن بنائے رکھیں جہاں اُن کا تقریباً سارا بریگیڈ جمع تھا۔ انہوں نے جنگی صورتِ حال کا نہایت ملائمت سے جائزہ لیا۔ پہلے ایک افسر کو بھیجا کہ جاؤ بھئی ذرا پتہ تو کراؤ کہ واقعی دشمن وہاں ہے بھی کہ نہیں۔ جب اس کی تصدیق ہو گئی، تو انہوں نے ایک مُٹھی بھر دستہ روانہ کیا کہ جاؤ بھئی اُس کو وہاں سے ہٹا دو۔ وہ ناکام لوٹ آیا، تو پھر میجر زاہد کی قیادت میں ایک پلاٹون کو روانہ کیا۔ اب چھ دسمبر ہو چکی تھی۔ دشمن نے گزشتہ ۳۶ گھنٹوں میں نہ صرف اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط بنا لی تھی، بلکہ مزید فوج اور ٹینک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میجر زاہد پلاٹون لے کر دشمن کے قریب پہنچے اور حملے کی تیّاری کرنے لگے۔ اتنے میں حکم ملا کہ نہیں بھئی، واپس آ جاؤ، ایک پلاٹون بیچاری کیا کرے گی۔

اسی دن (۶ دسمبر) جیسور بھی خالی کیا جا چکا تھا۔ شام کو جنرل انصاری نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جنیدہ میں ٹیلی فون کیا۔ بریگیڈیئر منظور کا بریگیڈ میجر، میجر جعفر بولا۔ جنرل انصاری نے کہا: "جعفر، کیا ہو رہا ہے؟" "کچھ خاص کام تو نہیں ہو رہا۔" "اچھا، تو تم منگورہ آ جاؤ اور (کرنل) آفریدی سے بھی کہو کہ وہ (کالی گنج سے) واپس آ جائے۔ یہاں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے دفاع کے لیے کوئی نہیں — جیسور تو جا ہی چکا۔"

اسی رات کرنل آفریدی کی نفری بھی جنیدہ واپس آ گئی اور اگلی صبح (۷ دسمبر) میجر جعفر نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا عملہ، فائلیں اور

لفٹنٹ گاڑیوں پر لادے اور منگورہ روانہ ہو گئے۔ آخری گاڑی گیارہ بجے نکلی۔ اسی شام دشمن گولی چلائے بغیر ۹ ڈویژن کے دوسرے "دفاعی قلعے" میں داخل ہو گیا۔

بریگیڈیئر منظور شرافت سے چوآڈانگا میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا میں یہاں بیکار بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ اگر یہیں محصور ہو گیا تو راشن اور ایمونیشن بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہیں دے گا، کیوں نہ کشتیا چلا جائے وہاں چل کر دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا بنتی ہے؟ چنانچہ وہ ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی سپاہ کو کشتیا منتقل کرتے رہے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے شہر کے اردگرد فوجی دستے متعین کر دیئے تاکہ دشمن کسی طرف سے ان پر حملہ نہ کر دے۔ انہوں نے حکام بالا کو بھی اطلاع کر دی کہ میں کشت و خون سے بچتا ہوا کشتیا پہنچ گیا ہوں۔ اس پر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر نے اُن سے کہا کہ وہ سڑک کے راستے جنیدہ پہنچ جائیں یا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ منگورہ کی طرف چلے جائیں۔ بریگیڈیئر منظور نے ذرائع آمد و رفت کی قلت اور متوقع مزاحمت کے پیش نظر کسی ایک طرف جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے کشتیا ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

اُن کی وہاں موجودگی فوجی نقطۂ نگاہ سے اگر مفید ہو سکتی تھی تو یوں کہ دشمن مشرق کی طرف مزید پیش قدمی سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے بائیں بازو پر ایک پاکستانی بریگیڈ موجود ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ دشمن نے ۸ دسمبر کو جنیدہ کی طرف سے ایک بھاری جمعیت کشتیا کی طرف روانہ کی۔ بریگیڈیئر منظور نے میجر زاہد کی قیادت میں ۱۸ پنجاب کی ایک کمپنی اور میجر شیر الرحمن کی قیادت میں نصف سکواڈرن ٹینک روانہ کیے۔ ایک بجے دوپہر رن پڑا جو تقریباً ۳ گھنٹے جاری رہا، بالآخر دشمن ہمت ہار بیٹھا اور پسپا ہو گیا۔ دسمبر کی ساری جنگ میں ۵۷ بریگیڈ کی یہ پہلی اور آخری لڑائی تھی جو اس نے لڑی۔ خدا کے فضل سے اس میں اُسے سرخروئی حاصل ہوئی اور میجر زاہد اور میجر شیر کو ستارۂ جرأت کا اعزاز ملا۔

دشمن بھاگتے ہوئے اپنی لاشیں بھی وہیں چھوڑ گیا۔ ایک لاش جو ایک بھارتی جرنیل کے بیٹے کی تھی، سڑک کے کنارے یوں پڑی تھی کہ دھڑ سڑک کی ڈھلوان پر تھا اور سر سڑک کے کنارے۔ میدان کارزار کی گرما گرمی میں ہمارا ایک ٹینک اس مردے کی کھوپڑی کچلتا ہوا گزر گیا۔ بعد میں دورانِ اسیری میجر زاہد اور میجر شیر کو اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی۔ اُن پر الزام تھا کہ "انہوں نے بھارتی لاشوں کو جان بوجھ کر مسخ کیا ہے۔"

کشتیا پر بری حملہ تو ناکام ہو گیا، مگر توپوں اور طیاروں کی بمباری زور پکڑ گئی۔ وہ باری باری کشتیا پر "چاند ماری" کرتے جس سے نقصان کم اور دہشت زیادہ پھیلتی۔ "ہتھوڑے اور آہرن" والی مثال تھی، لیکن ہتھوڑے چلانے والوں کے تھکنے سے پہلے آہرن کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور بریگیڈیئر منظور نے طے کیا کہ وہ ہارڈنگ پل کے ذریعے دریائے گنگا پار کر جائیں تو شاید محفوظ ہو جائیں گے۔

انہوں نے ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کشتیا کو خیر باد کہا۔ راتوں رات ۵۷ بریگیڈ کی بیشتر نفری، گاڑیاں اور جنگی ساز و سامان پل پار کر کے ۱۶ ڈویژن کے علاقے میں اُتر گیا، مگر اگلی صبح بھارتی فضائیہ نے پل پر بمباری کر کے اسے ناقابل استعمال بنا دیا (ابھی تک اگر یہ پل بھارتی فضائیہ سے محفوظ تھا، تو شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحیح و سالم اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اب اسے یوں استعمال ہوتے دیکھ کر وہ رہ نہ سکے)۔

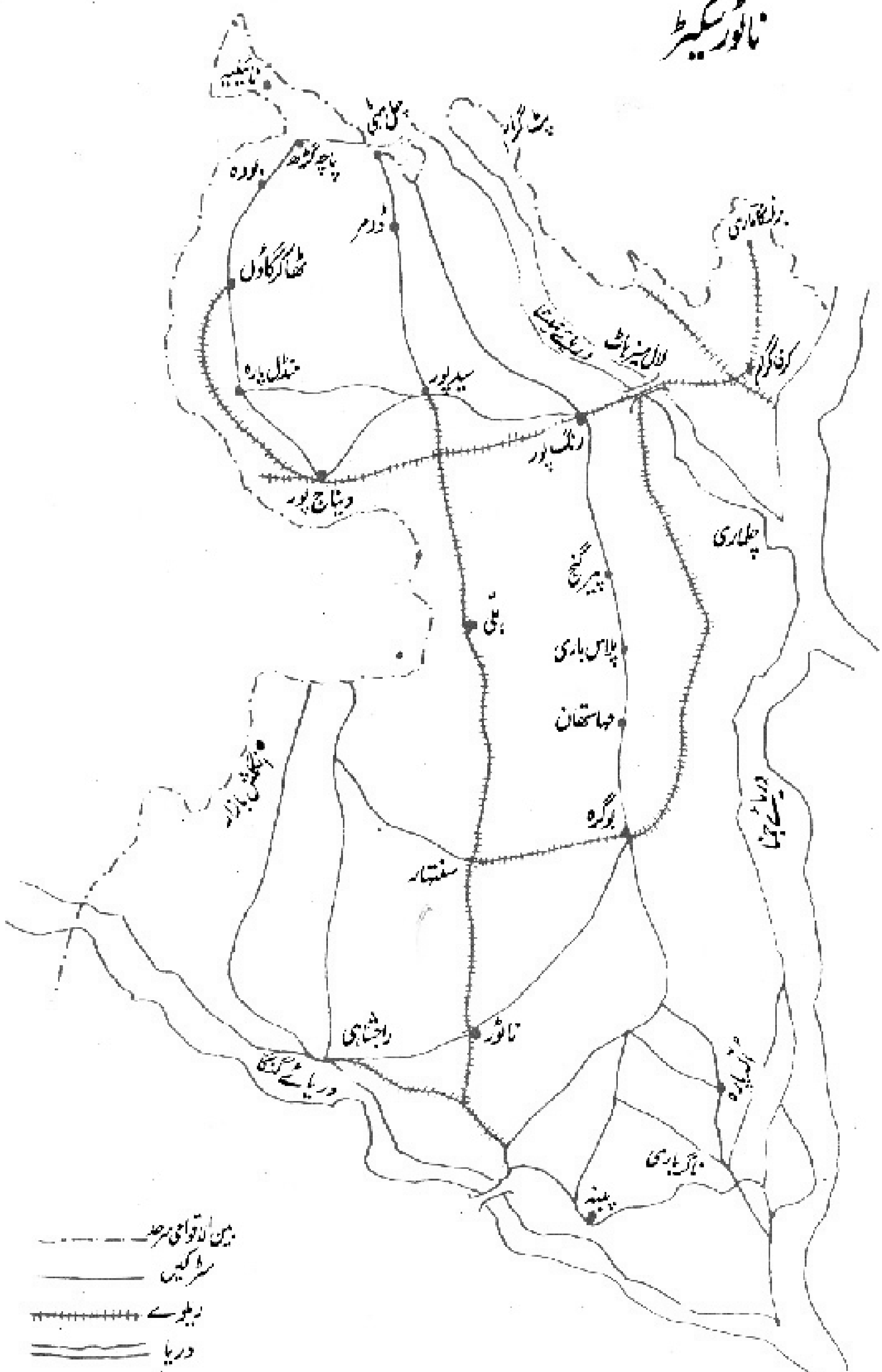
اب مسئلہ یہ تھا کہ باقی ماندہ نفری دریا کے پار کیسے جائے؟ اس نفری میں صرف فوجی یا نیم فوجی ہی نہیں بہت سے بنگالی یا بہاری

[illegible] بھی تھے جو پاکستان سے محبت کی وجہ سے پاک فوج کے بغیر اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے تھے۔ اِن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اکثر نے اپنے اپنے اثاثے چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں میں باندھ کر بغل میں دبا رکھے تھے۔ اُن کو دریا پار کرانے میں کور آف انجینیرز کے میجر راٹھور نے بہت کام کیا۔ وہ کشتیوں کے ذریعے انہیں ٹوٹے ہوئے پل سے لے کر اگلے کنارے تک لے جاتے۔ اُن کو وہ بوڑھی عورت یاد ہے جو پوٹلی بغل میں دبائے شکستہ پل سے سالم کشتی میں اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پوٹلی سنبھالتی تھی، تو خود گرنے کا ڈر تھا اور اپنے آپ کو بچاتی تھی، تو پوٹلی ہاتھ سے جاتی تھی۔ ایک فوجی جوان نے اُسے سہارا دے کر پوٹلی سمیت کشتی میں بٹھا دیا اور وہ دعائیں دیتی پار اُتر گئی۔

گویا جیسور سیکٹر میں ہمارے ۹ ڈویژن کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کا ایک بریگیڈ (۱۰۷) کھلنا کی طرف نکل گیا تھا اور دوسرا (۲۰۵) دریا پار کر کے شمالی بنگال میں اُتر گیا تھا۔ درمیان میں دشمن کے لیے راستہ کھلا تھا کہ وہ جتنی فوج چاہے لے کر مشرق کی طرف پیش قدمی کرتا جائے۔

چنانچہ اب بھارت نے منگورہ کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ۵۰ پنجاب اور ۳۸ ایف ایف کی وہی نفری تھی جو کرنل آفریدی کالی گنج سے لے کر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کی طرف آ گئے تھے۔ اِس چھوٹی سی جمعیت کو پہلے منگورہ میں رکھا گیا اور پھر مزید پیچھے ہٹا کر دریائے مادھومتی کے مشرقی کنارے پر تعینات کیا گیا۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر مزید پسپا ہو کر فرید پور پہنچ چکا تھا جہاں جنرل انصاری مصلے پر بیٹھے اپنے جیالوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرتے رہتے تھے۔

ہماری مٹھی بھر یہ فوج دریائے مادھومتی کے کنارے دشمن کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر دشمن نے اُس کی طرف اُس وقت تک توجہ نہ دی جب تک ۵۷ بریگیڈ کا آخری فرد دریائے گنگا کے پار نہ اُتر گیا۔ چنانچہ دو دن کے وقفے کے بعد دشمن نے ہماری دفاعی پوزیشن پر فائرنگ کی۔ ہمارے جوانوں نے ڈٹ کر فائر کا جواب فائر سے دیا۔ دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا چڑھ دوڑنے میں خطرہ ہے، لہٰذا اس نے مکتی باہنی کی مدد سے سات کلومیٹر اُوپر جا کر ایک ایسا مقام منتخب کیا جہاں عارضی پل باندھ کر دریا پار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات کے توقف کے بعد ہماری دفاعی پوزیشن پر دائیں پہلو سے حملہ کر دیا۔ اس ریلے میں ہمارے تھکے ہارے سپاہیوں کے قدم متزلزل ہو گئے، اُنہیں وہاں سے ہٹا کر فرید پور پہنچا دیا گیا ۔۔۔ وہ وہاں ۱۵ دسمبر کو پہنچے اور اگلی صبح دشمن نے ابھی اُن کے نئے دفاعی قلعے پر دستک نہیں دی تھی کہ ڈھاکہ سے اطلاع آ گئی کہ "جنگ بندی" کا فیصلہ ہو گیا ہے۔


ناٹور سیکٹر
چل ہٹی
پٹ گرام
پانچ گڑھ
بودہ
ڈومر
ٹھاکر گاؤں
لال منیر ہاٹ
سید پور
رنگ پور
دیناج پور
چلماری
پیر گنج
ہلی
پلاس باری
بوگرہ
سنتاہار
دریائے جمنا
راجشاہی
ناٹور
دریائے گنگا
پبنہ
بین الاقوامی سرحد
سڑکیں
ریلوے
دریا

ناٹور سیکٹر (۱۶ ڈویژن)

شمالی بنگال باقی صوبے سے دو دریاؤں یعنی گنگا اور جمنا کے ذریعے کٹا ہوا تھا۔ اس کی مغربی اور شمالی سرحد بھارت سے ملتی تھی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا سیکٹر تھا اور اس کی کمان ایک وسیع الجثہ اور وسیع القلب جرنیل کے سپرد تھی۔ ان کا نام میجر جنرل سید نذر حسین شاہ تھا جو اپریل کے آغاز میں ۱۶ ڈویژن کے جی او سی بن کر آئے تھے۔ اپریل سے دسمبر تک شرپسند دل کی سرکوبی اور دیگر انتظامی امور کی وجہ سے وہ اپنے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہو چکے تھے۔

ان کے سیکٹر کی جغرافیائی خصوصیات یہ تھیں کہ اس کے شمال مشرق میں ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے ٹیسٹا (TISTA) کہتے تھے۔ اس دریا کے اس پار لال منیر ہاٹ کا ننھا سا ہوائی اڈہ، کری گرام کا ریلوے جنکشن اور پٹ گرام جیسے اہم علاقے واقع تھے۔ گویا یہ علاقہ بذات خود ایک سیکٹر یا سب سیکٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سیکٹر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا شمالی بارڈر کٹا پھٹا تھا۔ سرحد کہیں شرما کر پانچ دس میٹر اندر سکڑ آتی تھی اور کہیں جرأت رندانہ دکھا کر پندرہ بیس میٹر باہر پھیل جاتی تھی۔ نقشے پر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کھلے ہاتھ کی انگلیوں کے پور نظر آرہے ہیں۔ کوئی اونچا کوئی نیچا۔ ان کی دفاعی اہمیت یہ تھی کہ اگر ہر کٹاؤ کے ساتھ فوجی متعین کیے جاتے تو ۱۶ ڈویژن کا بیشتر حصہ انہی کی نذر ہو جاتا اور اگر انہیں یونہی چھوڑ دیا جاتا تو مکتی باہنی اور اس کے آقا انہیں باسانی ہڑپ کر لیتے۔

اس سیکٹر میں کھلے ہاتھ کی بلند ترین انگلی بھارت کی گردن کو جا چھوتی تھی جو مغربی بنگال / بہار کو آسام / تریپورہ سے ملاتی تھی۔ اس گردن نما پٹی کی چوڑائی بمشکل ۲۵ کلومیٹر تھی جس کے جنوبی کونے پر ہماری سرحد کا بلند ترین ابھار ٹیٹالیہ (TITALYA) تھا۔ دشمن کو ڈر تھا کہ اگر پاکستان نے ٹیٹالیہ سے بڑھ کر ۲۵ کلومیٹر کی پٹی پر قبضہ کر لیا تو بھارت کی افواج دو حصوں میں کٹ کر رہ جائیں گی۔ چنانچہ اس نے جنگ سے پہلے ہی ٹیٹالیہ پر قبضہ کر کے اپنے آنے جانے کا راستہ محفوظ کر لیا تھا۔ اسی طرح باقی انگلیوں کے پور بھی اس نے قلم کر کے اپنی سرحد سیدھی کر لی تھی۔

اس سیکٹر کی مغربی سرحد گھوڑے کی کاٹھی کی مانند تھی۔ دباؤ والی جگہ پر "ہلی" کا مقام تھا جس پر سواری کرنے کی بھارت نے بہت کوشش کی۔ اس کا احوال آگے آئے گا۔ ہلی کے شمال اور جنوب میں سرحد پھولے ہوئے پیٹ کی طرح باہر نکل آئی تھی۔ اس حصے یا سب سیکٹر میں یہی خطرہ تھا کہ دشمن اس دباؤ کو اور دبا کر شمالی بنگال میں گھس آئے اور وہاں سے ۵۴ کلومیٹر دور اس سڑک کو کاٹ دے جو شمال اور جنوب میں رابطے کا واحد ذریعہ تھی۔ اس علاقے میں سڑک کے علاوہ شمالاً جنوباً ریل کی پٹڑی بھی تھی مگر وہ ہلی کے مقام پر بارڈر سے اتنی قریب گزرتی تھی کہ ریلوے اسٹیشن کی عمارت ایک ملک میں تھی اور پٹڑی دوسرے ملک میں۔ گزشتہ

ناری کے علاقے کے حالات خراب ہوتے ہی یہاں سے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت معطل ہوگئی تھی۔

باقی سڑکیں جو شمال سے پھوٹتی اور جنوب کی طرف بڑھتی تھیں شمالی حصّے تک محدود تھیں۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کو ملانے والی سڑکیں بہت کم تھیں۔ یہاں کی سب سے بڑی سڑک ۱۵۲ کلومیٹر لمبی تھی جو رنگ پور کو بوگرہ سے ملاتی تھی۔ بوگرہ سے ایک سڑک ناٹور کو نکلتی تھی جہاں جنرل نذر حسین شاہ کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھا اور دوسری گولنڈو گھاٹ کے راستے ڈھاکہ کو جاتی تھی۔

اس علاقے میں دشمن کے عزائم کیا ہو سکتے تھے؟ ایک خیال یہ تھا کہ وہ اپنی گردن کو جسے SILI GURI NECK کہا جاتا ہے، بچانے کے لیے شمال سے حملہ آور ہوگا اور ہماری دفاعی پوزیشنوں کو لپیٹتا ہوا جنوب کی طرف بڑھے گا۔ اس مفروضے کی حمایت میں یہ دلیل دی جاتی تھی کہ اس سیکٹر میں دشمن کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی گردن کو بچانا اور "رابطے کے اس راستے" کو محفوظ اور وسیع کرنا ہے جہاں سے چین کی سرحد مشکل ۵۵ کلومیٹر دور تھی۔ اس راستے کو وسیع کر کے وہ پاکستان اور چین کے درمیان فاصلہ بھی بڑھا سکتا تھا۔ اس مفروضے کی مخالفت میں یہ کہا جاتا تھا کہ اگر وہ شمال سے پیش قدمی کرتا ہوا سو دو سو کلومیٹر بھی آ جائے تو سقوطِ مشرقی پاکستان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؛ البتہ اگر اس کا مقصد صرف بنگلہ دیش قائم کرنے کے لیے ایک قطعۂ زمین حاصل کرنا ہے تو یہ حکمتِ عملی اس کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

دشمن کے عزائم کے متعلق مفروضہ یہ تھا کہ وہ ہلّی کے راستے داخل ہو کر سیدھا مشرق کی طرف بڑھے گا تاکہ اس سیکٹر کو دو حصوں میں کاٹ دے اور اوپر والے حصّے کو بنگلہ دیش بنا لے۔ اس سے اُس کے دو مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ سلیگوری والا راستہ وسیع اور محفوظ ہو جاتا تھا اور دوسرے بنگلہ دیش کے لیے موزوں قطعۂ زمین بھی ہاتھ آ جاتا تھا جس میں زرخیز زمین کے علاوہ لال منیر ہاٹ کا ہوائی اڈہ، کری گرام، رنگ پور اور دیناج پور کے ریلوے جنکشن بھی شامل تھے۔

دشمن کے عزائم کے اس تجزیے کے پیشِ نظر جنرل نذر حسین شاہ نے اپنے دونوں بریگیڈوں کو اس طرح لگایا کہ دشمن شمال سے جنوب کی طرف بآسانی پیش قدمی کر سکے نہ ہلّی کے راستے داخل ہو کر شمالی بنگال کو دو حصّوں میں کاٹ سکے۔ انہوں نے بریگیڈیئر انصاری کی قیادت میں ۲۳ بریگیڈ کو رنگ پور میں رکھا اور اس کی نفری شمال، شمال مشرق اور شمال مغرب کے سرحدی علاقوں میں پھیلا دی۔ دوسرا بریگیڈ (۲۰۵) بریگیڈیئر تجمل حسین کی زیرِ نگرانی بوگرہ میں تعینات کیا اور اس کی قابلِ اعتبار پلٹن ۴ فرنٹیئر فورس کو ہلّی کے دفاع پر لگا دیا۔ باقی نفری کو ہلّی کے شمال اور جنوب میں پھیلا دیا۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے جو ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کیے گئے تھے، ان میں سے ایک کو راجشاہی میں رکھا گیا۔ اس کی کمان بریگیڈیئر اشرف کے سپرد تھی جن کی زیرِ کمان نفری زیادہ تر نیم عسکری تنظیموں سے لی گئی تھی۔ اس علاقے میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جو دشمن کی توجّہ کو اپنی جانب مبذول کرتی۔ صرف دریائے گنگا میں کشتیوں کے ذریعے داخل ہو کر راجشاہی کے پاس اترنے کی کوشش کر سکتا تھا، مگر کشتیوں پر وہ کہاں تک ٹرک، توپیں اور ٹینک لاتا؟ امکان یہی تھا کہ اس حصّے میں شدید جنگ نہیں ہوگی۔

جنرل نذر حسین کے دفاعی وسائل میں ایک چیز ایسی تھی جو مشرقی پاکستان میں نایاب تھی، یہ تھے ٹینک۔ اس صوبے کی واحد ٹینک رجمنٹ ــــ ۲۹ کیولری ــــ ۱۶ ڈویژن کے پاس تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میدانِ جنگ کی نبض پہچاننے والے ماہرین کا خیال تھا کہ اگر مشرقی پاکستان میں کہیں ٹینکوں کی لڑائی ہو سکتی ہے تو شمالی بنگال میں، کیونکہ یہاں ندی نالے نسبتاً کم تھے اور کھیتوں میں پانی زیادہ عرصہ نہیں رُکتا تھا۔ اس رجمنٹ میں جس کا ہیڈ کوارٹر رنگ پور میں رکھا گیا تھا، ایم ۲۴ ساخت کے

ٹینک تھے جو دوسری جنگِ عظیم میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد کوریا (۱۹۵۱ء) کی جنگ میں بھی اپنے جوہر دکھا چکے تھے۔ ان کا ماضی شاندار سہی، مگر حال خستہ تھا۔ ان کی توپوں کے دہانے اتنے ملائم (GROOVELESS) ہوچکے تھے کہ گولہ پوری شدت سے باہر نہیں نکلتا تھا اور جب نکلتا تھا تو ایک ہزار میٹر سے دُور نہ جاتا تھا۔ ان ٹینکوں کی رفتار بھی عمر کے ساتھ ساتھ مدھم پڑ چکی تھی، مگر بے اولاد گھرانے میں اپاہج بچّہ بھی بڑی اہمیّت رکھتا ہے۔ ہمیں مشرقی پاکستان میں اس کیولری رجمنٹ پر بڑا فخر تھا۔ یہ ہمارے زورِ بازو کی علامت تھی۔ جہاں ٹینک ہوتے، جوانوں کے حوصلے بلندتر ہوجاتے۔ جنرل نیازی نے اس رجمنٹ کے حصّے بخرے کرکے انہیں مختلف جگہوں پر بانٹ رکھا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقے میں ہمارے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور دشمن کی حوصلہ شکنی ہو۔

اس کے برعکس ہندوستانی رسالہ جدید ترین ٹینکوں سے لیس تھا جس میں پی ٹی سلسلے (T-55، T-56) کے رُوسی ٹینک بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ بھارت کے اپنے کارخانوں میں بنے ہوئے وجنتا (VIJANTA) ٹینک تھے۔ ان دونوں قسم کے ٹینکوں کی مجموعی قوت کے سامنے دوسری جنگِ عظیم کے ایم ۲۴ ٹینک کوئی حیثیّت نہ رکھتے تھے۔

جنگ کا اتار چڑھاؤ دیکھنے سے پہلے آیئے ایک نظر اس صورتِ حال پر ڈال لیں جو جنگ سے پہلے یہاں رُونما ہو چکی تھی۔ اس سیکٹر میں ہلّی دشمن کی آنکھ میں شروع سے کھٹک رہا تھا۔ اس نے اس کے سامنے اپنا ۲۰ ڈویژن، رسالے اور توپ خانے سمیت ڈال رکھا تھا اور گزشتہ ستمبر سے اس پر گولہ باری بھی شروع کر رکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مکتی باہنی کی کارروائیاں زور پکڑتی گئیں تو اس گولہ باری میں بھی شدت آتی گئی۔ ماہِ نومبر میں تو شاید ہی کوئی دن گزرا ہو جب ہلّی میں گولوں کی بارش نہ ہوئی ہو۔ اس گولہ باری کی آڑ میں کئی بار دشمن نے آگے بڑھ کر ہلّی پر قبضہ بھی کرنا چاہا، مگر ہر بار ہماری ۴ فرنٹیئر فورس (۴ ایف ایف) نے اس کے عزائم خاک میں ملا دیئے۔

۲۱ نومبر کو جب بھارت نے ہماری سرحدوں کے اندر پاؤں جمانے کے لیے سرحدی موڑوں کو ہڑپ (WAR OF SALIENTS) کرنے کی کوشش کی، تو اس نے ہلّی پر بھی دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی ایک پلٹن ۲ "گارڈز" نے ہلّی اور اس کے نواح میں قاسم، بابر، نواپارہ اور راپٹور کی چوکیوں پر ہلّہ بول دیا۔ قاسم پوسٹ جو ہلّی کے شمال میں کوئی دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، دشمن نے روند ڈالی۔ وہاں ہمارے دس جوان شہید اور بارہ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں نوجوان پلاٹون کمانڈر بھی شامل تھا۔ یہاں سے دشمن نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بابر پوسٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر اس کی پیش قدمی کو روک دیا گیا اور دشمن کو بھاری نقصان پہنچا۔ اس کے تین ٹینکوں میں سے صرف ایک ریلوے لائن عبور کرکے ہمارے علاقے میں گھس آنے میں کامیاب ہوا، مگر ایک ٹینک شکن توپ کے گولے نے اسے وہیں بے کار کر دیا۔ دشمن نے کھُلی جارحیت کے اس نشان کو کھینچ کر واپس لے جانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۲۷ نومبر کو چکن تکّے کی پلیٹ پر جنرل نیازی جن صحافیوں سے ملے، وہ اسی جارحیّت کو دیکھنے کے لیے ڈھاکہ سے یہاں لائے گئے تھے۔

اگرچہ ۴ ایف ایف نے بابر پوسٹ پر دشمن کی یلغار کو ناکام بنا دیا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اگر بھارت کی تازہ دم فوج نے اس پر اچانک حملہ کر دیا، تو کہیں اس کا حشر بھی قاسم پوسٹ والا نہ ہو ـــــ چنانچہ وہاں پر متعین پلاٹون (تقریباً ۳۰ آدمی) کو واپس بلا لیا گیا۔ دشمن نے اس چوکی کو خالی پاکر چپکے سے قبضہ کر لیا اور یوں پہلی بار اس کے پاؤں ریلوے لائن کے مشرقی جانب جم گئے۔

آپ کو یاد ہوگا ۲۹ کیولری کے چند ٹینک دریائے گنگا پر "ہارڈنگ پل" کے پاس رکھے گئے تھے کہ بوقت ضرورت دریا کے دونوں جانب استعمال کیے جائیں۔ ہلی پر مذکورہ دباؤ پڑا تو ان ٹینکوں کا ایک ٹروپ (۴ ٹینک) یہاں لایا گیا جسے ۴ ایف ایف کی ڈی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر واقع ڈنگا پارہ میں رکھا گیا۔ بار پوسٹ سے جو نفری واپس بلائی گئی تھی اسے بھی ڈنگا پارہ میں متعین کیا گیا۔ ڈنگا پارہ سے شمال میں ۳۴ پنجاب (آر اینڈ ایس) کی ایک پلاٹون لگا دی گئی جس کے پاس ٹینک شکن توپیں تھیں۔ اس طرح وسائل کو مجتمع کرنے کے بعد ہم میں اتنی سکت آچکی تھی کہ ہم دوبارہ حملہ کرکے بار پوسٹ پر قبضہ کرلیں مگر اس ارادے میں کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ اسی اثنا میں دشمن نے بھی وہاں اپنی طاقت میں اضافہ کرلیا تھا۔

چنانچہ یہی طے ہوا کہ یہ پوسٹ خالی کرانے کے بجائے اپنی نفری کو یوں متعین کیا جائے کہ دشمن کا پھیلاؤ بڑھنے نہ پائے؛ لہٰذا دو کمپنیوں کو ہم نے جنوب اور مشرق کی طرف ڈال کر بار پوسٹ کے گرد حصار باندھ دیا اور تیسری کمپنی (سی کمپنی) کو ریلوے لائن کے پشتے کی مغربی جانب رکھا گیا تاکہ دشمن اس جانب آزادانہ نقل وحرکت نہ کرسکے۔ اس کمپنی کی قیادت ایک جری افسر میجر اکرم کے سپرد تھی۔ نومبر کے آخر میں دشمن نے میجر اکرم کی پوزیشن کو تباہ کرکے اپنے پہلو سے کانٹا نکالنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ۳ دسمبر کو جنگ کا آغاز ہونے تک میجر اکرم اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔

بھرپور جنگ سے پہلے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ دشمن نے چھوٹے چھوٹے موڑوں، نکڑوں اور ابھاروں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان میں ٹیٹالیہ، پٹ گرام اور بڑنگاماری شامل تھے ٹیٹالیہ پر قبضہ کرکے دشمن نے بہار اور آسام کے درمیان سلیگڑی کا راستہ ۲۵ کلومیٹر سے بڑھا کر ۵۵ کلومیٹر کرلیا تھا۔ بھارت نے اسی پر اکتفا کرنے کے بجائے مزید جنوب کی طرف پیش قدمی کی تھی اور ۲۸ اور ۲۹ نومبر کی درمیانی رات کو اس نے پاچاگڑھ پر اور اس سے اگلے دو روز میں بودہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ یوں دشمن اِس علاقے میں ایک اہم قصبے ٹھاکر گاؤں پر دستک دینے لگا۔

اس کے علاوہ اس نے دریائے ٹیٹا (TISTA) کے پار سرحدی چوکیوں کو رفتہ رفتہ پیچھے دھکیل کر ۲ دسمبر تک کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ تک پہنچا دیا تھا۔ اس طرف دباؤ پڑنے سے انتہائی مشرقی جانب جو چوکیاں چلماری تک پھیلی ہوئی تھیں انہیں بھی سمیٹ کر کڑی گرام میں اکٹھا کرلیا گیا۔ ۳ دسمبر تک یہی حالت تھی۔

بھرپور جنگ چھڑتے ہی بھارتی فضائیہ نے کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ پر گولہ باری میں اضافہ کردیا۔ اگرچہ یہ دونوں شہر ماہ نومبر ہی سے ان حملوں کو سہہ رہے تھے، مگر ۴ دسمبر کو ان پر قہر کی جو آگ برسی انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہاں پڑے رہنے اور مار کھاتے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا؛ چنانچہ اسی شام جی او سی (میجر جنرل نذر حسین) نے حکم دیا کہ دریائے ٹیٹا کے پار جتنی افواج ہیں وہ تمام رنگپور میں جمع ہوجائیں۔ پسپائی ۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی رات کو شروع ہوئی اور اگلے روز شام تک جاری رہی۔

فوج کو پسپا ہوتے دیکھ کر مقامی محب وطن شہری بھی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ پاک فوج کے بغیر وہاں ان کا رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے، کیوں نہ فوج کے ساتھ چلا جائے تاکہ جو اس پر بیتے گی وہ بھی سہہ لیں گے؛ چنانچہ جو ریل گاڑی ہمارے سپاہیوں کو رنگ پور پہنچانے کے لیے کڑی گرام سے روانہ ہوئی، اس پر یہ لوگ بھی ٹوٹ پڑے۔ اس علاقے میں یہ آخری ریل گاڑی تھی جو متحدہ پاکستان کے دور میں فوج کی زیر نگرانی چلائی جارہی تھی۔ اس کے انچارج ایک میجر تھے جنہوں نے اس ناقابل فراموش سفر کا حال مجھے یوں بتایا:

گاڑی میں اکثریت شہری باشندوں کی تھی جن میں سے بیشتر زار و قطار رو رہے تھے۔ پاکستانی سپاہی کھڑکیوں میں سے رائفلوں کی نالیاں باہر نکال کر متوقع حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ گاڑی کا آخری ڈبہ ایک کھلے پلیٹ فارم کی مانند تھا جس کے اردگرد ریت کی بوریوں کی دیوار کھڑی کی گئی تھی۔ اندر ہلکی توپیں (مارٹر) نصب تھیں تاکہ گھمبیر حملے کی صورت میں انہیں استعمال میں لایا جاسکے۔ چلتی گاڑی پر جگہ جگہ باغیوں نے فائرنگ کی جس کا جواب کھڑکیوں سے فائر کر کے دیا گیا، مگر گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہی۔ دریائے تیستا پر ریلوے کا پل سامنے نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے عبور کرنے والے تھے کہ کچھ دور "رضاکاروں" کا ایک دستہ نظر آیا۔ ہم رک گئے تاکہ انہیں بھی ساتھ لیتے چلیں۔ ہم نے انہیں بلایا، مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہم ان ناعاقبت اندیش لڑکوں کی بے حسی پر حیران آگے بڑھ گئے۔ دریا کو عبور کر کے پل اڑا دیا۔ اس کے بعد انہی لڑکوں نے زور کا نعرہ لگایا: "جئے بنگلہ" (بنگلہ دیش زندہ باد)۔ دراصل وہ مکتی باہنی کے لوگ تھے جو جاسوسی کی خاطر رضاکاروں کی صفوں میں گھس آئے تھے۔"

۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی رات کو دریائے تیستا کے پار کی ساری نفری رنگ پور پہنچ گئی۔ اسی رات بقیہ شمالی سرحد سے بھی ہمارے سپاہی اتنے پیچھے ہٹ آئے کہ ہماری دفاعی لائن رنگ پور اور ٹھاکر گاؤں کی سیدھ میں آ گئی۔ ٹھاکر گاؤں پر مزید دباؤ پڑا تو ہم دیناج پور کے شمال میں منڈل پارہ پہنچ گئے۔ منڈل پارہ اور رنگ پور کے درمیان ایک اور سڑک شمالاً جنوباً جاتی تھی جس کے شمالی سرے پر ڈومر واقع تھا۔ اب ڈومر سے بھی فوجی دستے واپس بلا کر سید پور میں جمع کیے گئے۔ گویا ۶ دسمبر کو ہماری نئی دفاعی لائن رنگ پور، سید پور اور دیناج پور کی سیدھ میں تھی۔ رنگ پور میں مقیم ۲۳ بریگیڈ اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس نے جنگ کے آخر تک اس دفاعی لائن کو پنکچر نہ ہونے دیا۔

دوسری طرف ہلی کے مقام پر دشمن نے بھرپور جنگ چھڑتے ہی ہمارے دفاع میں شگاف ڈالنے کے لیے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ ۴ ایف ایف جو کئی مہینوں سے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی، اب بھی اپنے مورچوں میں جمی رہی۔ البتہ ہلی سے ۱۱ کلومیٹر شمال میں "چرائی" کے مقام پر دشمن کو ہماری پوزیشن میں ایک "ملائم مقام" مل گیا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ "چرائی" میں ابتداً ہمارے پاس ایک کمپنی تھی (دسو سوا سو افراد) مگر نومبر کے آخر میں قائم پوسٹ والے سانحے کے بعد یہاں سے کچھ نفری ہٹا کر ایک اور جگہ بھیج دی گئی تھی جہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ گویا چرائی میں ہماری دفاعی پوزیشن کمزور تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے کمانڈروں کا خیال تھا کہ یہاں کسی بڑے بھارتی حملے کی توقع رکھنا عبث ہے کیونکہ نہ تو وہاں سے کوئی بڑی سڑک پھوٹتی ہے جس پر چڑھ کر وہ آگے بڑھ سکے اور نہ اس علاقے میں کوئی ایسا مقام ہے جو جنگی نقطۂ نظر سے بھارت کے لیے اہمیت رکھتا ہو۔ مزید برآں عام خیال یہ تھا کہ اس علاقے میں ——— کم از کم نقشے پر ——— ایسے دلدلی علاقے ہیں جن سے ٹینکوں کا گزرنا مشکل تھا۔

مکتی باہنی اس علاقے کے تمام خدوخال سے واقف تھی۔ اس نے اپنے آقاؤں کو بتایا کہ ہلی پر سر پھوڑنے کے بجائے اگر اس کے اوپر یا نیچے قسمت آزمائی کی جائے تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ بھارت نے جب چرائی کا انتخاب کیا، تو مکتی باہنی والوں نے اسے بتایا کہ علاقہ بالکل خشک پڑا ہے اور وہاں پاکستان کی نفری بھی بہت تھوڑی ہے، چنانچہ دشمن نے مکتی باہنی کی رہنمائی میں

ایک کمپنی اور چند ٹینک ادھر روانہ کر دیے۔ انھوں نے چراتی کو گھیرے میں لے کر اس کے جنوبی حصے سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہاں پر موجود پلاٹون کمانڈر نے شام کو اپنے افسرِ اعلیٰ کو وائرلیس پر اطلاع دی :

"میرے بائیں جانب سے دشمن کے ٹینک گزر کر رنگ پور / بوگرہ روڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

افسر نے کہا "بیوقوف، یہاں ٹینک کہاں؟ شام کے دھندلکے میں تم نے بھینسیں دیکھی ہوں گی۔"

پلاٹون کمانڈر نے عرض کیا "سر، آپ درست ہی کہتے ہوں گے مگر ان بھینسوں پر سو ملی میٹر دہانے کی توپیں فٹ ہیں جو ہمارے مورچوں کو ایک ایک کر کے نگلتی جا رہی ہیں۔"

اگرچہ دشمن چراتی کو چیر کر آگے بڑھ چکا تھا مگر اس کو پتہ تھا کہ اس کے جنوبی پہلو میں میجر اکرم اپنی سی کمپنی کے ساتھ موجود ہے؛ چنانچہ بھارت نے دو مضبوط دستے شمال اور جنوب کی طرف روانہ کیے تاکہ وہ میجر اکرم کی کمپنی کو دو جبڑوں میں بھینچ کر ختم کر دیں۔ میجر اکرم نے اپنی دفاعی پوزیشن اس طرح ترتیب دی تھی کہ وہ دونوں طرف سے دفاع کر سکتا تھا؛ چنانچہ دشمن پے در پے حملے کرتا رہا، لیکن میجر اکرم کا بال بیکا نہ کر سکا؛ حتیٰ کہ ۶ دسمبر آ گیا۔ اس نے مزید ۴۸ گھنٹے دونوں جانب سے سی کمپنی کی پوزیشن پر پورا دباؤ ڈالا، لیکن بے سود۔ اب ۸ دسمبر ہو چکی تھی اور میجر اکرم کی کمپنی غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن میں ڈٹی ہوئی تھی۔ میجر اکرم ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں جا جا کر اپنے جوانوں کو شاباش دے رہے تھے۔ اسی کیفیت میں اچانک ٹینک کا ایک گولہ ان پر آ پھٹا اور وہ موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے۔ ان کی موت کے سنگین صدمے نے ان کے سپاہیوں کو بے حد متاثر کیا۔ دشمن نے میجر اکرم کی شہادت کے بعد دوبارہ شمال اور جنوب سے سی کمپنی پر بھرپور حملہ کیا جو کامیاب رہا۔ ہمارے جوانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ صرف چالیس جوان اس معرکے سے سلامت بچ کر بٹالین سے جا ملے۔ میجر اکرم کو بعد از شہادت "نشانِ حیدر" کا اعزاز دیا گیا۔

جب دشمن میجر اکرم سے نپٹ رہا تھا تو اس کا ایک اور دستہ مشرق کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا رنگ پور / بوگرہ روڈ پر پیر گنج کے مقام پر پہنچ گیا جس کی ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ لڑائی ابھی سرحد کے ساتھ ساتھ میجر اکرم کے علاقے میں ہو رہی ہے۔ ۷ دسمبر کی سہ پہر کو میجر جنرل نذر حسین شاہ رنگ پور کا دورہ کر کے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بریگیڈیئر تجمل حسین اور چند اور افسر تھے۔ جب وہ شمال کی طرف سے آتے ہوئے پیر گنج کا موڑ مڑنے لگے تو ان پر اچانک فائر کھل گیا۔ وہ فوراً گاڑیاں چھوڑ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں اوجھل ہو گئے۔ جنرل نذر حسین شاہ نے بعد میں مجھے فاتحانہ انداز میں بتایا "دشمن کے ٹینک مجھ سے بمشکل ۵۰۰ میٹر دور تھے۔" درختوں کے جھنڈ سے ہوتے ہوئے جنرل نذر اور ان کے ساتھی ایک دیہات میں پہنچے جہاں ایک خدا ترس بنگالی نے انہیں ایک محفوظ راستے سے رنگ پور جانے والی سڑک پر پہنچا دیا۔

میجر جنرل نذر حسین شاہ کی جیپ پر دو ستاروں والی پلیٹ لگی تھی جو وہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس پلیٹ کے الٹی طرف تین ستارے لگے تھے تاکہ لیفٹیننٹ جنرل نیازی کی آمد پر بھی اسے استعمال کیا جا سکے۔ بھارتی سپاہی یہ پلیٹ ٹرافی کے طور پر اتار کر اپنے افسروں کے پاس لے گئے تو وہ تین ستارے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے لیفٹیننٹ جنرل پر داؤ مارا ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ جب سے بھرپور جنگ کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھی، جنرل نیازی ڈھاکہ سے باہر ہی نہیں نکلے تھے۔

جنرل نذر حسین کی گمشدگی کی اطلاع ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں پہنچی۔ میں بھی اس وقت وہاں آپریشن روم میں موجود تھا۔ ہم سب کا گمان یہی تھا کہ وہ گرفتار ہوچکے ہیں، چنانچہ میجر جنرل جمشید کو (جو سول آرمڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل اور ۳۹ ہنگامی ڈویژن کے جی او سی تھے) اسی وقت ہیلی کاپٹر کے ذریعے روانہ کیا گیا تاکہ وہ جنرل نذر کی جگہ ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ناکام ٹوئیاں مارنے کے بعد جنرل جمشید بے نیل مرام کوئی دو بجے واپس ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رات کی تاریکی میں جنرل نذر کے ہیڈ کوارٹر میں اُتر نہ سکے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی کہ جنرل نذر حسین شاہ بخیر و عافیت واپس اپنی جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔

یوں جی او سی کو خطرے میں ڈال کر یہ بنیادی معلومات حاصل کی گئیں کہ رنگ پور / بوگرہ روڈ پر دشمن پہنچ چکا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اگر اس کو فی الفور وہاں سے ہٹایا نہ گیا، تو ۱۶ ڈویژن مستقل طور پر دو حصوں میں بٹ کر رہ جائے گا یعنی ۲۳ بریگیڈ اوپر رنگ پور میں اور ۲۰۵ بریگیڈ نیچے بوگرہ میں ـــــ اور اگر ڈویژن تقسیم ہوجائے تو وہ ڈویژن نہیں رہتا، چنانچہ جی او سی نے دو دستے تیار کرنے کا حکم دیا۔ ہر دستے کو ٹاسک فورس (TASK FORCE) کا نام دیا گیا۔ ایک ٹاسک فورس کو اوپر سے حملہ آور ہونا تھا اور دوسری کو جنوب سے۔ بنیادی فلسفہ وہی تھا جو بھارت نے میجر اکرم کی سی کمپنی کے خلاف استعمال کیا تھا یعنی دشمن کو دو جبڑوں میں بھینچ کر تباہ کر دینا۔ جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت بریگیڈیئر تجمل کے سپرد تھی جبکہ شمالی ٹاسک فورس لے کر بریگیڈیئر نعیم کو رنگ پور کی طرف سے حملہ آور ہونا تھا۔ (بریگیڈیئر نعیم نومبر کے آخر میں شرپسندوں کے تعاقب میں جنوب سے شمال کی جانب جانکلے تھے اور جنگ چھڑنے کے بعد وہیں رُک گئے تھے۔) اڑتالیس قیمتی گھنٹے گزر گئے، مگر کوئی جبڑا ابھی دشمن کے نزدیک نہ پہنچا۔ بریگیڈیئر نعیم سے جب بھی پوچھا گیا، وہ یہی کہتے رہے کہ بس حملے کا پلان بنا رہا ہوں۔ اُدھر بریگیڈیئر تجمل نے خود جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت کرنے کے بجائے ۳۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سلطان سے پیر گنج کی طرف جانے کو کہا۔ جب اس میں تاخیر ہوئی، تو بریگیڈیئر تجمل نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان پر خوب لعن طعن کی، یہاں تک کہ ان پر بزدلی کا الزام لگایا۔ اس پر لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو اتنا طیش آیا کہ وہ فوراً اپنی پلٹن ٹرکوں میں لاد کر پیر گنج کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کا خیال تھا پیر گنج سے ذرا اِدھر وہ ٹرکوں سے اُتر کر پوزیشن سنبھال لیں گے اور فوجی سکھلائی کے مطابق دشمن تک پیش قدمی کریں گے، مگر وہ یہ بھول گئے کہ گزشتہ دو تین دنوں میں دشمن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا، بلکہ اس نے اس دوران میں مزید ٹینک اور پیدل فوج بُلا کر اپنی دفاعی پوزیشن کو پیر گنج سے نیچے تک پھیلا دیا ہے؛ لہٰذا ابھی لیفٹیننٹ کرنل سلطان کی پلٹن ٹرکوں ہی پر تھی کہ دشمن کے ٹینکوں اور پیدل فوج نے ان پر فائر کھول دیا۔ ہراول کمپنی کو دشمن نے بھون کر رکھ دیا۔ کرنل سلطان سمیت سب آدمی شہید ہوگئے۔ بقیہ پلٹن سراسیمہ حالت میں پسپا ہونے پر مجبور ہوگئی۔ بریگیڈیئر تجمل کو خیال ہوا شاید دشمن ان کا تعاقب کرتا ہوا جنوب کی طرف پیش قدمی کرے گا؛ چنانچہ انہوں نے ۸ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی چند توپوں سمیت کمک کے طور پر روانہ کی۔ دشمن ابھی پیش قدمی کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ پیر گنج سے ذرا جنوب میں پلاس باڑی کے مقام پر رُک گیا تھا۔

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو بوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن بوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا؛ لہٰذا

بریگیڈیئر تجمل نے شمال مغرب میں ۴ ایف ایف کو ہلی میں اپنے پرانے مورچوں سے اکھاڑ کر واپس بلا لیا اور شمال مشرق میں چھوٹی چھوٹی چوکیاں مثلاً پھلچری گھاٹ، بوٹہ پارا اور گوبند گنج خالی کر دیں۔

یوں دشمن نے بوگرہ / رنگ پور روڈ پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا اور ۱۶ ڈویژن جنرل نذر حسین شاہ کی تمام تر جرنیلی کے باوجود مستقل طور پر دو حصوں میں کٹ گیا۔ شمالی بریگیڈ رنگ پور / سید پور / دیناج پور تک محدود تھا اور جنوبی بریگیڈ بوگرہ کے شمال تک۔ اب دونوں کو اپنی اپنی ڈفلی علیحدہ علیحدہ بجانی تھی۔ وہ جو فوجی مبصر کہہ گئے ہیں کہ ڈویژن ایک آرکیسٹرا کی مانند ہوتا ہے جس کے تمام تار موسیقار کے اشارے پر ہم آہنگ ہو کر بجتے ہیں، یہاں محض کتابی بات معلوم ہوتی تھی۔

اب دشمن کی نظریں بوگرہ پر تھیں جو ایک مشہور شہر اور اہم مواصلاتی مرکز تھا۔ جنرل نذر بوگرہ کی جنگ بریگیڈیئر تجمل کے سپرد کر کے نالور کی طرف پسپا ہو چکے تھے۔ بریگیڈیئر تجمل نے بوگرہ سے ۴ کلومیٹر شمال میں مہاستھان کے مقام پر دشمن کے سامنے دفاعی بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وہاں سڑک اور سڑک کے دونوں جانب ۸ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی کمپنی لگا دی۔ ۴ ایف ایف جو ہلی سے واپس بلائی گئی تھی اسے چند دن آرام دینے کے لیے بوگرہ ہی میں رکھا گیا۔ مہاستھان کا دفاع کرنے والی فورس شمال کی طرف سے آنے والے دشمن کا راستہ تکتی رہی اور وہ مکتی باہنی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہوا سڑک کو چھوڑ کر اس کے مشرقی جانب کھیتوں میں جا نکلا جہاں سے وہ مڑ کر ہماری پوزیشن کے جنوب میں آ گیا۔ ہماری لڑاکا نفری آگے شمال کی طرف تھی اور پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں کلرک، باورچی اور دوسرا عملہ تھا۔ دشمن نے انہیں اور وہاں پر موجود چند ٹرکوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد اس نے ہماری پشت سے ہم پر حملہ کر دیا۔

میجر ساجد جو ۳۲ پنجاب کی کمپنی کے قائد تھے دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ دشمن ہماری پشت پر بھی پہنچ سکتا ہے۔ میجر ساجد تو پکڑے گئے، مگر ان کے سپاہی مورچوں میں لڑتے رہے۔ ان میں سے بعض تو سامنے اور پیچھے سے بیک وقت حملے کی تاب نہ لا کر ہمت ہار بیٹھے، مگر حوالدار حکمداد اپنے مورچے میں ڈٹا رہا۔ اس پر دشمن نے تین حملے کیے لیکن اس نے تینوں پسپا کر دیے۔ ہر پسپائی کے ساتھ دشمن کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس پر ہندوستانی میجر نے اپنے قیدی میجر ساجد سے کہا: "اس جنونی کو روکو، ورنہ ہم اسے مورچے ہی میں روند ڈالیں گے۔" ساجد نے تامل سے کام لیا تو بھارتی افسر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مورچے پر حملہ کر کے اسے خاموش کر دیں۔ حکمداد اپنے مورچے میں تنہا تھا۔ اس پر حملہ آوروں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے جھک جھک کر یہ وار سہا اور جونہی دشمن آگے بڑھنے لگا اس نے تین آدمیوں کو گولیوں کے ایک برسٹ (بوچھاڑ) سے ڈھیر کر دیا۔

اب بھارتی میجر اور بپھرا۔ اس نے ریوالور میجر ساجد کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا: "اسے بند کراؤ، ورنہ تمہیں گولی مار دوں گا۔" میجر ساجد نے جو حکمداد کی آنکھوں سے اوجھل تھا زور سے کہا: "حکمداد! اب بس کرو۔" اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں جواب دیا: "صاب! اپنا امنیشن مکائی بیٹھے او تے مینوں آکھنے او بس کر، میرے کول اجے دو میگزیناں باقی ہن۔"[1] اس نے ہار نہ مانی اور دشمن نے مزید جانوں کی قربانی دے کر اسے مورچے ہی میں ختم کر دیا۔

---

[1] "صاحب! آپ اپنا امونیشن ختم کر بیٹھے ہو اور مجھے کہتے ہو بس کر، ابھی تو میرے پاس گولیوں کے دو میگزین باقی ہیں۔"

۱۲ دسمبر کو ہم مہاستھان سے پسپا ہو کر بوگرہ کے بیرونی حاشیے پر آ گئے۔ گویا اب بوگرہ کے دفاعی قلعے کی جنگ شروع ہونے والی تھی جس کے لیے بریگیڈیئر تجمل نے شہر کے چاروں طرف مورچے کھدوا رکھے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ دشمن کے طیارے اور توپیں اوپر سے گولے برساتے رہے اور ہم اپنے مورچوں میں بیٹھے گولہ باری سہتے رہے گویا ہتھوڑے اور آہرن والی بات شروع ہو گئی۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا کہ ہمیشہ ہتھوڑا چلانے والے ہاتھ پہلے تھک جاتے ہیں اور آہرن کی قوت برداشت میں فرق نہیں آتا۔ اس گولہ باری سے جب لوگ شہید اور زخمی ہونے لگے اور عمارتیں مسمار ہونے لگیں، تو حوصلے بھی پست ہونے لگے۔ جتنے آدمی گولوں یا گرنے والی عمارتوں کی اینٹوں کا شکار ہوتے انہیں ایک عمارت میں جمع کر دیا جاتا تاکہ جب حالات اجازت دیں گے، تو ان کی طرف توجہ دی جائے گی۔

بوگرہ میں قلعہ بند ہونے پر لیفٹیننٹ کرنل سرفراز ملک سے کہا گیا کہ وہ ۴۷ ایف ایف کی کمان سنبھال لیں، کیونکہ اس کے اصل کمانڈنگ آفیسر عباسی کی جگہ عارضی طور پر لیفٹیننٹ کرنل ممتاز ملک نے کمان سنبھال لی تھی اور وہ اب واپس ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر جا چکے تھے۔ کرنل سرفراز ۱۳ اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی بکھری ہوئی نفری کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ ایک پکے مکان کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں پھسلا۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو یہ تازہ انسانی خون تھا جو مکان کے دروازے سے بہتا ہوا برآمدے میں پھیل گیا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا، تو رات کے اندھیرے میں ڈھیر سارے زخمی جوان بے یار و مددگار کراہ رہے تھے۔ ابتدائی مرہم پٹی تو درکنار انہیں ہمدردی کے دو بول بھی میسر نہ تھے۔

ہماری فوج نے بوگرہ میں تین روز تک گولہ باری سہی، لیکن اس عرصے میں سپاہیوں کا مورال بہت متاثر ہو چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یوں پڑے پڑے وہ کب تک مار سہتے رہیں گے اور ان میں سے جو زخمی ہو جائیں گے، وہ کس مکان کی تاریکی میں اپنا خون دیتے رہیں گے۔ جو شہید ہو جائیں گے، ان کی لاشیں کہاں جائیں گی۔

۱۶ دسمبر کا سورج طلوع ہوا، تو دشمن بوگرہ کے شمالی کنارے پر ریلوے کراسنگ تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے وہ لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان کر رہا تھا کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، جنگ بند ہو چکی ہے۔ آؤ اپنے ہتھیار ڈال دو اور اپنی جان بچاؤ۔ ناحق خون بہانے کا کیا فائدہ؟ آؤ ہتھیار جمع کراؤ اور سلامتی کی گارنٹی لو، وغیرہ ـــــــ تعجب کی بات کہ ہمارے سپاہی یہ اعلان سن کر اپنی اپنی رائفل بغل میں دبائے دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔

بریگیڈیئر تجمل کو خبر ملی، تو وہ ان "کالی بھیڑوں" کے کردار پر بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح ہتھیار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں۔ اتنے میں ایک اسٹاف آفیسر ان کے پاس جنگ بندی کا پیغام لایا جو ایسٹرن کمانڈ کی طرف سے ابھی ابھی موصول ہوا تھا۔ اس پر بریگیڈیئر تجمل نے سپاہیوں کو اپنے حال پر چھوڑا اور خود بوگرہ سے مغرب کی جانب نکل گئے۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ مکتی باہنی کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے ان کی خوب خبر لی۔ جب وہ قیدی بن کر بھارتی افسروں کے سامنے لائے گئے تو ان کے بازو کی ہڈی ٹوٹ کر گلے کا ہار بن چکی تھی۔

باب ۱۹

برہمن باڑیہ سیکٹر (۱۴ ڈویژن)

مشرقی سرحد کُبڑے شخص کی طرح تھی ۔ اُوپر اور نیچے سے آگے کو جھکی ہُوئی اور درمیان میں پیچھے کو ہٹی ہُوئی ۔ اُوپر کا حصّہ سلہٹ سیکٹر کہلاتا تھا اور نیچے والا چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ ۔ درمیانی حصّے میں کومیلا اور اس سے ملحق علاقے تھے ۔ فوجی ذہنوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر برما کی سرحد سے ملا ہُوا چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ یا شمال میں سلہٹ کا علاقہ ہاتھ سے چلا بھی جائے، تو سقوطِ مشرقی پاکستان کی نوبت نہیں آئے گی، لیکن اگر کوئی حملہ کومیلا یا اس کے آس پاس سے ہوگا، تو اس کا اثر ڈھاکہ پہ پڑے گا ۔

زمانۂ امن میں (اگر کوئی ایسا زمانہ تھا) مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل عبدالمجید قاضی کے ۱۴ ڈویژن کے سپُرد تھی جس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں تھا ۔ جنرل قاضی نے ایک بریگیڈ کومیلا میں اور دوسرا اس کے شمال میں برہمن باڑیہ میں ڈال رکھا تھا اور ہنگامی طور پہ کھڑے کیے گئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں میں سے ایک سلہٹ میں قائم کیا گیا تھا ۔ نومبر کے آخر میں جب جی ایچ کیو نے ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دی کہ بھارت کا زوردار حملہ مشرقی جانب سے ہوگا، تو جنرل نیازی نے چاندپور میں ایک ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (میجر جنرل رحیم) کھڑا کر کے کومیلا والا بریگیڈ اس کے زیرِ کمان کر دیا اور ڈھاکہ میں متعیّن بریگیڈ بھی کومیلا کے جنوب میں فینی کے مقام پہ منتقل کر دیا ۔ فینی سے نچلا حصّہ یعنی چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ ایک علیحدہ بریگیڈ (مقیم چٹا گانگ) کے سپُرد کیا گیا ۔ گویا جنگ سے پہلے ہی مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل قاضی اور میجر جنرل رحیم کے درمیان بانٹ دی گئی ۔ جنرل قاضی کے پاس برہمن باڑیہ اور اس کا شمالی علاقہ (مولوی بازار، سلہٹ وغیرہ) رہ گیا اور جنرل رحیم کے ذمہ کومیلا، فینی، بلونیا، لکشم اور چاندپور کے علاقے آئے ۔

جنرل رحیم اور ان کے ڈویژن کی کارکردگی کا احوال اگلے باب کا موضوع ہے ۔ اس باب میں جنرل قاضی کی دفاعی صلاحیتوں کا ذکر آئے گا ۔

جنرل قاضی کے ۱۴ ڈویژن میں تین بریگیڈ تھے ۔ ایک مضبُوط اور دو کمزور طاقتور بریگیڈ (۲۷) میں ڈھائی پلٹنیں تھیں اور اس کا ہیڈ کوارٹر برہمن باڑیہ میں تھا ۔ اس کے کمانڈر بریگیڈیئر سعداللہ تھے ۔ دوسرا بریگیڈ (۲۰۲) جو دو پلٹنوں پر مشتمل تھا بریگیڈیئر افتخار رانا کی قیادت میں مولوی بازار میں تھا اور تیسرا (ہنگامی) بریگیڈ (۳۱۳) بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ماتحت تھا جس کا ہیڈ کوارٹر سلہٹ میں تھا ۔ اس بریگیڈ میں ایک باقاعدہ انفنٹری پلٹن اور باقی نیم عسکری نفری تھی ۔

۱۴ ڈویژن کے دفاعی خط کے پیچھے عظیم دریائے میگھنا بہتا تھا جو ڈھاکہ کے لیے مشرقی فصیل کا کام دیتا تھا جس کا مطلب یہ

تھا کہ دشمن کو پہلے ۱۴ ڈویژن کی دفاعی لائن کو توڑنا ہوگا اور پھر پورے جنگی ساز و سامان سمیت اس وسیع دریا کو پار کرنا ہوگا ــ پھر کہیں وہ ڈھاکہ پر دستک دینے کے قابل ہوگا۔ خیال تھا کہ وہ ڈھاکہ پر دستک دینے سے پہلے اگرتلا (تری پورہ) کی طرف پیش قدمی کرکے اکھوڑہ، برہمن باڑیہ، آشوگنج اور بھراب بازار کا رُخ کرے گا، لہٰذا جنرل قاضی نے نہ صرف بریگیڈیر سعد اللہ اور ان کے ۲۷ بریگیڈ کو مذکورہ خطوط پر متعین کیا، بلکہ اپنا ٹیک ہیڈکوارٹر (۱۴ ڈویژن) بھی وہیں منتقل کر دیا۔

۲۷ بریگیڈ کے زیرِ نگرانی سرحد کومیلا کے شمال میں سالدہ ندی سے شروع ہو کر مولوی بازار کے جنوب میں اکھولا کے مقام پر ختم ہوتی تھی۔ یوں کُل سرحدی لمبائی ۸۴ کلومیٹر بنتی تھی جس کے دفاع کے لیے بریگیڈیر سعد اللہ کے پاس ڈھائی انفنٹری پلٹنیں، ۱۱ توپیں (فیلڈ)، چار ٹینک اور ایک پلاٹون (آر اینڈ ایس) تھی۔ انہوں نے انفنٹری پلٹنوں میں سے ۱۲ ایف ایف کو اکھوڑا میں متعین کیا اور ۳۳ بلوچ اور (نامکمل) ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کو بالترتیب اس کے جنوب اور شمال میں لگا دیا۔

دوسرے سیکٹروں کی طرح یہاں بھی جنگ ۳ دسمبر سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس علاقے میں بھارت کی توجہ اکھوڑا پر مرکوز تھی جو چٹاگانگ سے سلہٹ جانے والی ریلوے لائن پر واقع تھا۔ اس مقام کو منتخب کرنے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سے اگرتلا محض چند کلومیٹر دور تھا۔ بھارت کی مسلسل جارحیت کے سبب اکھوڑا کا ذکر اکتوبر کے اوائل ہی میں اخباروں میں آنے لگا تھا۔ یہ ریلوے اسٹیشن کئی بار ہمارے ہاتھوں سے گیا اور کئی بار واپس آیا۔ بار بار مالک بدلنے سے ریل کی پٹڑیاں اور ریلوے اسٹیشن کی کوٹھڑیاں خستہ ہو چکی تھیں۔

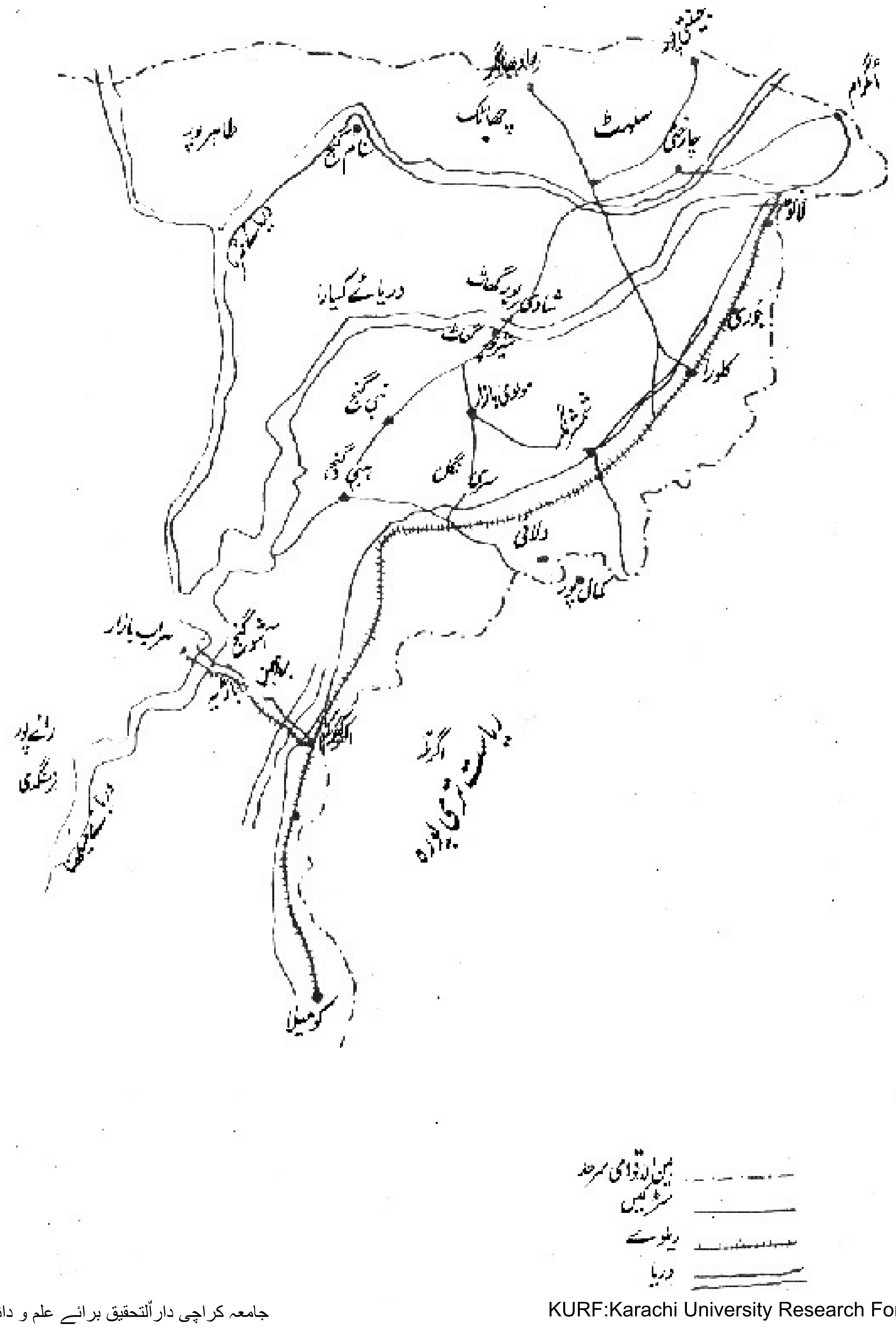
۲۱ نومبر کو بھارت نے سرحدی موڑوں اور اُبھاروں کو ہڑپ کرنا (WAR OF SALIENTS) شروع کیا تو اس نے اکھوڑا اور اس کے ملحقہ علاقے پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے اکھوڑا کو فائرنگ اور جوابی فائرنگ میں مصروف رکھا اور اس کے جنوب اور شمال سے سرحدی چوکیوں کو مکتی باہنی کی مدد سے گھیرے میں لے لیا۔ اکھوڑا کو آزاد کرانے میں دقت یہ تھی کہ اگر سامنے سے پیش قدمی کرتے تو مکتی باہنی اور ان کی اعانت کرنے والی توپوں کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر پہلو سے ان کے پیچھے جانے کی کوشش کرتے، تو سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی جس کی اجازت نہ تھی (ہم ۳ دسمبر کی سہ پہر تک سرحدوں کے تقدس کے قائل تھے)۔

جب دشمن کو یقین ہو گیا کہ ہم اس چوکی کو آزاد کرانا تو درکنار اسے کمک بھی نہیں پہنچا سکتے، تو اس نے ۳۰ نومبر کو اکھوڑا اور اس سے ملحقہ مورچوں پر ہلّہ بول دیا۔ ہماری ایک پلاٹون مورچے چھوڑ کر بھاگ آئی اور دشمن نے اس چوکی پر اور اس کی پُشت پناہی کے لیے رکھی گئی ہماری اکلوتی توپ پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں اس سانحے کا اندازہ تب ہوا جب اس چوکی سے ہمارا مواصلاتی رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ ایک لیفٹیننٹ کو ذاتی طور پر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا گیا، تو اُسے راستے میں پسپا ہوتے ہوئے سپاہی ملے۔ اس نے انہیں دوبارہ اپنے مورچوں میں بھیج دیا اور خود واپس چلا آیا۔

اکھوڑا کے جنوب میں گنگا ساگر، ملک باری اور لاناسر کی چوکیاں تھیں۔ یکم دسمبر کو دشمن کی گولہ باری سے ان سرحدی چوکیوں سے ہمارے سپاہی اُکھڑ گئے۔ اب ان سے بھی مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس مرتبہ ایک لیفٹیننٹ کے بجائے میجر جنرل قاضی نے انہیں واپس اپنے گھونسلے میں بٹھایا۔

جب جنرل قاضی اور بریگیڈیر سعد اللہ کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ اکھوڑا اور گنگا ساگر کے گرد و نواح میں ہم کس طرح سرحدی چوکیوں کو مستحکم کریں، بھارتی سپاہی ــ مکتی باہنی کی رہنمائی میں ــ کھیتوں سے ہوتے ہوئے اکھوڑا سے پیچھے ہمارے بٹالین ہیڈکوارٹر

برہمن باڑیہ سیکٹر



کے پاس آنکلے۔ اس نئی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے کوئی اضافی نفری دستیاب نہ تھی؛ چنانچہ ۱۴ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے کلرکوں ملٹری پولیس کے جوانوں اور اردلیوں اور چار ٹینکوں کی مدد سے اس بھارتی فوج پر حملہ کیا گیا۔ یہ بھارتی سپاہی جو چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے سرحد پار کر آئے تھے ابھی تک "چور ذہنیت" سے نہیں نکلے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کی چوری پکڑی گئی ہے اور ٹینکوں سمیت ان پر حملہ کر دیا گیا ہے تو وہ بھاگ نکلے۔ دشمن بھاگم بھاگ میں اپنی چند لاشیں بھی چھوڑ گیا جن میں سے ایک بھارتی توپ خانے کے ایک نوجوان "آبزرور" (دیدبان) کی لاش تھی جس کے قبضے سے نکلنے والے فوجی نقشوں سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن اکھوڑا کے پیچھے دریائے ٹیٹاس (TITAS) کے پُل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ہم اکھوڑا سے پسپا ہوتے وقت اس پُل کو اُڑا کر دشمن کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کر دیں۔

۴ دسمبر کو جب کھلی جنگ کا آغاز ہوا تو بریگیڈیر سعد اللہ نے اپنے جی او سی کی منظوری سے اپنی دفاعی پوزیشنوں کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ انھوں نے سرحدی چوکیوں سے نفری سمیٹ کر ٹیٹاس پُل کے اس پار متعین کر دی اور یہ طے کیا کہ اگر ہمیں یہاں سے بھی پسپا ہونا پڑا، تو اس پُل کو اُڑا کر پیچھے ہٹیں گے لیکن دشمن نے جب یہاں بھی ہم پر بھرپور یلغار کی تو ہم پسپا تو ہوئے مگر جلدی میں پُل تباہ نہ کر سکے نتیجہ یہ کہ دشمن ہمارے پیچھے بخیر و عافیت پُل پار کر آیا۔ ہم وہاں سے جو ہٹے تو ۱۴ کلومیٹر پیچھے برہمن باڑیہ آ کر رُکے جو اس سیکٹر میں مضبوط مقام (STRONG POINT) سمجھا جاتا تھا۔ یہاں پندرہ دن کے لیے راشن اور گولہ بارود موجود تھا۔

اب ہم "برہمن باڑیہ" میں دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے تھے، مگر اس نے ہماری توقعات پوری کرنے کے بجائے وہی طریقہ اپنایا جو وہ اب تک اپناتا آ رہا تھا۔ اس نے مکتی باہنی کی مدد سے پہلوؤں کی طرف پیش قدمی کر کے ہمارے عقب میں آنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس چال کو ناکام بنانے کا علاج یہ سوچا کہ "گھیرا" مکمل ہونے سے پہلے ۱۳ کلومیٹر مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اب ہم دریائے میگنا کے مشرقی کنارے آشو گنج کے مقام پر تھے اور بھرپور جنگ کا پانچواں دن (۸ دسمبر) تھا۔ اس مرتبہ دشمن نے اندھا دھند ہمارا تعاقب نہ کیا اور ہم آشو گنج میں مورچے وغیرہ کھودنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس پسپائی کی وجہ سے جنرل قاضی (۱۴ ڈویژن) کا ٹیک ہیڈ کوارٹر برہمن باڑیہ سے ہٹ کر دریائے میگنا کے مغربی کنارے "بھراب بازار" میں منتقل ہو چکا تھا۔ سپاہیوں نے جب جنرل قاضی اور اس کے ہیڈ کوارٹر کو دریائے میگنا کے پار جاتے دیکھا، تو انھوں نے سوچا کہ امان ہے تو دریائے میگنا کے مغربی کنارے پر، مشرقی جانب تو سامنے سے دشمن کا دباؤ پڑے گا اور پیچھے دریا ہوگا، ہم کہاں جائیں گے۔ گویا فرنٹ لائن میں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (ٹیک) سے جہاں سپاہیوں کے مورال پر اچھا اثر پڑتا ہے وہاں اس کی پسپائی سے ان کے حوصلے پست بھی ہو جاتے ہیں۔

آشو گنج کا دفاع منظم کرتے وقت بریگیڈیر سعد اللہ نے مشرقی اور جنوبی سمتوں پر خاص توجہ دی کیونکہ دشمن کے حملے کی توقع انھی اطراف سے کی جا سکتی تھی۔ شمالی جانب دشمن کی کوئی مؤثر قوت موجود نہ تھی؛ چنانچہ اُس طرف صرف نیم عسکری فورس (سول آرمڈ فورسز) کو متعین کیا گیا۔ ان کے ساتھ باقاعدہ فوج کے مٹھی بھر سپاہی لگائے گئے تاکہ انھیں حوصلہ رہے کہ فوج ہمارے ساتھ ہے۔

۹ دسمبر کی صبح کو خبر ملی کہ دشمن شمال مشرق سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ یہ خبر سراسر خلافِ توقع تھی، مگر احتیاطاً توپوں کا رُخ ادھر موڑ دیا گیا تاکہ وہ ہماری نسبتہً کمزور نفری کی حمایت میں گولے برسا سکیں۔ خوش قسمتی سے ابھی ان توپوں کے دہانے نہیں کھلے تھے کہ "دشمن" پیدل چلتا ہوا سامنے آ گیا۔ دوربین سے اُسے پہچاننے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ اپنی "سول آرمڈ فورسز" کی نفری ہے جو بندوقیں کندھوں سے

لشکائے دریا کے کنارے کنارے واپس آرہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اُس طرف دُشمن موجود ہے اور اُس کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اپنی تھری ناٹ تھری کی رائفلوں سے اس کا کیا مقابلہ کریں گے چلو واپس چلیں۔

اس نیم عسکری نفری کے پیچھے پاک فوج کا دستہ آتا دکھائی دیا۔ سوچا کہ جب یہ پسپا ہوگئے ہیں تو ہمارے مُٹھی بھر فوجی بھی ان کے نقشِ قدم پر واپس آرہے ہوں گے مگر دُوربین میں ان کی وردیوں کا رنگ خاکی کے بجائے سبز نظر آیا۔ سبز وردی بھارتی سپاہیوں کی تھی۔ جب تک ان کی شناخت ہُوئی وُہ ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ عجلت میں ہیڈ کوارٹر سے بھانت بھانت کی نفری اکٹھی کر کے پیش قدمی روکنے کی کوشش کی اور مشرقی جانب متعین فوج کو اطلاع دی گئی کہ وہ جلدی جلدی باقاعدہ فوج کے دستے بھیجیں کیونکہ آشوگنج خطرے میں ہے ـــ مگر ان دستوں کے آنے سے پہلے ہی بھانت بھانت کی نفری نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ نہ صرف مار بھگایا بلکہ بہت دُور تک ان کا تعاقب کیا۔ دُشمن نے بھی پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ تعاقب کرنے والی نفری کتنی ہے۔ وہ اپنے پیچھے کئی لاشیں اور سات ٹینک صحیح سالم حالت میں چھوڑ گیا۔ قدم قدم پر پسپا ہونے والی پاک فوج کے لیے یہ پہلا معرکہ تھا جس میں اس نے دُشمن کو اس افراتفری میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے سپاہیوں کے لیے ٹانک ثابت ہُوا۔

۲۷ بریگیڈ ابھی آشوگنج ہی میں تھا کہ جنرل قاضی نے بھراب بازار میں بیٹھے بیٹھے دریائے میگھنا پر عظیم آہنی پُل کو اُڑا دینے کا حکم دے دیا۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ دریا کے مشرقی کنارے سپاہیوں نے شہتیر دریا میں گرتے دیکھے تو ان کے حوصلے بھی گرنے لگے۔ وہ اس یاس انگیز منظر کو بے بسی سے دیکھتے رہے۔ وہ پُل اُڑانے کی حکمت سمجھنے سے قاصر تھے۔

جی او سی کے اس حکم کی اب دو توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ طارق کی کشتیاں جلانے کے مترادف تھا یعنی مشرقی کنارے پر متعین ہمارے سپاہیوں کو پتہ چل جائے گا کہ اب مزید پسپائی کا کوئی امکان نہیں اس لیے اب یہیں آخری دم تک لڑنا ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جی او سی کو یہ اندیشہ تھا کہ دُشمن کا وہ فوجی دستہ جو اچانک شمال کی جانب سے آنکلا تھا درحقیقت پُل پر قبضہ کرنے آیا تھا جسے بروقت کارروائی سے پسپا کر دیا گیا تھا لیکن عین ممکن ہے اگلا ریلا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے (افسوس! دوسرے مفروضے کی کسی ذریعے سے تصدیق نہیں ہوسکی)۔

پُل گرنے کے بعد ۲۷ بریگیڈ مشرقی کنارے پر اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا اگر دُشمن کے دباؤ کے تحت اُسے پسپا ہونا پڑا، تو دریا پار کرنا مشکل ہوگا اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ جو مہلت نصیب ہے اُس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور بخیر و عافیت بھراب بازار پہنچا جائے۔ لہٰذا ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کو اس نے جتنی اور جیسی بھی کشتیاں دستیاب ہو سکیں ان کے ذریعے دریا عبور کیا اور جنرل قاضی کے پاس پہنچ گیا۔

اگلے روز بھراب بازار میں دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے۔ یہاں دو ہفتوں کا راشن اور ایمونیشن موجود تھا۔ جنرل قاضی اور بریگیڈیر سعداللہ نے جنگ کے باقی دن پُرامن طریق پر یہیں بسر کیے۔ جنگ کے آخری دنوں میں دُشمن نے بھراب بازار سے کوئی ۱۵ کلومیٹر جنوب میں رائے پورا اور نرسنگدی کے علاقے میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوج اُتارنا شروع کر دی جو ڈھاکہ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی، مگر بھراب بازار کے محافظوں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ یہ علاقہ اس سیکٹر میں شامل نہیں تھا۔

یہ تھی ۲۷ بریگیڈ کی کارگزاری جو اس نے اپنے جی او سی کی سرپرستی میں اس سیکٹر کے اہم ترین حصے میں انجام دی۔ اب آئیے اسی ڈویژن کے دوسرے دو بریگیڈوں کی طرف جو مولوی بازار اور سلہٹ میں تھے۔

بریگیڈیئر سعداللہ کے بریگیڈ کے شمالی جانب بریگیڈیئر افتخار رانا کا ۳۱۴ بریگیڈ تھا جس کے پاس ۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ نامی دو پلٹنیں تھیں جن کی نفری سرحدی علاقے میں کمال گنج سے لاؤ تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس طرح ۱۰۷ بریگیڈ میں اکھوڑا پر دشمن نے خاص توجہ دی تھی، اسی طرح اس بریگیڈ میں دُلائی کی سرحدی چوکی اس کی آنکھ میں کھٹکتی تھی۔ اس چوکی کے دفاع کی ذمہ داری ۳۰ ایف ایف کے ایک دستے کے سپرد تھی۔ بھارت نے شروع اکتوبر ہی سے اس پر گولہ باری شروع کر دی تھی اور مکتی باہنی نے بھارتی سپاہیوں کی مدد سے کئی بار اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، جس کے پیش نظر یہاں کی نفری ایک پلاٹون سے بڑھا کر ایک کمپنی کے برابر کر دی گئی تھی۔ دشمن کا طریقہ واردات یہاں بھی وہی تھا جو وہ کامیابی سے دوسرے سیکٹروں میں آزما چکا تھا یعنی سامنے سے فائرنگ کر کے چوکی کو مصروف رکھو اور پہلوؤں سے پیش قدمی کر کے اسے گھیرے میں لے لو۔ اس نے کوئی چار ہفتے یہ حربہ آزمایا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی، بالآخر ۳۰ اکتوبر کو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دُلائی پوسٹ سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہم نے اسے کمک پہنچانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس دوران میں ہمارے محصور سپاہی بڑی جرأت و جوانمردی سے اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔

۳۰ ایف ایف کے جواں سال اور جواں ہمت سیکنڈ ان کمانڈ (نائب سپہ سالار) میجر جاوید نے یہ حالت دیکھی تو اس نے سوچا کہ یوں محصور سپاہیوں کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جوانمردی کے خلاف ہے۔ اُس نے پلٹن کے چیدہ چیدہ ۱۸ سپاہی (جو رضا کارانہ طور پر میجر جاوید کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے تھے) اکٹھے کیے اور جنوبی سمت سے دُلائی پوسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن کا ایک دیدبان (OBSERVER) درخت پر بیٹھا اس جرأت مندانہ پیش قدمی کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب یہ درختوں سے نکل کر دُلائی پوسٹ کے قریب پہنچے تو دشمن نے توپ کے گولے برسانے شروع کیے۔ ایک گولہ میجر جاوید کے پاس پھٹا اور اس کے ٹکڑے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ مُنہ کے بل گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اسی طرح اس کے ساتھی بھی کھیت رہے۔ دُلائی پوسٹ کا مقدر پہلے کی طرح معلّق رہا۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ ۳۰ فرنٹیئر فورس (ایف ایف) کو اتنے بہادروں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی بے دریغ قُربانی دیتی رہی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳ نومبر تک اس کے ۱۶۰ جیالے قُربان ہو چکے تھے جن میں دو افسر، تین جونیئر کمیشنڈ افسر اور ۹۰ سپاہی شامل تھے۔ باقی شہیدوں کا تعلق رضا کاروں اور سول آرمڈ فورسز سے تھا جو اسی پلٹن کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے۔

بریگیڈیئر رانا نے اپنے جی او سی (میجر جنرل قاضی) اور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ (لیفٹیننٹ جنرل نیازی) کی خدمت میں عرض کیا کہ دُلائی پوسٹ چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سامنے سے حملہ کرنے کے بجائے اس سے چند کلومیٹر شمال یا جنوب میں بین الاقوامی سرحد پار کر کے پوسٹ کے پیچھے پہنچا جائے تاکہ دشمن ہمیں اچانک اپنی پُشت پر دیکھ کر دُلائی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ۲۲ بلوچ، ۳۰ ایف ایف اور ۳۹ بلوچ سے تھوڑی تھوڑی نفری مستعار لے کر ایک جمعیت یا فورس کھڑی کر لی اور ملحقہ علاقوں سے دو توپیں (فیلڈ) اور چار مارٹریں (ہلکی توپیں) بھی جمع کر لیں۔

جنرل نیازی نومبر کے اوائل میں وہاں دورے پر گئے۔ جنرل قاضی کی موجودگی میں بریگیڈیئر رانا نے انہیں اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں، مگر جنرل نیازی نے حکم دیا کہ بین الاقوامی سرحد کسی قیمت پر پار نہ کی جائے، البتہ اگر بریگیڈیئر رانا اپنی اضافی جمعیت کے زور پر یا کسی اور طریقے سے دُلائی پوسٹ کو آزاد کرا سکیں تو انہیں اجازت ہے؛ چنانچہ اس فورس کو تین حصوں میں تقسیم کر کے سامنے، اور پہلوؤں سے حملہ کیا گیا

جو ناکام رہا جس سے ڈُولائی کے حساب میں ہمارے نقصانات میں مزید اضافہ ہوگیا۔

یہ دقتیں ۳۰ ایف ایف کے علاقے میں پیش آ رہی تھیں۔ اس کے شمال میں ۲۲ بلوچ تھی جو لاٹو' کلورا اور شمشیر نگر کے سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں دشمن نے ڈُولائی کی طرح ایک پوسٹ پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے سرحد کے ساتھ ساتھ تمام پیچ وخم کو بزورِ بازو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ یکم دسمبر کو اس نے سرحدی علاقوں سے آگے بڑھ کر شمشیر نگر کے مشرق میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ اس علاقے سے گزرتے ہوئے راج نگر کی چوکی سے بریگیڈیئر رانا پہ فائرنگ ہوئی۔ وہ بخیریت واپس آ گئے۔ اگلے روز اطلاع ملی کہ دشمن نے شمشیر نگر پر حملہ کر دیا ہے۔ اس سے بریگیڈ کمانڈر کو تشویش ہوئی کیونکہ شمشیر نگر اس علاقے کا نہ صرف اہم قصبہ اور مواصلاتی مرکز تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ اس سے مشرق کا سارا علاقہ دشمن کے تسلط میں چلا جائے گا۔ چنانچہ فوراً ہی فضائی مدد مانگی گئی۔ دو سیبر طیارے فوراً آن پہنچے مگر شمشیر نگر اور اس کے مشرق میں انہیں دشمن کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ جہاز کوئی گولی چلائے بغیر واپس چلے گئے۔

فضائیہ کی بے ثمر پروازوں سے کم از کم اتنا تو پتہ چل گیا کہ ابھی تک دشمن نے شمشیر نگر پر قبضہ نہیں کیا تھا' لیکن وہ اس کے مشرق میں ایک سرحدی پوسٹ کو روند چکا تھا جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں سیکنڈ لیفٹیننٹ ضمیر آخری وقت تک چلا چلا کر اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا: "دیکھو وہ واپس جا رہے ہیں۔ تم اپنی پوزیشن میں جمے رہو' دشمن جا رہا ہے۔" اس کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنی پوسٹ ہی میں جان دے دی۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ سرحدی چوکیوں سے ہمارے سپاہیوں کے قدم اکھڑنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ نیم عسکری تنظیموں کے افراد بھی متعین تھے۔ جب گولہ باری ہوتی یا دشمن کا دباؤ بڑھتا تو سب سے پہلے یہ نفری بدکتی۔ ان کے ہٹنے سے نہ صرف مورچوں میں ہتھیار بند افراد کی تعداد کم ہو جاتی بلکہ سپاہیوں پر بھی اس کا ناخوشگوار اثر پڑتا۔ ان میں بھی اپنی جان بچانے کا جذبہ عود کر آتا۔ فوجی مبصرین اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگلی صفوں میں نیم عسکری تنظیموں کے افراد کو باقاعدہ فوج کی نفری کے دوش بدوش کبھی متعین نہیں کرنا چاہیے۔

یہ تھی بریگیڈیئر رانا کے زیرِ نگرانی سرحدی علاقے کی حالت جب ۳ دسمبر کو بھرپور جنگ شروع ہوئی۔ انہوں نے اعلانِ جنگ ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ دونوں پلٹنوں (۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ) کو اپنے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور ڈویژن کے مضبوط مقام (STRONG POINT) مولوی بازار میں طلب کر لیا۔ ۳۰ ایف ایف کی زیادہ تر نفری سرحدی علاقوں سے سمٹ کر مولوی بازار پہنچ گئی' البتہ اس کی ایک کمپنی جو انتہائی جنوب میں تھی' اسے اپنے قریب ۲۷ بریگیڈ (بریگیڈیئر سعد اللہ) کے ساتھ مل جانے کی اجازت دے دی گئی۔

۲۲ بلوچ تک جب مولوی بازار پہنچنے کے احکام پہنچانے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ اس سے مواصلاتی رابطہ ہی منقطع ہو چکا ہے۔ قدرتی طور پر تشویش لاحق ہوئی کہ لاٹو' کامت نگر' جوری' کلورا اور مرزا پور کے علاقوں میں بکھری ہوئی نفری کو کیا ہوا۔ کیا وہ سب نابود ہو گئے؟ اگر ان میں سے کچھ لوگ بچ گئے ہیں تو انہیں کس طرح محفوظ مقام پر لایا جا سکتا ہے؟

خاصی دیر وائرلیس پر "ہیلو ہیلو" کی مشق کی گئی۔ بڑی مشکل سے پلٹن کی ایک کمپنی سے رابطہ قائم ہوا' وہ بھی اتفاقیہ طور پر۔ پتہ چلا اس کا ایک گروہ لاٹو میں جمع ہے' دوسرا فنچو گنج میں اور تیسرا اسلہٹ روانہ ہو گیا ہے۔ آخر کار بٹالین ہیڈ کوارٹر سے بھی مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا جو کلورا سے ۱۰ کلومیٹر دور چائے کے ایک باغ میں تھا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر نے بتایا کہ ۲ دسمبر کے شدید حملے میں پلٹن اپنا اتحاد کھو بیٹھی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کہیں اور کمپنیاں کہیں۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کو اپنی بچی کھچی نفری منظم کرنے کو کہا گیا۔

[illegible] میجر جنرل قاضی نے بریگیڈیئر رانا کو حکم دیا کہ وہ اپنا بریگیڈ لے کر بریگیڈیئر سعداللہ (۲۰۲ بریگیڈ) کے پاس آ جائے (کیونکہ اکھوڑا، برہمن باڑیہ اور بھراب بازار کی جنگ نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور اس محاذ کو مضبوط کرنا اشد ضروری تھا) بریگیڈیئر رانا نے اس حکم کی تعمیل سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کر دی کہ رسل و رسائل کے ذرائع اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ان پر زور دیا گیا کہ بریگیڈ نہیں لا سکتے تو ایک پلٹن ہی بھیج دیجیے، چنانچہ بریگیڈیئر رانا نے ۳۰ ایف ایف کی جنوبی کمپنی بریگیڈیئر سعداللہ کو بھیج دی تھی جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

۲۲ بلوچ ابھی تک اپنی شیرازہ بندی میں مصروف تھی کہ دشمن شمشیر نگر، مولوی بازار سڑک پر آ گیا۔ مولوی بازار کے دفاع کی ذمہ داری لامحالہ ۳۰ ایف ایف کے سپرد ہوئی جس کے پاس صرف ڈھائی کمپنیاں رہ گئی تھیں۔ کچھ شہید ہو گئے تھے اور ایک کمپنی ۲۷ بریگیڈ کو روانہ کر دی گئی تھی، البتہ نیم عسکری تنظیموں کی کچھ نفری اس کے علاوہ تھی۔ اس پلٹن نے اپنے وسائل کے مطابق مولوی بازار کے دفاع کا اہتمام کر لیا۔

مولوی بازار اور سلہٹ کے درمیان ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جس کا نام کُسیارہ (KUSIYARA) تھا۔ اس کے دو پتن تھے شیر پُور اور شادی پُور۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اپنی گاڑیاں اور ساز و سامان لے کر مولوی بازار سے نکل کر دریا کے اُس پار شادی پُور منتقل ہو گیا اور ۳۰ ایف ایف اور اس کی زیرِ نگرانی نیم عسکری نفری کو مولوی بازار میں متعین رہنے دیا۔ دشمن نے یہاں اس کے مورچوں پر فضائیہ اور توپ خانے سے راکٹ اور گولے برسانے شروع کیے۔ ۳۰ ایف ایف ایک دو دن آہنی ہتھوڑے کی ضربیں سہتی رہی جس کے نتیجے میں اس کے پانچ افراد شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ ۷ دسمبر کو اسے حکم مل گیا کہ وہ گولہ بارود کے ذخائر جلا کر شادی پُور پتن پر پہنچ جائے۔

جب ۳۰ ایف ایف شادی پُور کی طرف روانہ ہوئی تو وہاں سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سلہٹ چل پڑا۔ یہ بریگیڈ اپنے وسائل کے لحاظ سے بمشکل ایک بٹالین کے برابر رہ گیا تھا مگر اس کے کمانڈر اب ایک کے بجائے دو ہو چکے تھے۔ جنرل نیازی نے دورانِ جنگ بریگیڈیئر حسن کو ڈھاکہ سے بریگیڈیئر رانا کے پاس بھیج دیا تاکہ اگر ایک سے بوجھ نہ اٹھایا جا سکے تو دونوں مل کر اٹھا لیں ۔ وہ یہ بھول گئے کہ "دُہری کمانڈ" کمزور کمانڈ سے بدتر ہوتی ہے۔"

جب یہ دونوں بریگیڈیئر سلہٹ جا رہے تھے تو ان کے آگے آگے کیپٹن ظفر کی حفاظتی جیپ تھی۔ شام کے وقت جب وہ سلہٹ کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شہر کی جنوبی سرحد پر چند ہیلی کاپٹروں سے فوج اُتر رہی ہے۔ اس نے وہیں رُک کر ہیلی کاپٹر گننا شروع کر دیے۔ دس ہیلی کاپٹر اپنا وزن ہلکا کر کے واپس چلے گئے۔ اتنے میں بریگیڈیئر رانا بھی پہنچ گئے۔ کیپٹن ظفر نے انہیں اپنے مشاہدے سے آگاہ کیا۔ بریگیڈیئر رانا نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دشمن شہر پر قابض ہو چکا ہے کیونکہ ان کے قیاس کے مطابق دشمن اس وقت تک ہیلی کاپٹر کے ذریعے کمک نہیں پہنچائے گا جب تک اس کے فوجی دستے شہر کو اپنے تسلط میں نہیں لے لیتے۔

اس دوران میں ۳۰ ایف ایف آرام سے شادی پُور پتن میں بیٹھی رہی۔ اسے دشمن نے نہ چھیڑا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر دشمن مولوی بازار کے راستے اس کا پیچھا کرتا یا فضائیہ کے ذریعے اس کا ناک میں دم کر دیتا، تو یہ پلٹن فوراً سلہٹ کا رُخ کرتی جہاں بھارت کی ہیلی کاپٹر سے اُترنے والی فورس کو مزید مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

بریگیڈیئر رانا نے ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو ۳۰ ایف ایف کو سلہٹ بلوا لیا۔ جو افسر اس پلٹن کے ہراول دستے کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، اُس نے مجھے بتایا:

"سلہٹ ایک آسیب زدہ شہر معلوم ہوتا تھا جو اندھیرے کی کئی تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ماحول پر پُرہول خاموشی طاری تھی۔ اس

تاخوشگوار بی بی بجاری کی آواره کتے کے بھونکنے یا گولیوں کی تڑتڑ سے پڑتا تھا۔

مگر یہ شہرِ خموشاں کیسے ہو سکتا تھا؟ اس میں بریگیڈیئر سلیم کا ۲۰۲ ہنگامی بریگیڈ بھی تو تھا' اس پر کیا بیتی؟

اس بریگیڈ میں صرف ایک ہی باقاعدہ پلٹن (۳۱ پنجاب) تھی۔ باقی نفری فرنٹیئر کور، مجاہد اور رضاکاروں پر مشتمل تھی۔ بھاری ہتھیاروں میں آرٹلری کی ایک بیٹری میسّر تھی۔ اس بریگیڈ کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ سلہٹ کی مشرقی سرحد پر لاتو سے لے کر (جہاں تک بریگیڈیئر رانا کا بریگیڈ تھا) شمالی سرحد پر طاہر پور تک (جہاں ضلع میمن سنگھ کی حد شروع ہوتی تھی) دفاع کرے ۔۔۔ اور دفاع بھی بھارت کی ۴ کور کے کوہستانی ڈویژن (MOUNTAIN DIVISION) کے خلاف جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس تھا۔

بھارتی ڈویژن کے سامنے دو سڑکیں تھیں۔ ایک مشرق میں اور ایک شمال مشرق میں ۔۔۔ جنہیں استعمال کرکے وہ سلہٹ پر قبضہ کر سکتا تھا' لہٰذا مشرق میں اٹگرام' ذکی گنج اور چارکھائی کی چوکیاں قائم کی گئیں اور شمال مشرقی سمت سے دشمن کو روکنے کے لیے جینتی پور' ہیمو اور خادم نگر میں دفاعی انتظامات کیے گئے۔ شمال مغربی حصے میں نیم عسکری نفری تعینات کی گئی جن کے مورچے چھاتک اور گوئین تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس حصے سے کچے راستے گزرتے تھے جنہیں بوقتِ ضرورت دشمن استعمال کرکے سلہٹ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔

بریگیڈیئر سلیم اللہ کے لیے مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس سرحدی علاقہ بہت طویل اور وسائل بہت محدود تھے۔ ساری نفری میں صرف ۳۱ پنجاب ہی ایک قابلِ اعتماد پلٹن تھی۔ اسے ایک محاذ پر لگا دیا جاتا' تو دوسرا خالی رہ جاتا۔ دشمن کی مرضی کا کیا پتہ کہ وہ مشرق سے آتا ہے یا شمال سے' لہٰذا اس پلٹن کو کسی ایک جگہ لگانے کے بجائے آٹھ دستوں میں تقسیم کرکے اسے اٹگرام (مشرق) سے سنام گنج (مغرب) تک پھیلا دیا گیا۔ ہر دستے کے ساتھ نیم عسکری نفری لگا دی گئی تاکہ مورچے بھرے بھرے لگیں اور دشمن انہیں تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ نہ کر جائے۔

دوسرے محاذوں کی طرح اس سیکٹر میں بھی دشمن نے اپنی سرگرمیاں جنگ سے بہت پہلے شروع کر دی تھیں۔ ۱۵ اکتوبر کو بھارتی بارڈر سکیورٹی فورس (B.S.F.) کی بٹالین نمبر ۸۵ نے مکتی باہنی کی ایک پلٹن (سابق ۳ ایسٹ بنگال) کے ساتھ مل کر چھاتک پر حملہ کر دیا۔ یہاں حملہ کرنے کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ اس قصبے اور اس سے ملحق سیمنٹ فیکٹری پر قبضہ کر لے۔ حملے کی گھن گرج سن کر ہماری نیم عسکری نفری سرحدی چوکیوں سے نکل کر قصبے میں آ گئی۔ بریگیڈیئر سلیم اللہ کو اس پسپائی کا علم ہوا' تو انہیں سنبھالا دینے کے لیے سلہٹ کے مشرق میں چارکھائی سے باقاعدہ فوج کی ایک کمپنی اور آرٹلری کی دو توپیں بھجوا دیں۔ بعد ازاں ۲۰ ایف ایف کی ایک کمپنی بھی مستعار لے کر وہاں روانہ کی گئی۔ یہ فورس وہاں اکٹھی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جوابی حملہ کرکے دشمن کو پاک سرزمین سے باہر پھینک دیا جائے؛ چنانچہ ۲۳ اکتوبر کو حملہ کیا گیا جو کامیاب رہا۔

اس کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ دشمن نے یہ علاقہ چھوڑ کر سلہٹ کے مشرق میں اٹگرام اور ذکی گنج کے علاقوں پر ایک مکمل بریگیڈ (۵۹) سے حملہ کر دیا۔ اس زوردار حملے کی وجہ سے وہاں سے ۳۱ پنجاب کی پلاٹون سمیت نیم عسکری نفری پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے اِدھر اُدھر سے اجزا جمع کرکے دشمن کو واپس دھکیلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ہمیں مجبوراً اپنی دفاعی لائن چارکھائی میں قائم کرنی پڑی جو سلہٹ سے ۲۲ کلومیٹر مشرق میں واقع تھی۔

بریگیڈیئر سلیم اللہ پر یوں مشرق و مغرب سے دباؤ بڑھنے لگا' تو انہوں نے اپنے جی او سی کے ذریعے ایسٹرن کمانڈ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر واقعی سلہٹ کو بچانا ہے' تو مزید نفری مہیا کی جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نومبر کے وسط میں جنرل نیازی نے میجر جنرل جمشید اور بریگیڈیئر قرصدیقی کو راولپنڈی (جی ایچ کیو) بھیجا تھا جہاں سے وہ مزید آٹھ پلٹنوں کا وعدہ لے کر لوٹے تھے۔ ان پلٹنوں میں سے پانچ نومبر

کے آخر میں مشرقی پاکستان پہنچ گئی تھیں۔ ان پلٹنوں میں سے ایک ۱۲ آزاد کشمیر رجمنٹ تھی جس کی دو کمپنیاں بریگیڈیئر سلیم کو ملی تھیں۔ یہ پلٹن مشرقی پاکستان کے جغرافیے اور اس کی تازہ صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھی۔ اس کی ٹریننگ کا زور بھی ندی نالوں کے بجائے "پہاڑی لڑائی" پر رہا تھا۔ ان مجبوریوں کے باوجود یہ نفری بڑی مفید تھی کہ کم از کم مورچوں میں بیٹھ کر دشمن سے فائر تو کر سکے گی؛ چنانچہ ایک کمپنی کو چارکھائی اور دوسری کو جینتی پور میں لگا دیا گیا۔

آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیوں کی آمد کا دشمن نے کوئی اثر نہ لیا۔ وہ حسبِ معمول اپنی اشتعال انگیز سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس نے مکتی باہنی کو آگے لگا کر ہمارے سرحدی علاقے میں دخل اندازی جاری رکھی جس کے نتیجے میں اس نے ۲۰ دسمبر تک اٹگرام سے طاہر پور تک بارڈر کے ساتھ ساتھ ۵ سے ۶ کلومیٹر لمبی پٹی اپنے قبضے میں کر لی۔ یہ پٹی شام گنج کے پاس ۱۲ سے ۱۵ کلومیٹر تک اور ذکی گنج کے قریب ۴۰ کلومیٹر تک پھیل چکی تھی۔ گویا جنگ سے پہلے اس سیکٹر میں ہمارا کئی سو مربع کلومیٹر رقبہ دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا۔

جب بھرپور جنگ کا آغاز ہوا، تو اس سیکٹر میں دشمن نے تین دفاعی مقامات پر خصوصی توجہ دی۔ مشرق میں چارکھائی، شمال میں سیہو اور شمال مغرب میں چھاتک۔ جنگ کے پہلے تین دن ان دفاعی مورچوں میں کوئی خم نہ آیا جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس عرصے میں دشمن کی توجہ برہمن باڑیہ اور بھیراب بازار کی طرف زیادہ رہی جو فوجی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم سیکٹر تھا۔ جب اُدھر صورتِ حال واضح ہو گئی اور ۲۷ بریگیڈ (سعد اللہ) کے بعد ۳۱۳ ہنگامی بریگیڈ (رانا) کے قدم بھی اُکھڑ گئے تو اس نے سلہٹ کی طرف رجوع کیا۔

۷ دسمبر کا واقعہ ہے کہ سلہٹ سے وفاقی کابینہ کے ایک سابق وزیر جناب اجمل چودھری بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ہیڈکوارٹر میں تشریف لائے اور اطلاع دی کہ انہوں نے شہر کے مشرقی کنارے پر میراں چک میں دشمن کے ہیلی کاپٹروں سے فوج اُترتے دیکھی ہے (یہ محبِ وطن پاکستانی بعد میں مکتی باہنی کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا) اسی روز بریگیڈیئر رانا کے آگے آگے سلہٹ میں داخل ہونے والے کیپٹن ظفر بھی سات سپاہیوں کے ساتھ مقامی مارشل لا ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل سرفراز کو ہیلی کاپٹر اُترنے کا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ اس وقت سہ پہر کے ۴ بجے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ آٹھ دس ہیلی کاپٹروں سے اُترنے والی نفری کا سات سپاہیوں کی مدد سے صفایا نہیں کیا جا سکتا۔

اتنے میں بریگیڈیئر سلیم اللہ نے جینتی پور پوسٹ سے ۳۱ پنجاب کا ایک دستہ (۲۹ افراد) منگوا کر کیپٹن بشارت کی سرکردگی میں میراں چک روانہ کر دیا۔ جب کیپٹن بشارت وہاں پہنچا تو ہیلی کاپٹروں کی ایک اور کھیپ نفری اُتار رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں ۲۹ آدمیوں سے ان کا کیا بگاڑ لوں گا؛ چنانچہ اس نے دُور سے ان پر اکا دُکا فائر کیا اور بس!

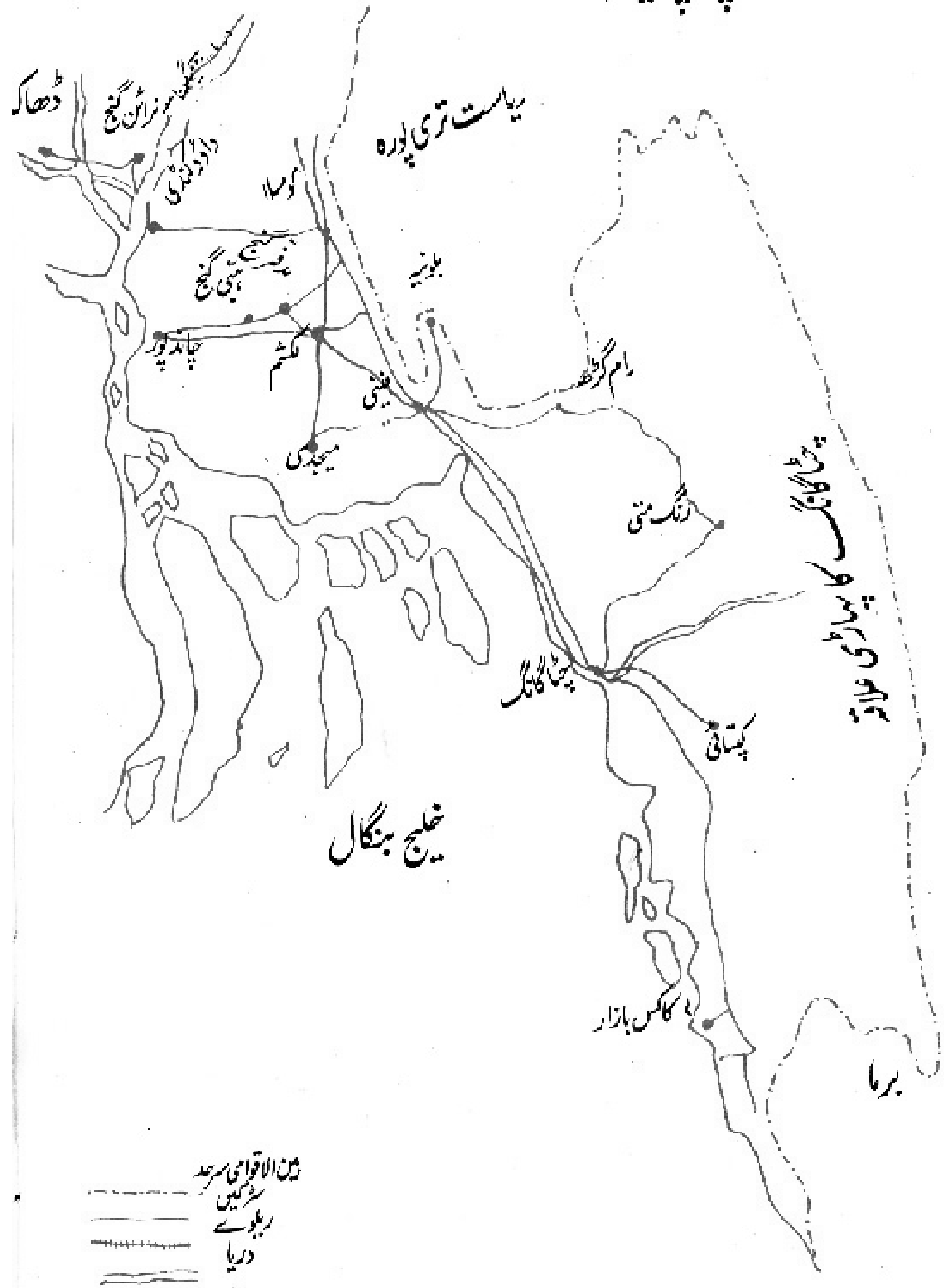
اسی اثنا میں ۲۲ بلوچ کے وہ پچاس سپاہی بھی پہنچ گئے جو لاتو اور کلورا میں پلٹن سے بچھڑ کر سلہٹ روانہ ہو چکے تھے۔ اس دستے کو فوراً کیپٹن بشارت کے پاس بھیجا گیا تاکہ ۷۹ (۵۰ + ۲۹) آدمیوں کی مدد سے وہ دشمن کو واپس جانے پر مجبور کرے۔ یہ کمک پہنچتے پہنچتے ۸ دسمبر کا سورج طلوع ہو گیا۔ دشمن اتنے میں اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا اور ہم خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔

دو ہیلی کاپٹر اچانک سلہٹ شہر میں سرکٹ ہاؤس اور کین برج (KAEN BRIDGE) پر پرواز کرتے دکھائی دیے۔ خیال تھا کہ یہ شہر کا فضائی جائزہ لے رہے ہیں تاکہ میراں چک میں اُتری ہوئی فوج شہر میں داخل ہونے کا منصوبہ بنا سکے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ ان ہیلی کاپٹروں نے دیدبانی کے ساتھ ساتھ سرکٹ ہاؤس میں ایک بم بھی پھینک دیا جس سے دفتر کا ایک کلرک اور پولیس کے تین سپاہی زخمی ہو گئے۔ زخمیوں کو اُٹھانے کے لیے کچھ جوان باہر نکلے، تو ہیلی کاپٹروں نے اُن پر گولیاں برسا دیں جن سے مزید نقصان ہوا۔

۸ دسمبر کو سلہٹ چھاؤنی کے وسائل میں یوں کچھ اضافہ ہوا کہ بریگیڈیر رانا کا ٹوٹا پھوٹا بریگیڈ (۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ) بھی وہاں پہنچ گیا۔ دو توپیں پہلے ہی سلہٹ میں تھیں دو اور اس بریگیڈ کے ساتھ آگئیں۔ وسائل کے سلسلے میں شاید یہ ذکر غیر مناسب نہ ہوگا کہ اب سلہٹ میں بیک وقت تین بریگیڈیر موجود تھے ــــ بریگیڈیر سلیم، بریگیڈیر رانا اور بریگیڈیر حسن (جنہیں رانا کا ہاتھ بٹانے کے لیے ڈھاکہ سے بھیجا گیا تھا)

ان تین کمانڈروں کو جو سب سے اہم مسئلہ درپیش تھا یہ تھا کہ سلہٹ کی بغل میں اُتری ہوئی بھارتی فوج سے کس طرح نپٹا جائے۔ انہوں نے طے کیا کہ ۲۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر کو پنجاب، بلوچ اور فرنٹیئر فورس کی "مخلوط نفری" اور چار توپوں سمیت دشمن کی سرکوبی کے لیے بھیجا جائے۔ کرنل صاحب نے اس حکم کو بجا لانے میں یہ مجبوری ظاہر کی کہ "میرے سپاہی تھکے ہوئے آئے ہیں وہ حملہ کرنے کے قابل نہیں"۔
اگلے روز (۹ دسمبر) یہی کام ۳۰ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو سونپا گیا۔ انہوں نے بھی "تھکاوٹ" کا بہانہ بنا کر معذوری ظاہر کر دی۔
۱۰ دسمبر کو دشمن سے نپٹنے کا ایک اور پلان تیار کیا گیا جو مختصراً یہ تھا کہ ۳۰ ایف ایف اور ۳۱ پنجاب کی نفری پر مشتمل دو دستے ترتیب دیئے جائیں۔ ایک دستہ شمالی جانب سے خاموشی کے ساتھ دشمن کے قریب پہنچ جائے اور دوسرا دستہ سامنے سے پورے زور شور سے حملہ کرے۔ خیال تھا کہ دشمن کی توجہ سامنے والے حملے کی طرف ہوگی اور جب اچانک شمالی جانب سے اس پر یلغار کی جائے گی تو وہ ہڑبڑا اُٹھے گا۔ اس "پلان" کو حسبِ توقع عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا کیونکہ سامنے سے ۳۱ پنجاب کا دستہ کوئی کارروائی نہ کر سکا، دشمن وہیں کا وہیں رہا۔
یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم دشمن کے خوف سے اس کے قریب جانے سے ہچکچا رہے تھے، دشمن خود ہمارے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ میں غیر کے علاقے میں گھس آیا ہوں اور میرا اپنی فوج سے کوئی زمینی رابطہ نہیں رہا۔ اگر مجھ پر کوئی افتاد آن پڑی تو میں کہاں چھپوں گا اور کس کی مدد چاہوں گا؟ یہ باتیں ہمیں اس پلٹن (۵ گورکھا رائفلز) کے ایک افسر نے بعد میں بتائیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ جب ۷ اور ۸ کی درمیانی رات کو (کیپٹن ظفر اور اس کے سات آدمیوں کی طرف سے) پہلی مرتبہ فائر کیا گیا تو بھارتی کمانڈنگ آفیسر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ امان اسی میں ہے کہ فوراً اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں۔ وہ ساری رات اسی تذبذب میں رہے کہ واپس چلا جائے یا یہیں رہا جائے۔ ان کی قوتِ فیصلہ کا فقدان ان کے آڑے آگیا، کیونکہ اتنے میں بھارتی نفری پہنچ گئی ــــ اور پاکستان نے بھی نہ چھیڑا!
اس ہیلی کاپٹر فورس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھارت نے ایک دستہ "ذکی گنج" کے راستے روانہ کیا۔ اسے سرحدی چوکیوں میں معمول مدافعت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ آگے بڑھتا رہا اور ۱۲ دسمبر کو اس فورس کے ساتھ مل گیا۔ ہیلی کاپٹر فورس پورے پانچ روز۔ ۔ ۔ (۷ دسمبر سے ۱۲ دسمبر تک) بے یار و مددگار پڑی رہی مگر اس کا کسی نے بال بیکا نہ کیا۔
ہم نے بڑھ کر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے اپنی جان بچانے پر زیادہ توجہ دی اور ۱۲ دسمبر کو مزید پیچھے ہٹ کر "سلہٹ شہر" اور اس سے باہر "سلوچی ایئر فیلڈ" (SALUCHI AIR FIELD) تک اپنے آپ کو محدود کر لیا ــ بقیہ علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ تینوں بریگیڈیر اور ان کے زیرِ کمان نفری انہی دو مقامات پر خاتمۂ جنگ تک دبکی رہی۔

چاند پور سیکٹر



چاندپور سیکٹر (۳۹ ہنگامی ڈویژن)

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے مشرقی سرحد کا جنوبی حصہ (کومیلا سے فینی تک) میجر جنرل رحیم کے پاس تھا جنہیں مارشل لا ڈیوٹی سے ہٹا کر ۳۹ ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں چند اسٹاف آفیسر اور بہت سے جنگی نقشے لے کر ڈھاکہ سے چاندپور منتقل ہو گئے تھے۔ انہیں یہاں بھیجنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی محنت، دیانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے لیے مشہور تھے اور دوسری یہ کہ جنرل نیازی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جنگ سے پہلے بھی جنرل نیازی پیشہ ورانہ معاملات میں اکثر مشورہ لیتے رہتے تھے، حالانکہ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر دفاعی امور میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا۔

جنرل رحیم کو اس سیکٹر کے دفاع کے لیے دو بریگیڈوں کی کمان دی گئی۔ ان کا ۱۱۷ بریگیڈ کومیلا میں تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عاطف کر رہے تھے اور ۵۳ بریگیڈ جو ڈھاکہ سے منتقل ہو کر فینی آیا تھا، بریگیڈیئر اسلم نیازی کے پاس تھا (بریگیڈیئر نیازی کا جنرل نیازی سے صرف ذہنی صلاحیت کا رشتہ تھا) یہ دونوں بریگیڈ چاندپور میں واقع ۳۹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے ماتحت تھے — چاندپور دریائے میگھنا کے مشرقی کنارے واقع تھا۔ کومیلا کے جنوب سے پھوٹنے والی سڑک مظفر گنج اور ہیبی گنج سے ہوتی ہوئی چاندپور جاتی تھی۔

اس سیکٹر میں مذکورہ سڑک واحد راستہ تھا جس سے بھارتی فوج ٹینک اور توپیں بآسانی مشرقی پاکستان میں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حملہ آور سپاہ کے پیشِ نظر دو مقاصد ہو سکتے تھے۔ یا تو وہ سرحد سے چند کلومیٹر اندر آ کر کومیلا کے پیچھے جا سکتی تھی یا وہ سیدھی چاندپور پہنچ کر دریائے میگھنا کے ذریعے ڈھاکہ کا رُخ کر سکتی تھی۔ میجر جنرل رحیم اور ان کے کمانڈر جنرل نیازی کا خیال تھا کہ جونہی دشمن سرحد پار کر کے مظفر گنج / چاندپور روڈ پر چڑھے گا، شمال سے ۱۱۷ بریگیڈ (کومیلا) اور جنوب سے ۵۳ بریگیڈ (فینی) قینچی کے دو پروں کی طرح آپس میں ملیں گے اور دشمن کا بڑھتا ہُوا سر قلم کر دیں گے۔

۳۹ ہنگامی ڈویژن کے جنوب میں چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ تھا جہاں کسی بڑے جنگی معرکے کی توقع نہ تھی (سمندر کے ذریعے دشمن کے چٹا گانگ ساحل پر اُترنے کی بات دُوسری تھی جس کا سدِباب موجودہ وسائل کے پیشِ نظر ناممکن تھا) کیونکہ فینی سے نیچے جو سرحدی علاقہ بھارت سے ملتا تھا وہ ایک پہاڑی سلسلہ تھا جس میں قابلِ ذکر فوجی جمعیت کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ چٹا گانگ کے دفاع کے لیے چٹا گانگ ہی میں ایک بریگیڈ (۹۷) قائم تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عطا ملک کے سپرد تھی۔ ان کے پاس ۲۴ ایف ایف اور ۲ کمانڈو بٹالین تھی جنہیں انھوں نے بالترتیب چٹا گانگ اور کپتائی میں رکھا ہُوا تھا۔

کومیلا کے جنوب میں اگر کہیں فیصلہ کن لڑائی لڑی جا سکتی تھی تو وہ فینی اور کومیلا کا درمیانی علاقہ تھا۔ فینی کے پاس بین الاقوامی سرحد دم باہر نکل کر پھر سیدھی ہو جاتی تھی یُوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ کا انگوٹھا الگ اکڑا ہُوا کھڑا ہے۔ اسے بلونیا بلج (BELONIA BULGE)

لیتے تھے۔ جنگ سے پہلے بھارت نے یہ "بلج" یا اُبھار کاٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس نے نومبر کے آغاز میں اس اُبھار کے نصف حصے پر خاموشی سے قبضہ کر لیا۔ جب ہمیں اس کا پتہ چلا تو معلوم ہُوا کہ سامنے کے مورچوں میں مکتی باہنی اور پچھلے مورچوں میں بھارتی سپاہی بیٹھے ہیں۔ بلونیا بلج (BELONIA BULGE) پر دشمن کا قبضہ ہونے سے اس سڑک یا ریل کی پٹڑی کو استعمال کرنا ممکن نہ تھا جو اس کے پاس سے شمالاً جنوباً گزرتی تھی۔ یہ اُبھار یا بلج (BULGE) دشمن کے پاس رہنے کا ایک اور نقصان یہ تھا کہ بھرپور جنگ چھڑتے ہی دشمن بیک جنبش چٹا گانگ کو جانے والی سڑک پر سوار ہو سکتا تھا یعنی چٹا گانگ کا سمندری دفاع تو اپنی جگہ پیچھے سے دشمن اس کی پشت میں چھرا گھونپ سکتا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے جنرل نیازی نے نصف درجن ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں میں سے ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (۹۱) بریگیڈیئر تسکین کی قیادت میں اس سڑک پر بٹھا دیا۔ بریگیڈیئر تسکین کے حصے میں جو نفری آئی، اس میں ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں مع بٹالین ہیڈ کوارٹر، مغربی پاکستان پولیس اور ای پی سی اے ایف کے افراد تھے۔

۴ر دسمبر کو بھرپور جنگ چھڑنے پر دشمن کا دباؤ کومیلا کے جنوبی پہلو پر پڑا جہاں ۱۱۷ بریگیڈ کی ایک پلٹن (۲۵ ایف ایف) متعین تھی۔ جنرل نیازی کی پالیسی کے مطابق اس پلٹن کی دو کمپنیاں (بٹالین ہیڈ کوارٹر سمیت) عین سرحد کے پاس مورچہ بند تھیں اور دوسری دو کمپنیاں چند کلومیٹر پیچھے "لال مائی" کی پہاڑیوں پر مقیم تھیں۔ اگلی کمپنیوں کے عقب میں ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے پاربتی پور کہتے تھے۔

۳ر اور ۴ر دسمبر کی رات کو بھارت کے ۶۱ کوہستانی بریگیڈ (MOUNTAIN BRIGADE) نے ہماری اگلی کمپنی پر حملہ کر دیا۔ حملہ آور بریگیڈ کے ساتھ میڈیم توپوں کی ایک رجمنٹ اور ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا۔ ہمارے جوانوں کے پاس صرف وہی ہتھیار تھے جو عموماً پیدل فوج کے پاس ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وسائل کے مطابق دشمن کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

۲۵ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر نے اجازت طلب کی کہ مجھے پسپا ہو کر پاربتی پور کے کنارے پر مورچہ بند ہونے کی اجازت دی جائے تاکہ میں وہاں سے مؤثر طریق پر دفاع کر سکوں مگر اس کی اجازت نہ دی گئی بلکہ حکم ہُوا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہو۔

دشمن نے سامنے سے انہیں جنگ میں مصروف رکھا اور ایک اور دستہ مکتی باہنی کی رہنمائی میں اس کے عقب میں بھیج دیا۔ انہوں نے دریائے پاربتی پور کے مشرقی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے کچھ دیر بعد بٹالین کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (کومیلا) سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس سے بریگیڈیئر عاطف کو پریشانی ہُوئی کہ آخر ہُوا کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۵ ایف ایف نیست و نابود ہو گئی؟ اگر خدانخواستہ اس پر کوئی افتاد آن پڑی تو اسے روندنے والے دشمن کی پیش قدمی کا رُخ کس جانب ہو سکتا ہے؟ کیا وہ گھوم کر کومیلا کے عقب میں آ رہا ہے یا اس کا رُخ چاندپور کی طرف ہے؟

بریگیڈیئر عاطف نے کومیلا چھاؤنی سے ۳۰ پنجاب کا ایک دستہ حالات کی ٹوہ لگانے کے لیے گشت پر روانہ کیا۔ یہ دستہ کومیلا کے ملحقہ علاقے میں چکر کاٹ کر واپس آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ اس علاقے میں دشمن کے کہیں آثار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود تشویش اپنی جگہ برقرار رہی کہ آخر ۲۵ ایف ایف کو ہُوا کیا ہے، کیا وہ دشمن کے دباؤ سے جنوب کی طرف پسپا ہو گئی ہے؟ اس امکان کے پیش نظر جنوبی طرف متعین ۲۳ پنجاب کو وائرلیس پر کہا گیا کہ ۲۵ ایف ایف کو وصول کرنے کے لیے تیار رہے، مگر ۲۵ ایف ایف اُدھر بھی نمودار نہ ہُوئی۔

عقدہ اس وقت کُھلا جب ۴ر دسمبر کو ۱۱ بجے کے قریب ۲۵ ایف ایف کے ایک حوالدار نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں یہ منحوس خبر سنائی

کہ اس کی پلٹن کی دو کمپنیاں بٹالین ہیڈ کوارٹر اور بٹالین کمانڈر سمیت دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہیں۔ اس خبر کی تصدیق سہ پہر کو آل انڈیا ریڈیو سے بھی ہو گئی جب اس نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ پاکستان کے ایک لیفٹیننٹ کرنل، چھ دوسرے افسروں اور دو سو سپاہیوں کو قیدی بنا لیا گیا ہے۔

جنگ کے ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے واقعہ کا پیش آنا انتہائی افسوسناک تھا۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ۲۵ ایف ایف کے ہٹنے سے دفاعی لائن میں جو شگاف پڑ گیا ہے، اسے کیسے پُر کیا جائے۔ ۲۳ پنجاب کو حکم دیا گیا کہ وہ ذرا شمال میں پھیل کر اس خلا کو پُر کر دے مگر یہ پلٹن ایسا نہ کر سکی کیونکہ خود اس پر بھارت کے ۲۰۲ بریگیڈ نے حملہ کر دیا تھا جس کے ساتھ توپخانے (فیلڈ) کی ایک رجمنٹ بھی تھی۔ جنگ کی پہلی رات، حملے کی شدت کے پیش نظر ۲۵ ایف ایف کی طرح ۲۳ پنجاب نے بھی اجازت چاہی کہ یہ اپنے سرحدی مورچوں سے پسپا ہو کر اپنے عقب میں بہنے والے دریائے ڈکاتیہ پر پوزیشن سنبھال لے۔ اُسے بھی اپنی جگہ ڈٹے رہنے کا حکم دیا گیا۔ اگلی صبح حالات بدتر ہوئے تو حکام بالا نے کہا اب بیشک پیچھے ہٹ آؤ، مگر کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کے خیال میں دن کی روشنی میں پیچھے ہٹنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنے سرحدی مورچوں میں دن گزار لیں تو رات کو پسپا ہونا آسان ہو گا، مگر دن کے وقت جب کرنل سید کے نائب میجر ظفر اقبال لکشم سے ایک فوجی دستے کے ساتھ کرنل سید کے پاس جا رہے تھے، تو ڈکاتیہ کے قریب ان پر گولیاں برسنی شروع ہو گئیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ ۲۳ پنجاب کے سپاہی ابھی سرحد پر ہیں، دشمن مکتی باہنی کی مدد سے ان کے عقب میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ۲۳ پنجاب کی پسپائی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا ہے۔ میجر ظفر نے واپس لکشم آ کر بریگیڈیئر اسلم نیازی کو دریائے ڈکاتیہ کے قریب دشمن کی موجودگی کی اطلاع دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات گنوا دی کہ "تم نے مکتی باہنی دیکھی ہو گی"۔

اُدھر جب لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کو معلوم ہوا کہ دشمن ان کے عقب میں پہنچ چکا ہے تو انہوں نے رات ہونے کا انتظار کیے بغیر بلاتاخیر پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ ڈکاتیہ کا راستہ نزدیک ترین، مگر پُرخطر تھا۔ انہوں نے لکشم پہنچنے کے لیے جنوبی سمت کو (جہاں ان کی اپنی کمپنی لگی ہوئی تھی) محفوظ جانا ـــ وہ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں زخمیوں کو ڈاکٹر کے سپرد کر کے سہ پہر کو لکشم روانہ ہو گئے۔ راستے میں جو کمپنی پڑتی تھی اسے بھی واپسی کے احکام دیتے آئے اور وائرلیس کے ذریعے سرحدی مورچوں میں متعین نفری کو بھی نئی منزل لکشم کی اطلاع دے دی۔

تمام کمپنیاں بخیریت نکل آئیں سوائے ایک کے جو چند گرام کے سرحدی مورچوں میں دشمن سے برسرپیکار تھی۔ فائرنگ ختم ہونے سے پہلے وہاں سے نکلنا ممکن نہ تھا؛ چنانچہ میجر اکرم نے غروب آفتاب تک لڑائی جاری رکھنے اور تاریکی میں مناسب وقفہ ملنے پر پسپا ہونے کا فیصلہ کیا ـــ میجر اکرم کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ دریائے ڈکاتیہ تک دشمن پہنچ چکا ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ اس دریا کے پُل کے پاس ہماری توپیں نصب ہیں۔ پسپا ہو کر وہاں پہنچنا سود مند رہے گا، کیونکہ وہاں سے آگے لکشم تک راستہ صاف تھا۔

چنانچہ وہ اپنی گن پوزیشن کی سیدھ میں آتے ہوئے اچانک دشمن کے کچھار میں جا گھسے۔ دشمن نے جو نئی نئی جگہ پہنچ کر بہت چوکنا بیٹھا تھا، فوراً فائر کھول دیا۔ ہمارے بہت سے جوان شہید اور زخمی ہو گئے ـــ خود میجر اکرم کے پیٹ میں گولیوں کی بوچھاڑ پیوست ہو گئی۔ وہ نیم مُردہ حالت میں رات کو کھیت ہی میں پڑے رہے۔ صبح کو جب دشمن جنگی نقشوں کے لالچ میں ان کی تلاشی لینے آیا، تو اس نے دیکھا کہ میجر اکرم اور ان کے بعض ساتھیوں میں ابھی سانس باقی ہے۔ وہ انہیں اُٹھا کر اپنے طبی مرکز میں لے گیا جہاں ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ میجر اکرم اب ماشاء اللہ لیفٹیننٹ کرنل ہیں، ان کے پیٹ پر گولیوں کے داغ اور ذہن پر اس پسپائی کے زخم تازہ ہیں۔

سرحد سے ۲۵ ایف ایف اور ۲۳ پنجاب کے ہٹنے سے اتنا شگاف پڑ چکا تھا کہ دشمن اپنی خاصی فوج چاندپور جانے والی سڑک

پر ڈال سکتا تھا؛ چنانچہ بریگیڈیئر اسلم نیازی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا بریگیڈ (۱۵ بلوچ اور ۳۹ بلوچ) جو فینی کے علاقے میں متعین تھا لکشم میں اکٹھا کرلیں۔ لکشم، چاندپور روڈ سے کوئی دس کلومیٹر جنوب میں تھا۔ اس کے سامنے چاندپور روڈ پر مظفر گنج پڑتا تھا۔ لکشم میں "دفاعی قلعے" کی حیثیت سے وافر مقدار میں راشن اور ایمونیشن جمع کیا گیا تھا جب فینی سے بلوچ رجمنٹ کی دونوں پلٹنیں واپس بُلائی گئیں، تو اس علاقے سے ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں اور بٹالین ہیڈ کوارٹر بھی لکشم منتقل کر دیا گیا۔ آزاد کشمیر کی نفری کے انچارج لیفٹیننٹ کرنل زیدی تھے۔

یہ ساری نفری ۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی رات کو لکشم میں اکٹھی ہوگئی۔ یہ وقت اس لحاظ سے بڑا نازک تھا کہ اس دوران میں دُشمن سرحد سے مظفر گنج کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا ــــ مگر اس پہلو پر پُوری توجہ نہ دی گئی اور ۵۳ بریگیڈ کو کہا گیا کہ آپ لوگ تھکے ہُوئے آئے ہیں آج رات آرام کریں، صبح کو جنرل رحیم لکشم تشریف لائیں گے اور نئے احکام دیں گے۔

۶ دسمبر کی صبح کو حسبِ وعدہ جنرل رحیم لکشم روانہ ہُوئے۔ ان کے آگے آگے ملٹری پولیس کی جیپ تھی جو حفاظتی دستے کا کام بھی دیتی تھی۔ جب یہ جیپ مظفر گنج کے قریب پہنچی تو اس پر اچانک فائرنگ ہُوئی یُوں جنرل رحیم کو وہاں دُشمن کی موجودگی کا احساس ہُوا اور وہ اپنا دَورہ منسوخ کر کے واپس چاندپور تشریف لے گئے۔

اب اس سیکٹر کی قسمت کے فیصلے کی گھڑی آ چکی تھی۔ دُشمن اپنی پُوری طاقت سے چاندپور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ہمارے دو بریگیڈ چاندپور روڈ کے شمال (۱۱۷ بریگیڈ کومیلا) اور جنوب (۵۳ بریگیڈ لکشم) میں بیٹھے تھے۔ خود جنرل رحیم اپنی تمام تر ذہانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ چاندپور میں تشریف رکھتے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پلان کے مطابق دونوں بریگیڈ قینچی کے پَروں کی طرح آپس میں ملتے اور چاندپور روڈ پر دُشمن کا سر بڑھا ہوتا تو سر قلم کر دیتے اور اگر دھڑ آگے ہوتا تو دھڑ کاٹ دیتے ــــ لیکن افسوس کہ ۲۴ قیمتی گھنٹے کسی کارروائی کے بغیر گزر گئے۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی لکشم میں بیٹھے "دفاعی قلعہ بندی" مضبُوط کرتے رہے اور بریگیڈیئر عاطف خود کو اپنے مورچوں میں محفوظ محسوس کرتے رہے۔ ہمارے اس تعطل کے دوران میں دُشمن اپنی بھاری جمعیت مظفر گنج / چاندپور روڈ پر لے آیا۔

بالآخر، ۷ دسمبر کو لکشم میں کچھ حرکت ہُوئی۔ بریگیڈیئر نیازی نے ۳۹ بلوچ کو لیفٹیننٹ کرنل نعیم کی نگرانی میں لکشم میں رہنے دیا اور باقی نفری ۱۵ بلوچ اور ۲۳ پنجاب کی دو دو کمپنیاں اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی ایک کمپنی کو دو مضبُوط دستوں میں بانٹ کر مظفر گنج کی طرف روانہ کیا۔ ایک دستہ سیدھا مظفر گنج بھیجا گیا اور دوسرے کو جنوب مغرب سے ہو کر اس پر حملہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ارادہ یہ تھا کہ سامنے سے جانے والا دستہ دُشمن کو فائرنگ میں مصرُوف رکھے اور دوسرا دستہ پہلو سے اس پر حملہ کر دے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں دستے مِل جائیں گے تو دُشمن کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔

پہلا دستہ مظفر گنج کے قریب پہنچا، تو سامنے سے دُشمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیا۔ گویا منصوبے کا ایک حصّہ تو بآسانی پُورا ہو گیا، مگر دوسرے حصّے کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ دوسرا دستہ جنوب مغربی سمت سے حملہ آور ہو ــــ یہ دستہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ راستے ہی میں اس کا واسطہ مکتی باہنی سے پڑ گیا تھا ــــ اس دستے کے پیچھے رہ جانے سے مظفر گنج میں دُشمن سے نپٹنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا؛ چنانچہ ۱۵ بلوچ کی نفری کو واپس بُلا لیا گیا۔

دوسرے دستے کو جو ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کے سپاہیوں پر مشتمل تھا، مظفر گنج کے مغرب میں ہی گنج کی طرف جانے کو کہا گیا۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ اگر دُشمن مظفر گنج میں اپنے پاؤں جما چکا ہے، تو مزید آگے بڑھ کر اس سے بِلا جائے تا کہ وہاں قدم جمانے سے پہلے اس سے نپٹا جا سکے۔

یہ پیش قدمی کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل ہو رہی تھی کیونکہ چاند پور روڈ پر چڑھنے کا مطلب کھلے عام دشمن سے تصادم مول لینا تھا جو اس سپاہ کے مقامی کمانڈروں کے خیال میں موزوں نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ طریقہ بہتر تھا کہ دشمن سے دُور دُور رہ کر اپنی منزل پر پہنچا جائے اور پھر وہاں منظم ہو کر اس پر دھاوا بولا جائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ دشمن پکی سڑک استعمال کر رہا ہے اور یہ کچے کھیتوں میں پاؤں گھسیٹ رہے ہیں تو اس کا فائدہ کس کو زیادہ پہنچے گا۔ لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی بالترتیب ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر کی نفری کی کمان کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ ۷ دسمبر کی صبح لکشم سے مظفر گنج کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کا کام ہے جسے پورا کر کے وہ واپس لکشم آجائیں گے۔ بھاری ہتھیار، فالتو راشن اور کھانا پکانے کے برتن ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ؟ مگر اب انہیں جو سفر درپیش تھا اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ اب انہیں کھانا پکانے کے علاوہ فالتو ایمونیشن وغیرہ بھی درکار تھا تاکہ وہ راستے میں مکتی باہنی سے نپٹتے جائیں۔ ادھر متواتر پیدل چل کر سپاہیوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ فالتو اشیاء تو درکنار ان کو اپنا ذاتی اسلحہ اور بھیگے ہوئے بُوٹ بھی بھاری لگ رہے تھے۔ کئی سپاہیوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بُوٹ اُتار پھینکے اور بعض نے فالتو گولیوں کے پٹے ضائع کر دیے۔ اسی طرح اس دستے کے ساتھ جو فالتو وائرلیس سیٹ تھے انہیں بھی غیر ضروری بوجھ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔ اب لڑنا تو درکنار اس دستے کے لیے پیدل ہی گنج پہنچنا بھی دُشوار ہو گیا تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی نے ۹ دسمبر کو کھیتوں میں بیٹھ کر ایک غیر رسمی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اپنی نفری کو دو الگ الگ دستوں میں تقسیم کر لیں "تاکہ چھوٹے دستوں کی نقل و حرکت مکتی باہنی سے پوشیدہ رہ سکے۔" انہوں نے اگلی رات الگ الگ سفر کیا اور ۱۰ دسمبر کو مختلف مقامات پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ دوسرا واقعہ تھا کہ جنرل رحیم کی زیر کمان پلٹنوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔

میجر جنرل رحیم بڑے زیرک جی اوسی تھے۔ ان کی دُور اندیش نگاہوں نے ہی گنج کے واقعے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ جب ہم مظفر گنج سے دشمن کو نہیں ہٹا سکے تو چاند پور کی طرف اس کی پیش قدمی کیونکر روک سکیں گے؛ چنانچہ انہوں نے ۸ دسمبر کی رات ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دی کہ دشمن کے ہراول دستے کا ریلا چاند پور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ جب یہ اطلاع پہنچی تو میں ایسٹرن کمانڈ کے "آپریشن روم" میں تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور جنرل نیازی آپریشن روم سے ملحقہ تہہ خانے میں آرام فرما رہے تھے۔ انہوں نے جب اپنے قابلِ اعتماد جرنیل کی پریشانی کی خبر سُنی تو وہ اپنی آرام گاہ سے نکل کر آپریشن روم تشریف لائے تاکہ جنگی نقشے پر ایک نظر ڈال کر فیصلہ دے سکیں۔ انہوں نے اس وقت سُرخ رنگ کا ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں نیند کے سُرخ ڈورے نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیدھے نقشے کے پاس گئے۔ ہم سب آس پاس کھڑے تھے مگر وہ کسی سے نہ بولے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک دو سینیئر افسر بھی آپریشن روم میں آ گئے۔ جنرل نیازی نے چاند پور پر شہادت کی انگلی نصب کرتے ہوئے تاریخی فیصلہ صادر فرمایا کہ "رحیم سے کہہ دو کہ ڈھاکہ واپس آ جائے۔ دریائے میگھنا سے ٹیک لگا کر وہ چاند پور میں کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ اپنے ہیڈ کوارٹر کی حفاظت کے لیے ہے بھی تو اس کے پاس صرف ایک کمپنی۔"

جنرل رحیم کے لیے پسپائی کا راستہ دریائے میگھنا تھا۔ ان کے پاس لڑاکا سپاہیوں کی کُل نفری ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی جس میں فرنٹیئر فورس کی دو پلاٹون، ۲۳ پنجاب کی ایک پلاٹون اور کمانڈو بٹالین کے پچپن افراد تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس آرڈیننس، سگنلز،

سپلائی اور اسی طرح کے دوسرے خدمت گار محکموں کے لوگ تھے۔ انہوں نے ۹ دسمبر کو یہ نفری اکٹھی کرنے اور اگلی رات ڈھاکہ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور ایسٹرن کمانڈ سے کہا کہ وہ نیوی کی ایک گن بوٹ (GUN BOAT) اس بحری قافلے کی حفاظت کے لیے بھیج دے۔ اس قافلے کو لانے کے لیے انہوں نے مقامی طور پر کشتیاں اور لانچز (LAUNCHES) اکٹھی کرلیں۔

نرائن گنج (ڈھاکہ) سے جو گن بوٹ روانہ ہوئی وہ تقریباً آدھی رات کو چاندپور پہنچی۔ عموماً دریائی راستے سے چاندپور سے ڈھاکہ چار گھنٹے کا سفر تھا اور بھانت بھانت کی کشتیوں پر مشتمل یہ قافلہ زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے میں ڈھاکہ پہنچ سکتا تھا۔ گویا راتوں رات سفر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل رحیم کا قافلہ بلا تاخیر چاندپور سے روانہ ہو جائے مگر وہاں ہر چیز ایسی غیر منظم تھی کہ ۳۹ ڈویژنل ہیڈکوارٹر کا عملہ اور حفاظتی سپاہی ۱۰ دسمبر کو صبح پونے ۴ بجے روانہ ہوئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر جنرل رحیم نے ایسٹرن کمانڈ کو ایک تار (سگنل) روانہ کر دیا کہ دیر سے روانگی کی وجہ سے آدھا سفر طلوعِ آفتاب کے بعد کرنا پڑے گا، اس لیے ہماری حفاظت کے لیے فضائیہ کو بھیجا جائے۔ اگر فضائیہ میسر نہ ہو تو ایک اور گن بوٹ روانہ کی جائے (انہیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری فضائیہ ۶ دسمبر سے طاقتِ پرواز کھو چکی ہے)۔ اضافی گن بوٹ والی خبر جب ریئر ایڈمرل شریف تک پہنچی تو انہوں نے کہا اگر ایک گن بوٹ کانوائے (CONVOY) کی حفاظت نہیں کر سکتی تو دوسری سے کیا فرق پڑے گا۔ دوسری گن بوٹ کو خواہ مخواہ خطرے میں کیوں جھونکا جائے۔

بھارتی طیارے عموماً صبح ناشتے کے وقت حملہ کیا کرتے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو بھی انہوں نے ناغہ نہ کیا۔ اس روز ناشتے کے وقت جو ٹارگٹ ان کے سامنے تھا وہ یہی بدقسمت "کانوائے" تھا جو اب نرائن گنج پہنچنے والا تھا۔ دشمن کے جیٹ طیارے چیلوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ گن بوٹ نے طیارہ شکن توپ سے مدافعت کی مگر یگ ۱۴ طیاروں کے سامنے اس کی کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک دھماکے سے گن بوٹ کا بالائی حصہ اڑ گیا، مگر اس کا کپتان اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ وہ بڑی مہارت سے اسے چلاتا ہوا کنارے پر لے گیا۔

ایک دو ضربیں دوسری کشتیوں اور لانچوں پر بھی پڑیں جس سے بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں نے چھلانگیں لگا کر اپنی جان بچانا شروع کی۔ جہاز بدستور حملے کرتے رہے۔ ہمارے چار افسر موقع پر ہی شہید ہو گئے جن میں کمانڈو بٹالین کے میجر بلال بھی تھے (جو ۲۵ مارچ کو شیخ مجیب کو گھر سے گرفتار کر کے لائے تھے) زخمیوں میں میجر جنرل رحیم بھی شامل تھے جن کی ٹانگوں پر خراشیں آئی تھیں۔ انہیں فوراً ڈھاکہ لایا گیا۔ یوں چاندپور اور ۳۹ ڈویژنل ہیڈکوارٹر جنگی نقشے سے معدوم ہو گیا۔

اِدھر پیچھے لکشم میں بھی حالات دگرگوں ہو گئے۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی کو پانچ کمپنیوں سے اس "دفاعی قلعہ" کا دفاع کرنا مشکل نظر آنے لگا۔ انہوں نے ۹ دسمبر کو ڈھاکہ سے پوچھا کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ جواب ملا کہ کومیلا بریگیڈ (۱۱۷) سے مل جاؤ۔ اس حکم کی ایک توضیح یہ تھی کہ تم الگ تھلگ پڑے کیا کرو گے، قریب ترین بریگیڈ کے ساتھ مل کر اپنی جان بچاؤ، مگر اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ دیکھتے کیا ہو کومیلا میں ایک بریگیڈیئر (عاطف) بیٹھا ہے پیچھے تم ہو۔ دونوں کے درمیان چاندپور روڈ پر دشمن ہے، آپس میں مل گئے تو دشمن کی آمد و رفت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ایسٹرن کمانڈ کا اصرار ہے کہ اس کا مطلب مؤخر الذکر طریقۂ کار تھا، جبکہ بریگیڈیئر نیازی کہتے ہیں کہ اس حکم کا مطلب صرف کومیلا سے جا ملنا تھا جس پر انہوں نے فی الفور عمل کیا۔

لکشم چھوڑ کر کومیلا جانے میں ایک غور طلب بات یہ بھی تھی کہ وہاں پڑے ہوئے ۱۲۴ زخمیوں کا کیا بنے گا جنہیں مقامی سول ہسپتال میں جمع کیا گیا تھا۔ ۸ دسمبر کو جب ہم دشمن کو مظفر گنج سے نکالنے میں ناکام رہے تو ان زخمیوں کو چاندپور منتقل کرنے کے لیے ایک ریل گاڑی میں ڈالا گیا۔ وہ ساری رات تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں پڑے کراہتے رہے۔ ان میں سے بعض کی حالت تشویشناک تھی۔ ڈاکٹر کے پاس

دوائیں تھیں نہ عملہ۔ وہ بے چارہ رات کو درد رفع کرنے کے مکسچر سے ایک کیتلی بھر کر گاڑی میں لے گیا اور رات کی تاریکی میں شدید زخمیوں کے منہ میں اندازے کے مطابق دوا انڈیلتا رہا۔ اگلے روز خود چاند پور کا مقدر ڈانواں ڈول نظر آنے لگا تو زخمیوں کو اُتار کر واپس ہسپتال بھیج دیا گیا۔

لکشم سے ۵۳ بریگیڈ روانہ ہونے لگا تو اس نے زخمیوں اور ان کی تیمارداری کرنے والے ڈاکٹروں کو اطلاع نہ دی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بریگیڈیئر اسلم نیازی نے ساری نفری کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں سول آرمڈ فورسز، مجاہد اور رضا کار وغیرہ تھے جن کی کمان میجر ریشم کے سپرد تھی۔ دوسرا حصہ جس کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل نعیم تھے زیادہ تر ۳۹ بلوچ کی نفری پر مشتمل تھا۔ لکشم سے پہلے میجر ریشم والا قافلہ روانہ ہوا اور اس کے بعد لیفٹیننٹ کرنل نعیم والا۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی اپنے ذاتی حفاظتی دستے سمیت الگ طور پر کومیلا چل دیے۔

کومیلا لکشم سے کوئی ۲۸ کلومیٹر دور تھا۔ عام حالات میں یہ مسافت طے کرنے میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگتے تھے لیکن آج مکتی باہنی اور بھارتی سپاہیوں کی متوقع مدافعت کے پیش نظر تین گنا وقت رکھا گیا تھا۔ ۱۰ دسمبر کی رات کو روانگی غروب آفتاب کے چند گھنٹے بعد رکھی گئی تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے تینوں قافلے (بریگیڈیئر اسلم، لیفٹیننٹ کرنل نعیم اور میجر ریشم) کومیلا پہنچ جائیں۔

۵۳ بریگیڈ نے لکشم سے روانگی سے قبل اپنا بھاری جنگی سامان اور فالتو ایمونیشن وغیرہ تالابوں میں پھینک دیا یا نذر آتش کر دیا۔ سپاہیوں نے صرف اپنے ذاتی ہتھیار اور تھوڑا تھوڑا ایمونیشن اپنے پاس رکھا۔ اتفاق کی بات ہے بریگیڈیئر اسلم نیازی اور میجر ریشم والے فوجی دستے تو بخیر و عافیت راتوں رات کومیلا چھاؤنی پہنچ گئے، مگر لیفٹیننٹ کرنل نعیم والا قافلہ بعض مشکلات میں اُلجھ کر رہ گیا۔

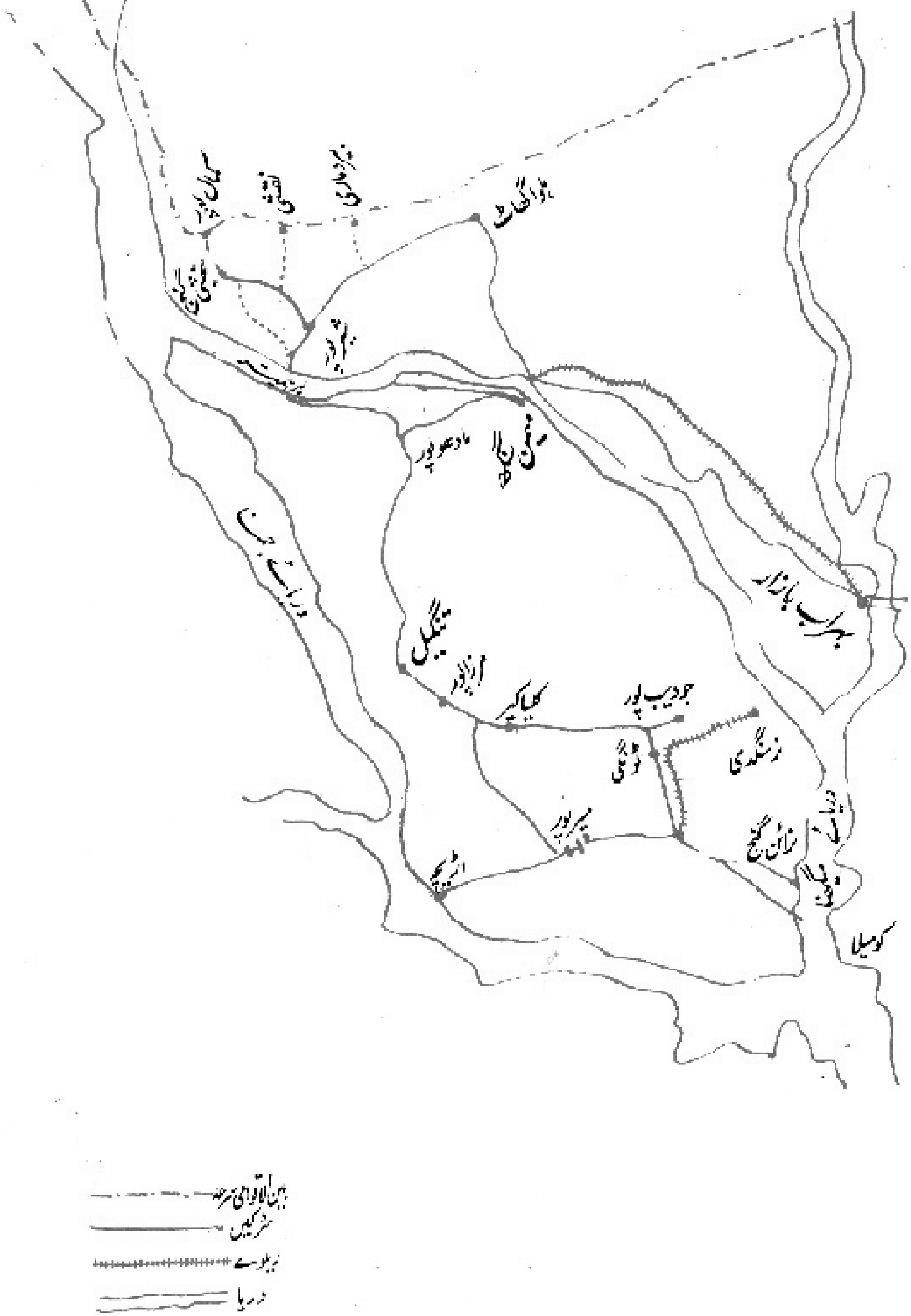
کرنل نعیم کسی جانے پہچانے راستے کے بجائے ایسی راہ کی تلاش میں تھے جہاں انہیں دشمن سے واسطہ نہ پڑے؛ چنانچہ وہ بچتے بچاتے، پیچ و خم کھاتے آگے بڑھتے رہے۔ جہاں انہیں کوئی گاؤں نظر آتا یا کسی جھاڑی پر مکتی باہنی ہونے کا شبہ ہوتا تو وہ کترا کر دوسری طرف نکل جاتے۔ یوں چلتے چلاتے وہ اگلے روز کومیلا سے ۱۱ کلومیٹر جنوب مغرب میں "جانگلیہ" کے مقام پر جا نکلے۔ انہوں نے سوچا کہ بہت مسافت طے کر لی، اب یہاں آرام کر لیا جائے اور پھر اگلے روز تازہ دم ہو کر کومیلا چھاؤنی میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے لہٰذا انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال لیا۔ رات بخیر و خوبی گزری۔ اگلی صبح وہ کومیلا کی طرف جاتے ہوئے "جلسپور" پہنچے تو وہاں سے ان پر فائرنگ ہوئی۔ انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ اس مختصر مگر تند و تیز جھڑپ میں چند قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں جن میں کمپنی کمانڈر میجر تیمور بھی شامل تھے۔ کرنل نعیم اس قربانی کے بعد پھر اپنے جوانوں کو جانگلیہ لے آئے جہاں انہوں نے اپنے افسروں کی ایک چھوٹی سی میٹنگ کی تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کومیلا میں داخل ہونے کی آئندہ کوشش کس طرف سے کی جائے۔ کسی نے کہا کہ پھر جلسپور کی طرف جا کر زوردار حملہ کر کے دشمن کا حصار توڑ دیا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کومیلا داخل ہونے کے بجائے ڈھاکہ کا رُخ کیا جائے خواہ مخواہ مزید جانیں قربان کرنے کا کیا فائدہ؟ فیصلہ یہی ہوا کہ ایک رات جانگلیہ میں بسر کر کے اگلے روز کومیلا / ڈھاکہ روڈ کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ اگر اُدھر سے کومیلا چھاؤنی میں داخل ہونے کا موقع مل جائے تو بہتر، ورنہ ڈھاکہ کا رُخ کیا جائے۔

۱۲ دسمبر کا سورج طلوع ہوا، تو کرنل نعیم اپنی متاع لے کر روانہ ہوئے۔ ابھی چند کلومیٹر گئے ہوں گے کہ ان کے ہراول دستے کو "رام موہن" اور "چندینا" کے درمیان بھارتی سپاہی نظر آئے۔ وہ پہلے کچھ ٹھٹکے۔ پھر انہوں نے پیچھے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی طرف دیکھا، اور چند ثانیے بعد وہ اپنے سفید رومال لہراتے ہوئے دشمن کے پاس چلے گئے۔ کرنل نعیم سمیت باقی قافلہ بھی ان کے پیچھے پیچھے دشمن کی خدمت میں حاضر ہو گیا ـــ یہ اس ڈویژن کی تیسری سپر اندازی تھی!

کومیلا کا "قلعہ" ابھی باقی تھا۔ اس میں دو بریگیڈیر (عاطف اور اسلم نیازی) انفنٹری کی دو پلٹنیں اور دو ٹینک موجود تھے۔ ان کا دائرۂ اثر صرف چھاؤنی کے علاقے تک محدود تھا۔ کومیلا شہر پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بلیک آؤٹ کی قدغن بھی چھاؤنی تک ہی تھی۔ شہر بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

کومیلا چھاؤنی کا "دفاعی قلعہ" ابھی ہمارے پاس ہی تھا کہ ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

میمن سنگھ سیکٹر



باب ۲۱

میمن سنگھ سیکٹر (۳۶ ہنگامی ڈویژن)

میجر جنرل جمشید جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں "ملٹری کراس" کا اعزاز حاصل کیا تھا، ٹھنڈے مزاج اور خاموش طبع آدمی سمجھے جاتے تھے۔ وہ ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل تھے، مگر جب جنرل نیازی نے ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کھڑے کرنے شروع کیے، تو ایک ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (۳۶) جنرل جمشید کے حوالے کر دیا۔ کہنے کو تو یہ ڈویژن تھا، مگر اس کی نفری صرف دو باقاعدہ پلٹنیں تھیں جو بریگیڈیر قادر کے ماتحت تھیں۔ اس ڈویژن کے ذمّہ ڈھاکہ اور اس کے عین شمال میں تنگیل اور میمن سنگھ کا علاقہ تھا۔

ہم نے ایک گزشتہ باب میں شمالی بنگال کا ذکر کرتے ہوئے دریائے جمنا سے مغربی جانب جنگ کا احوال بیان کیا ہے۔ اس باب میں دریائے جمنا سے مشرق میں جو سرحد سلہٹ کے بارڈر تک پھیلی ہوئی تھی، اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ یہ سرحد کوئی ۲۰۵ کلومیٹر لمبی تھی جس میں سے دو راستے جنوب کو پھوٹتے تھے۔ ایک ہلواگھاٹ میمن سنگھ کا راستہ اور دوسرا کمال پور سے جمال پور کا راستہ۔ بریگیڈیر قادر (۹۳ بریگیڈ) نے ۳۳ پنجاب کو ہلواگھاٹ اور ۳۱ بلوچ کو کمال پور والے راستے پر متعین کر دیا ——— خود اپنا ہیڈ کوارٹر انہوں نے میمن سنگھ میں رکھا۔

مذکورہ پلٹنوں کو پلان کے مطابق حکم یہ تھا کہ جب تک ممکن ہو وہ دشمن کو سرحد پر روکے رکھیں اور پھر "زیادہ سے زیادہ عرصے میں تھوڑے سے تھوڑا علاقہ" چھوڑتے ہوئے واپس میمن سنگھ اور جمال پور پہنچ جائیں جنہیں "دفاعی قلعوں" کی حیثیت دی گئی تھی۔ یہ دونوں قلعے دریائے برہم پتر کے جنوبی کنارے پر واقع تھے اور خیال تھا کہ یہ وہ دفاعی خط ہے جس سے دشمن کو کسی قیمت پر گزرنے نہیں دیا جائے گا۔

ان دو پلٹنوں کا مقابلہ دشمن کے ۱۰۱ کمیونیکیشن زون (101 COMMUNICATION ZONE) سے تھا جس کی کمان ایک میجر جنرل کے سپرد تھی۔ یہ زون ایک باقاعدہ ڈویژن کی حیثیت سے لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جنگ سے ذرا پہلے دشمن نے یہاں ایک اور بریگیڈ (۹۵) بھیج دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ توپ خانہ تھا ——— توپ خانے کی جگہ ہمارے پاس صرف ۱۲۰ ملی میٹر مارٹروں کی ایک بیٹری تھی۔

اس سیکٹر میں تین یادگار واقعات پیش آئے ——— کمال پور کا دفاع، ۹۳ بریگیڈ کی پسپائی اور تنگیل کے قریب بھارتی چھاتہ برداروں کی آمد۔ آئیے ان کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں کیونکہ اس سیکٹر کی ساری جنگی کارروائی انہی تین واقعات پر مبنی ہے۔

اس سیکٹر میں دشمن نے زیادہ توجہ کمال پور/جمال پور کی طرف دی کیونکہ اس طرف پکی سڑک تھی جو تنگیل سے ہوتی ہوئی سیدھی ڈھاکہ

چل جاتی تھی۔ اس کے برعکس ہلو اگھاٹ والا راستہ کچھ کچا اور کچھ پکا تھا۔ پھر اس میں اتنے بل آتے تھے کہ راستہ تین گنا ہ مسافت زیادہ طویل ہو جاتی تھی۔ کمال پور والا راستہ کھولنے کے لیے دشمن کے لیے اس سرحدی چوکی کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا جو کمال پور میں واقع تھی۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے دشمن کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا — آئیے ذرا دیکھیں کیسے ؟

دشمن نے کمال پور کو ۱۲ جون کو جھنجھوڑا جب مکتی باہنی کی کارروائیاں نئے ولولے کے ساتھ شروع ہوئی تھیں اور بھارتی توپیں سرحدی علاقوں میں ان کی امداد کے لیے گولے برسانے لگی تھیں۔ چند گولے کمال پور پوسٹ کے ارد گرد گرے مگر کوئی جانی یا مالی نقصان نہ ہوا۔ ۱۳ جولائی کو اس نے پھر اس "چھیڑ خانی" کا اعادہ کیا اور گولہ باری کے ساتھ مکتی باہنی کو حملہ کرنے بھیجا، مگر یہ حرکت اسے مہنگی پڑی، مکتی باہنی جس میں باغی ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کے سپاہی شامل تھے کئی لاشیں پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس معرکے کے دوران پاکستان کے ہاتھ جو اسلحہ لگا اس میں ایک بھاری مشین گن، دو ہلکی مشین گنیں، چار اسٹین گنیں، تیس رائفلیں اور ایک راکٹ لانچر شامل تھا۔ یہ تجربہ تخریب کاروں اور ان کے آقاؤں کو اتنا مہنگا پڑا کہ وہ دو اڑھائی ماہ تک سر نہ اٹھا سکے۔

۲۲ اکتوبر کو اس پوسٹ پر ایک اور دھاوا بولا گیا۔ اب مکتی باہنی کے ساتھ بھارت کی باقاعدہ فوج بھی حملے میں شریک تھی۔ یہ حملہ بھی ناکام رہا جس میں ایک افسر سمیت دشمن کے ۹ آدمیوں کو نقصان پہنچا۔

۱۴ نومبر کو دشمن نے ایک اور بھرپور کوشش کی جو کامیاب رہی۔ اس روز اس نے ۳ اگارڈز بٹالین اور مکتی باہنی سے حملہ کیا۔ اس دفعہ اس نے سامنے سے ٹکرانے کے بجائے پہلوؤں سے پیش قدمی کی۔ اس اثنا میں دشمن کا توپ خانہ کمال پور پوسٹ پر گولہ باری کرتا رہا یوں وہ اس سرحدی چوکی کے گرد گھیرا ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کمال پور میں ہماری کل نفری ستر باقاعدہ فوجیوں اور چند رینجرز اور رضا کاروں پر مشتمل تھی جن کی قیادت کیپٹن احسن ملک کے سپرد تھی۔ اس نفری کے علاوہ احسن کے پاس ۸۱ ملی میٹر کی تین مارٹر توپیں بھی تھیں۔

جب دشمن نے اس چوکی کو چاروں طرف سے کاٹ دیا، تو بٹالین ہیڈ کوارٹر بخشی گنج سے ایک دستہ روانہ کیا گیا تاکہ وہ دشمن کے حصار کو توڑ کر چوکی کو آزاد کرا سکے۔ اس دستے کے ساتھ دو مارٹر توپیں بھی روانہ کی گئیں تاکہ وہ توپ خانے کا کام دے سکیں۔ یہ کمک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی، مگر اسے قطعاً علم نہ تھا کہ دشمن کا گھیرا کتنا وسیع ہے۔ یہ ابھی ٹرکوں پر سوار جا رہے تھے کہ دشمن نے سڑک کے دونوں طرف سے ان پر فائر کر دیا۔ فوجی جوان کود کر نیچے اترے اور جوابی فائر کرنے لگے، مگر دشمن کا پلہ بھاری رہا۔ ہمارے دس آدمی ہلاک اور سات زخمی ہوئے جن میں ایک افسر بھی تھا۔ ہماری چاروں گاڑیاں (جن پر یہ نفری گئی تھی)، دونوں مارٹر توپیں اور ایک ہلکی مشین گن دشمن کے ہاتھ لگی۔

سرحدی چوکی سے رابطے کی یہ کوشش بہت مہنگی پڑی۔ اب ہمارے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ کمال پور والوں سے کہتے کہ میاں جیسے بھی ہو، اجتماعی یا انفرادی طور پر وہاں سے نکل آؤ یا پھر انہیں وہیں رکھ کر پیچھے سے بھاری کمک روانہ کرتے تاکہ دشمن محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اول الذکر طریق کار سرکاری پالیسی کے خلاف تھا، اس کے علاوہ کمال پور پوسٹ خالی کرنے کا یہ بھی نقصان ہو سکتا تھا کہ ہمیں اس کی سیدھ میں باقی سرحدی چوکیوں یعنی "نقشی" اور "بارو ماری" کو خالی کرنا پڑتا تھا جب سے مشرقی جانب ۳۳ پنجاب کا بائیں پہلو ننگا ہو جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کمال پور پوسٹ خالی کرنے سے پورے بریگیڈ کی دفاعی لائن کو پیچھے لانا پڑتا تھا۔

اگرچہ دشمن نے وسط نومبر سے کمال پور پوسٹ کو بٹالین سے کاٹ دیا تھا، مگر وہ اس کو ہڑپ نہ کر سکا تھا۔ یہ چوکی اب بھی اُس کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکی ہوئی تھی کیونکہ اس کے جیالے محافظوں نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ جب تک راشن اور ایمونیشن ساتھ دیتے ہیں یہ پیچھے نہیں ہٹیں گے، چنانچہ یہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ کیپٹن احسن نے ۲۲ نومبر کو ایک چھوٹی سی گشت پارٹی پوسٹ سے باہر بھیجی تاکہ پتہ کرے دشمن کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں ہے۔ یہ گشت پارٹی واپس نہ آئی۔ اُس نے اِس کی تلاش میں ایک اور پارٹی روانہ کی، مگر وہ بھی غائب ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ دشمن بھاری تعداد میں چوکی کے باہر بیٹھا ہے اور یہاں سے جو کوئی نکلتا ہے اُسے ہڑپ کر جاتا ہے ——— تیسری پارٹی بھیجنا سراسر حماقت تھی، لہٰذا کیپٹن احسن نے وائرلیس پر بٹالین ہیڈ کوارٹر سے درخواست کی کہ وہ اپنے بہتر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اِن گمشدہ پارٹیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے

بٹالین ہیڈ کوارٹر نے ایک فوجی دستہ فوراً اس کام کے لیے روانہ کیا ——— بلکہ اس کے ساتھ ایک ٹرک فالتو بھیج دیا تاکہ اگر وہ اہلِ زخمی (یا مردہ حالت) میں ملیں تو اٹھا کر لے آئیں۔ دشمن جو ہر کمک پر نظر رکھے ہوئے تھا، اس دستے پر بھی ٹوٹ پڑا، ہمارے کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ فالتو گاڑی بھی چھن گئی، البتہ چند سپاہی واپس بٹالین ہیڈ کوارٹر (بخشی گنج) پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اگلے تین روز برابر اسی قسم کی کوششیں ہوتی رہیں مگر کوئی کامیاب نہ ہوئی۔ آخرکار ۲۷ نومبر کو بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو خیال آیا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ انہوں نے ایک فیصلہ کن حملے میں حصار توڑ ڈالنے کا فیصلہ کیا ——— جس کے لیے انہوں نے اپنی ساری پلٹن کو تین دستوں میں بانٹا ——— ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ سیدھا سڑک پر چلتے ہوئے کمال پور کی طرف پیشقدمی کرے اور باقی دو دستوں کو تاکید کی کہ وہ سڑک کے دونوں جانب پھیل کر سرحدی چوکی کی جانب روانہ ہوں۔ تینوں دستوں سے کہا گیا کہ اُن کا کام دشمن کو بھگانا نہیں بلکہ گھیرے میں لے کر اُسے نیست و نابود کرنا ہے۔

جونہی یہ تینوں دستے کمال پور کی طرف بڑھنے لگے، بھارتی توپخانے کے دیدبان (OBSERVER) نے ان پر توپوں کے گولے برسانے شروع کیے۔ ہمارا ہراول دستہ گولہ باری سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔ اب ان پر چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ شروع ہو گئی ——— اوپر دشمن کے جیٹ طیارے منڈلانے لگے۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ اگر کچھ کسر باقی ہے تو پوری کر دیں ——— اس شدید مزاحمت کی وجہ سے رابطے کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

۲۷ اور ۲۸ نومبر کی درمیانی رات کو دشمن نے کمال پور پوسٹ پر ایسا زبردست حملہ کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا ٹنٹا ختم کرنے کا تہیّہ کر چکا ہے۔ حملہ نصف شب کو شروع ہوا۔ سب سے آگے اس کی ۱۳ گارڈز بٹالین کی ایک کمپنی تھی۔ ہمارے جوان سیمنٹ کے مورچوں میں بیٹھے تھے اور ان کے عزائم سیمنٹ سے بھی زیادہ پختہ تھے۔ انہوں نے کمال تحمّل سے دشمن کو آگے بڑھنے دیا۔ جب وہ اُن کے ہتھیاروں کی مؤثر زد میں آ گیا تو انہوں نے اپنے تمام ہتھیاروں سے اُس پر فائر کھول دیا۔ دشمن اس اچانک بوچھاڑ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اگلی صبح جب کیپٹن احسن کے جوان اپنی رات کی "کمائی" دیکھنے کے لیے نکلے تو انہیں دشمن کی ۳۰ لاشیں ملیں جن میں سے ایک توپخانے کے دیدبان کی تھی۔ ایک جوان رینگتا ہوا اُس کی لاش تک گیا اور اس کے قبضے سے گولہ باری کا تمام پلان برآمد کر لایا۔

ماہ نومبر کے آخری دو ہفتوں کی مسلسل جنگ سے دو باتیں ثابت ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ ہم چوکی تک کسی قسم کی کمک پہنچانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ دوئم یہ کہ دشمن بھی اس اڑنگ تھڑنگ چوکی کو ہڑپ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ہمارے لیے باعثِ اطمینان

بات یہ تھی کہ شدید مشکلات کے باوجود محصور جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے — مگر جنگ لڑنے کے لیے حوصلے کے علاوہ ایمونیشن اور راشن وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس پوسٹ پر ختم ہونے کو تھا، چنانچہ کیپٹن احسن نے مزاحمت کو طول دینے کے لیے راشن اور ایمونیشن کا "کوٹہ" مقرر کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہر جوان روزانہ ایک چپاتی کم کھائے گا اور صرف اشد ضرورت کے تحت فائر کھولے گا — اپنے پیٹ پر پتھر باندھنا آسان، مگر ایمونیشن پر کنٹرول کرنا مشکل تھا، کیونکہ جب بھی دشمن شرارت کرتا، اسے سبق سکھانے کے لیے فائر کرنا پڑتا۔ بعض سپاہی تو اتنے حسّاس ہو گئے تھے کہ رات کو اگر کوئی جھاڑی بھی ہلتی، گیدڑ کھانستا یا مینڈک ٹرّاتا، تو وہ رائفل کی لبلبی دبا دیتے۔

سب سے ابتر حالت ان پانچ جوانوں کی تھی جو زخمی ہو کر چوکی میں پڑے تھے۔ انہیں پیچھے لانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہاں رکھ کر اُن کا علاج معالجہ مشکل تھا۔ چوکی میں صرف ایک نرسنگ اسسٹنٹ تھا جو صرف مرہم پٹی کر سکتا تھا اور بوقتِ ضرورت درد دُور کرنے والی گولی دے سکتا تھا۔ دواؤں کے ساتھ ساتھ خوراک کی حالت بھی پتلی تھی۔ گوشت سبزی کا تصوّر ختم ہو چکا تھا، صرف خشک راشن یعنی دال روٹی پر گزارہ تھا جو روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں زخمیوں کو گھونٹ بھر شوربا دینے کے لیے فاختائیں اور جنگلی کبوتر مل جاتے تھے، اب دن رات کی تڑتڑ کے بعد وہ بھی کُوچ کر چکے تھے۔

اِس کے باوجود عزم و استقامت کی علامت "کمال پور پوسٹ" اپنی جگہ پر قائم تھی۔

۲۹ نومبر کا ذکر ہے کہ ۳۱ بلوچ کے براہٹ کمپنی کمانڈر میجر ایّوب نے فیصلہ کیا کہ خواہ اُس کی جان چلی جائے وہ ضرور چوکی تک کمک پہنچا کر آئیں گے۔ انھوں نے اپنے ساتھ چند جانثار اور رضا کار لیے۔ رضا کاروں نے اپنے سروں پر ایمونیشن کے ڈبے اور راشن کے تھیلے اُٹھائے ہوئے تھے۔ میجر ایّوب اور اُن کے ساتھی سڑک سے دُور ہٹ کر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کبھی کوئی پگڈنڈی سامنے آ جاتی، تو اُس پر ہو لیتے، مگر جب خیال آتا کہ یہ پگڈنڈی کہیں انہیں سیدھی دشمن کی پوزیشن میں نہ لیجائے، اسے چھوڑ دیتے۔ یُوں بچتے بچاتے وہ کمال پور پوسٹ کے قریب پہنچ گئے۔ اتنے میں دشمن نے فائر کرنا شروع کر دیا۔ میجر ایّوب تو ہمّت کر کے آگے بڑھ گئے اور چوکی میں پہنچ گئے، مگر رضا کار وہیں سامان پھینک کر لیٹ گئے — اور جب فائر کم ہُوا، تو رینگتے ہوئے واپس بخشی گنج آ گئے۔

میجر ایّوب کی آمد سے اگرچہ کمال پور والوں کو ایمونیشن کی کوئی اضافی گولی دستیاب نہ ہوئی، نہ ایک وقت کا آٹا، مگر وہ خوش تھے کہ کوئی اُن کی خبر لینے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آیا ہے۔ میجر ایّوب نے ایمونیشن کی حالت پوچھی، تو انہیں بتایا گیا کہ ہلکی مشین گن کی دو سَو گولیاں، تین انچ دہانے والی مارٹر کے بارہ گولے اور دو انچ دہانے والی مارٹر کے دس گولے باقی ہیں۔ اس کے علاوہ اوسطاً ہر سپاہی کے پاس رائفل کی ۵۷ گولیاں ہیں — میجر ایّوب نے واپس آ کر یہ صورتِ حال اپنے کمانڈنگ آفیسر کے گوش گزار کر دی۔

میجر ایّوب کے بعد کوئی کمال پور پوسٹ نہ پہنچا۔ خالی ہاتھ نہ راشن اور ایمونیشن سمیت۔ جب تک گولیاں اُن کے پاس رہیں ہمارے جوان وہاں پڑے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، حتّٰی کہ ۳ دسمبر کو کھُلی جنگ چھڑ گئی۔ اب دشمن نے پُوری قوّت سے اس روڑے کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ ۴ دسمبر کی صبح کو چند ہیلی کاپٹر کمال پور پوسٹ کے اُوپر چکّر کاٹتے دکھائی دیے۔ ہمارے سپاہیوں کے چہرے تمتما اٹھے کہ شاید ڈھاکہ سے انہیں نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ درحقیقت دشمن کی چیلیں تھیں جو ماس تلاش

کر رہی تھیں — اُوپر یہ حالت تھی اور نیچے دشمن اپنا گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔

میجر ایّوب جو کمال پور پوسٹ کی حالت خود دیکھ کر آئے تھے، کمال پور پہنچنے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے ۴ دسمبر کو وہاں کمک پہنچانے کی ایک اور کوشش کی مگر راستے میں ہی شہید ہو گئے۔ یہ پلٹن کے لیے بہت بڑا نقصان تھا جس کی اطلاع پاکر سرحدی پوسٹ اور پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں یاس کی لہر دوڑ گئی۔

اسی سہ پہر ۴ دسمبر کو ایک بنگالی سویلین سفید رومال ہلاتا ہوا کمال پور پوسٹ پہنچا۔ اس نے کیپٹن احسن کو بھارتی کمانڈر کا یہ پیغام دیا کہ کیوں بیکار اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان گنواتے ہو — چھوڑو، بہت ہو گئی اب ہتھیار ڈال دو۔ کیپٹن احسن نے تند و تیز جواب دے کر اُسے لوٹا دیا — مگر بعد میں سوچنے لگا کہ اگر میں اپنے سپاہیوں کو جنگ جاری رکھنے کے لیے مزید ایمونیشن نہیں مہیا کر سکتا، تو کیا انہیں یوں موت کے مُنہ میں جھونکنا سراسر زیادتی نہیں۔ اس نے اپنے تجربہ کار جے سی او اور چند دیگر حضرات سے مشورہ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مزید مدافعت بیکار ہے۔

اسی رات کمال پور چوکی دم توڑ گئی !

اس کے فوراً بعد دوسری سرحدی چوکیوں یعنی نقشی اور بیرو ماری کو بھی خالی کرنا پڑا، کیونکہ تینوں چوکیاں سرحد کے ساتھ ساتھ ایک لائن میں تھیں اور اس طرح کی دفاعی ترتیب کا نقصان یہی ہوتا ہے کہ جب ایک کڑی ہٹالی جائے تو سارا سلسلہ پیچھے لانا پڑتا ہے۔ چنانچہ ۳۱ بلوچ نے دریائے برہم پتر کے شمال میں شیر پور کو اپنا نیا دفاعی مرکز بنایا اور اس کے مشرق و مغرب میں نئی چوکیاں جینفیہ گتی، کیوریہ اور جگن چار کے مقامات پر بنائیں۔ ۳۱ بلوچ کی نئی دفاعی لائن کے پیشِ نظر ۳۳ پنجاب کو سرحد سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے اپنا نیا دفاعی مرکز سرچہ گھاٹ میں بنایا جو شیر پور کی سیدھ میں پڑتا تھا۔ گویا اس سیکٹر میں نیا دفاعی خط دریائے برہم پتر کے شمال میں شیر پور اور سرچہ کے درمیان سے گزرتا تھا۔

۵ دسمبر کی صبح کو دشمن نے شیر پور کے مغربی جانب دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہاں ہماری ایک چھوٹی سی پوسٹ تھی جو جگن چار کے مقام پر واقع تھی۔ وہ بارڈر سے شیر پور کو آنے والی پکّی سڑک سے ہٹ کر تھی۔ اس کی طرف ایک کچّا راستہ جاتا تھا۔ خیال تھا کہ دشمن اس کچّے راستے کے بجائے پکّی سڑک پر بڑھتا ہوا شیر پور سے ٹکرائے گا جہاں ہم دفاع کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے، لیکن اس نے پہلے کی طرح یہاں بھی ہماری توقّع پوری کرنے سے انکار کر دیا اور کچّے راستے سے ہوتا ہُوا جگن چار جا پہنچا۔ اس پوسٹ کے انچارج نوجوان افسر نے شیر پور اطلاع دی کہ دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور ہمارے پاس ایمونیشن کم ہے، ممکن ہے ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہ سکیں۔ یہ خبر سُنتے ہی ۳۱ بلوچ کے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر فضل اکبر ایمونیشن اور مزید نفری لے کر جگن چار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ شہر سے باہر ٹی (T) جنکشن ہی پر پہنچے تھے کہ آگے سے انہیں جگن چار والی نفری واپس آتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے اسے روکا اور وہیں نئی دفاعی لائن قائم کرنے کا حکم دیا۔ جب مورچے کھودنے کی باری آئی، تو پتا چلا کہ بیلچے اور کدالیں بھی نہیں ہیں۔ قریب ترین دیہات کی طرف رجوع کیا گیا، تو وہاں سے محبِ وطن بنگالیوں نے نہ صرف کدالیں وغیرہ مہیا کیں، بلکہ پاکستان کو بچانے کے لیے مورچے کھودنے میں بھی مدد دی۔

اُدھر میمن سنگھ میں بیٹھے بریگیڈیئر قادر گڑھ رہے تھے کہ ۳۱ بلوچ نے کیا کیا۔ اُس نے پہلے سرحدی چوکیاں چھوڑیں — پھر بخشی گنج سے اپنا بٹالین ہیڈ کوارٹر اکھاڑا — اور پھر ایک ہی جست میں شیر پور تک پہنچ گئی — اُن کا خیال تھا کہ یہ زیادہ

سے زیادہ وقت میں کم سے کم علاقہ" دینے کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اس سے نہ صرف ۳۱ بلوچ کی دفاعی پوزیشن متاثر ہوئی تھی، بلکہ ہمارے بریگیڈ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب انہوں نے جگمن چار سے پسپائی کی خبر سُنی، تو اور بھی برہم ہوئے۔ انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ جگمن چار پر قبضہ کریں، مگر کرنل سلطان نے پیش قدمی کے بجائے ایک جست اور پیچھے لگائی اور دریائے برہم پتر پار کر کے جمال پور پہنچ گئے۔ کرنل صاحب کا خیال تھا کہ دریا کے شمال میں بیٹھے رہنے کے بجائے اس کے جنوبی کنارے سے دشمن کا بہتر طور پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی اس حرکت سے اُن کے دائیں جانب ۳۳ پنجاب کو بھی سرچہ گھاٹ سے ہٹ کر میمن سنگھ آنا پڑا۔۔۔ گویا ۸ دسمبر تک ہماری دفاعی لائن سرحد سے ہٹتی ہٹتی میمن سنگھ اور جمال پور میں آ گئی۔ ان دونوں شہروں میں جو "دفاعی قلعے" سمجھے جاتے تھے، راشن اور ایمونیشن کے کافی ذخائر موجود تھے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر بروقت آ کر بیٹھ جانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ دشمن جب بھی دریا پار کرنے کی کوشش کرے گا، اُسے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔

دشمن نے پہلی بار ۷ دسمبر کو فضائیہ اور توپ خانے کی مدد سے جمال پور پر گولے برسانے شروع کیے۔ پہلے دن ان کا زیادہ اثر نہ ہُوا جمال پور گیریژن کے محافظ سمجھنے لگے کہ وہ کافی عرصے تک "آہرن" کی طرح "ہتھوڑوں" کی ضربیں سہ لیں گے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ ایک اچھی حکمتِ عملی تھی لیکن ہم نے اُوپر دیکھا ہے کہ باقی سیکٹروں میں یہ کامیاب نہیں ہوئی۔ دیکھیے یہاں کیا بیتتی ہے؟

اگرچہ ہمارے سارے دفاعی انتظامات جمال پور میں تھے، ہم نے سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی دریائے برہم پتر کے پار بٹھا رکھی تھی تاکہ وہ دشمن کی پیش قدمی کی اطلاع دے سکے۔ جب دشمن کی فضائیہ اور توپخانہ جمال پور پر گولہ باری کر رہے تھے تو اُس کی بری فوج کے دستے دریائے برہم پتر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہمارے سپاہیوں کی یہ ٹولی بھی واپس آ گئی اور جمال پور دشمن کا حملہ روکنے کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔ دوپہر کو دشمن کا کمانڈر دریا کے پار اپنے چند سینیئر افسروں سمیت نظر آیا۔۔۔ غالباً یہ اُس کا "او گروپ" ('O' GROUP)[1] تھا۔ ان افسروں کو گولی مارنے کو بہت جی چاہا، مگر وہ ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کی مار سے باہر تھے۔ البتہ اس او گروپ کا کمانڈر ایک بارودی سُرنگ (مائن) اچھلنے سے زخمی ہو گیا۔ وہ واپس چلا گیا اور اس کی جگہ ۱۰۱ کمیونی کیشن زون کا نیا کمانڈر میجر جنرل ناگرہ مقرر ہُوا۔

اگلے تین روز ہم جمال پور اور میمن سنگھ میں بیٹھے ہوائی جہازوں اور توپوں کے گولے سہتے اور دشمن کی پیش قدمی کا انتظار کرتے رہے، مگر اس کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ کیا اُسے دریا پار کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی؟ کیا وہ پیش قدمی کا ارادہ ترک کر چکا تھا؟ کیا ہماری یہ دفاعی لائن ناقابلِ تسخیر تھی؟

اس عرصے میں بھارتی فوج کے بریگیڈیر کلیر (CLERE) نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ جمال پور کے چاروں طرف گھیرا مکمل ہو چکا ہے، پاکستانی فوج کا بچ نکلنا مشکل ہے۔ اُوپر سے ہماری فضائیہ کے کئی سکواڈرن بمباری کرنے کو تیار کھڑے ہیں، بہتر ہوگا آپ انسانی جانوں کے بیجا ضیاع سے گریز کریں اور ہتھیار ڈال دیں۔ کرنل سلطان نے ایک جوابی خط

---

[1] یہ گروپ جنگی صورتِ حال کے پیشِ نظر نئے طریق کار پر غور کرتا ہے اور وہیں موقع پر کمانڈر اپنے ساتھی افسروں کو ضروری احکام دیتا ہے۔

لکھا کہ تم قلم کے دھنی معلوم ہوتے ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم قلم چھوڑ کر اسٹین گن سنبھالو اور لڑ کر جمال پور فتح کرو۔ انہوں نے جواب روانہ کرتے وقت اس خط میں پستول کی ایک گولی بھی لپیٹ کر بھیج دی۔ یہ اس پاکستانی کمانڈر کی سپاہیانہ آن کی علامت تھی۔ یہ پُراعتماد جواب پاکر بھارتی کمانڈر خاموش ہوگیا اور جمال پور کا قلعہ ناقابلِ تسخیر نظر آنے لگا۔

اس اثنا میں ڈھاکہ کے کمانڈروں کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ (کیوں؟ اس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا) جنرل نیازی نے جنرل جمشید کو حکم دیا کہ وہ بریگیڈیر قادر والا بریگیڈ میمن سنگھ اور جمال پور سے واپس بلا کر ڈھاکہ کے شمال میں کلیاکیر (KALIAKAIR) میں متعین کردے۔ بریگیڈیر قادر کو پسپائی کا حکم دس دسمبر کو ملا۔ وہ اس آرڈر سے خوش نہ تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دفاعی قلعوں سے ہٹا کر کلیاکیر بھیجنے میں کیا تُک ہے؟ انہوں نے جنرل جمشید سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر ہر دفعہ اُن سے کوئی اسٹاف آفیسر کہہ دیتا: "جنرل جمشید اس وقت جنرل نیازی کے ساتھ کانفرنس میں مصروف ہیں۔" جب بریگیڈیر قادر کی گفتگو ختم ہوتی، تو ایک اسٹاف آفیسر تھوڑی دیر بعد اُن سے فون پر کہتا کہ جنرل صاحب پوچھ رہے ہیں پسپائی کس وقت شروع ہوگی؟

بریگیڈیر قادر نے ناچار ۱۰ دسمبر کی شام اپنی دونوں پلٹنوں (۳۳ پنجاب اور ۳۱ بلوچ) کو حکم دے دیا کہ وہ اپنے اپنے دفاعی قلعوں سے نکل کر جمال پور کے جنوب میں مادھوپور کے چوک میں رات کو مل جائیں جہاں سے اکٹھے کلیاکیر کی طرف جائیں گے۔

میمن سنگھ کی نفری زیادہ تر سول آرمڈ فورسز، ویسٹ پاکستان رینجرز اور رضاکاروں پر مشتمل تھی۔ اِن کے ساتھ کچھ محبِ وطن بنگالی بھی تھے۔ یہ سب لوگ ۱۰ دسمبر کو رات ۹ بجے کے قریب نکلے۔ ہر کوئی سب سے پہلے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کے سامنے جو گاڑی آئی، وہ اس میں بیٹھ گیا۔ بعض شہریوں نے سرکاری گاڑیوں کو اپنے صندوقوں، چارپائیوں اور بکریوں سے بھر دیا۔ اُدھر بنگالی ڈرائیور جو پرائیویٹ ٹرکوں پر جنگی ڈیوٹی کے لیے رکھے گئے تھے، گاڑی چلانے سے کترانے لگے۔ وہ طرح طرح کے بہانے کرنے لگے۔ کسی نے کہا میری گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوتی، کسی نے کہا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ لوگ کسی محفوظ جگہ پر منتقل ہوجائیں ــــ اگر کوئی محفوظ جگہ تھی تو!

۳۳ پنجاب رات کو پناہ گزین مردوں اور عورتوں سمیت مادھوپور پہنچ گئی۔ راستے میں اُسے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا، حالانکہ بہت افواہیں تھیں کہ مادھوپور کے جنگل میں مکتی باہنی کا گڑھ ہے اور وہ یہاں ہر طرح کی فوجی نقل و حرکت میں خلل ڈالے گی ــــ دوسری جانب جب ۳۱ بلوچ اپنے دفاعی قلعے (جمال پور) سے نکلنے لگی، تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کے اردگرد دشمن کا محاصرہ مکمل ہوچکا ہے۔ اُس نے جمال پور سے مغرب میں مکتی باہنی کی رہنمائی میں دریا عبور کرلیا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل سلطان نے محاصرہ توڑ کر اپنی سپاہ کے انخلا کے لیے ایک پلان بنایا جس کے مطابق ساری فورس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے میں طاقتور لڑاکا فوج رکھی گئی اور دوسرے میں زخمی اور نیم عسکری افراد۔ پہلا حصہ جس میں ۳۱ بلوچ کی دو کمپنیاں شامل تھیں خود کرنل سلطان کے زیرِ کمان تھا جبکہ دوسرے حصے کی قیادت اُن کے نائب میجر فضل اکبر کے سپرد تھی۔

کرنل سلطان جونہی اپنا فوجی دستہ لے کر جمال پور سے باہر نکلے، دشمن سے اُن کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ دراصل رات کی تاریکی میں یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ جمال پور کے اردگرد ہمارا فوجی دائرہ کہاں ختم اور دشمن کا حصار کہاں شروع ہوتا ہے، لہٰذا کھلے میدان میں ہمارے سپاہی دونوں جانب سے گولیوں کی زد میں آگئے۔ کم از کم تئیس آدمی ہلاک اور چھبیس زخمی ہوئے۔ دشمن کے نقصان کا اندازہ

نہ ہو سکا۔ ہماری بچی کھچی نفری چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر اس نرغے سے نکل گئی ـــــ دوسرا گروہ جو جمال پور میں بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ حصار ٹوٹے تو یہ بھی نکلیں، وہیں کا ہو کر رہ گیا ـــ بعد میں انہوں نے وہیں اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے خال خال آدمی اپنی ہمت پر ڈھاکہ کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

۳۱ بلوچ کے یوں بکھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ بریگیڈیر قادر کے اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکتا تھا کہ دونوں پلٹنیں مادھو پور جنکشن یا چورا ہے پر اکٹھی ہوں اور پھر باقاعدہ مل کر کلیا کیر کی طرف روانہ ہوں۔ جب بریگیڈیر قادر نے دیکھا کہ ۳۱ بلوچ مذکورہ جگہ پر پہنچنے میں ناکام رہی ہے تو انہوں نے اس چوراہے پر میجر سرور کی ایک کمپنی اور میجر ای۔جی۔شاہ کی ہلکی توپیں (مارٹر) ۳۱ بلوچ کی رہنمائی کے لیے چھوڑیں اور خود اپنے حفاظتی دستے سمیت تنگیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

بریگیڈیر قادر اور ان کے ساتھی ۱۱ دسمبر کی صبح کو تنگیل پہنچ کر سستانے لگے ـــ البتہ ان کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل اکبر، جو سول آرمڈ فورسز کے کمانڈر تھے، کلیا کیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ بمشکل دو یا تین کلومیٹر ہی گئے ہوں گے کہ انہوں نے دیکھا راستے میں تازہ تازہ بارودی سرنگ (MINE) پھٹی ہے جس کا نقشہ انہوں نے میرے سامنے یوں کھینچا:

"سڑک کے ایک کنارے پر ایک گاڑی اوندھی پڑی تھی، ساتھ ہی ڈرائیور خون میں لت پت تڑپ رہا تھا، ذرا ہٹ کر لیفٹیننٹ کرنل سلطان ہاتھوں پر سر رکھے پریشان بیٹھے تھے۔ اتنے میں اتفاقاً ۳۱ بلوچ کا ایک بھٹکا ہوا سپاہی وہاں سے گزرا۔ اس نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دیکھا، تو فوراً سلیوٹ کیا۔ کرنل نے چیخ کر کہا: "میرے جوان کہاں ہیں، میری پلٹن کدھر ہے؟" سپاہی شاید یہی سوال اپنے کمانڈنگ آفیسر سے کرنا چاہتا تھا، مگر خاموشی سے سلیوٹ کر کے آگے نکل گیا۔ میں سلطان کو واپس اپنے ساتھ تنگیل لے آیا۔"

اکبر اور سلطان نے بریگیڈیر قادر کو بارودی سرنگ کے حادثے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دشمن نے راستے میں غالباً ایسی بہت سی سرنگیں بچھا رکھی ہیں، حالانکہ یہ تاثر حقیقت حال کے برعکس تھا کیونکہ اسی سڑک سے ہمارے کئی جوان گزر رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہاں بھارتی سپاہی گاڑیاں چلا رہے تھے۔ بہر حال یہ خبر سن کر بریگیڈیر قادر سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟

اب سہ پہر ہو چکی تھی، سورج اپنا دن بھر کا آدھا سفر طے کر کے مغرب کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ بریگیڈیر قادر اور ان کے چند اسٹاف آفیسر سرکٹ ہاؤس کی سفید عمارت کے برآمدے میں کھڑے کسی روشن خیال کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اچانک دشمن کے باربردار طیارے آ گئے۔ انہوں نے تنگیل کے شمال میں کالی ہٹی کے قریب چھاتہ بردار فوج اتارنا شروع کر دی۔ دوسری طرف نگاہ ڈالی جنوبی طرف تنگیل کے متروک فضائی مستقر کے پاس بھی چھاتہ بردار فوج اتر رہی تھی۔ ان کے ساتھ ضروری جنگی سامان بھی پیراشوٹ کے ذریعے اتارا جا رہا تھا۔ ایک پیراشوٹ سے لٹکا ہوا سامان دیکھ کر ایک اسٹاف آفیسر چلایا: "ارے! یہ تو تین اعشاریہ سات دہانے کی توپ لگتی ہے۔"

بریگیڈیر قادر نے جھٹ اپنی اسٹین گن نکال کر بھارتی جہازوں کی طرف گولیاں داغ دیں۔ یہ گولیاں اپنے ٹارگٹ تک تو کیا پہنچتیں بریگیڈیر صاحب کا غصہ نکالنے میں مفید ثابت ہوئیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے میجر سرور کو (جو مادھو پور سے تنگیل پہنچ چکے تھے) حکم دیا کہ جاؤ، جا کر دشمن کی اس چھاتہ بردار فوج کا قلع قمع کر دو ـــ میجر سرور فوراً حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئے ـــ آدھ گھنٹہ بعد وہ واپس آ کر کہنے لگے: "سر، مقامی لوگوں کا خیال ہے یہ چینی سپاہی ہیں جو ہماری امداد کو آئے ہیں۔" اگرچہ یہ خبر ہمارے جذبات

مدوجزر کے علین مطابق تھی، مگر اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہ تھا کیونکہ اگر جلتی چھاتہ بردار فوج آ بھی جاتی تو اسے اترنے سے پہلے ہائی کمانڈر سے پوچھنا پڑتا کہ اترنے کے لیے کونسی جگہ محفوظ ہے، کونسا علاقہ دشمن کے قبضے میں ہے اور کونسا ہمارے پاس ہے؟ ایسا کوئی رابطہ بریگیڈیر قادر سے قائم نہیں کیا گیا تھا؛ لہٰذا انہیں بھی اس کی تصدیق پر شبہہ ہوا اور انہوں نے ابتدائی جھلمل کے بعد سنجیدگی سے اگلے اقدام کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مناسب نفری کے بغیر تنگیل میں بیٹھ کر لڑنا مشکل ہے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کا بریگیڈ اب بریگیڈ نہیں رہا، وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ چکا ہے؛ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ چھاتہ بردار فوج سے اُلجھنے کے بجائے کلیاکیر کی طرف روانہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ڈھاکہ والوں کا حکم بھی تو یہی تھا۔

بریگیڈیر قادر باقاعدہ فوج، سول آرمڈ فورسز، رینجرز اور پولیس کے چھ سو سپاہیوں اور کوئی درجن بھر افسروں پر مشتمل نفری لے کر شام کے پونے چھ بجے تنگیل سے روانہ ہوئے، وہاں اب سرکٹ ہاؤس پر پاکستانی پرچم تنہا رہ گیا تھا۔ ہمارے انخلا کے بعد جب مکتی باہنی والے وہاں پہنچے، تو انہوں نے اسے اُتار کر وہاں بنگلہ دیش کا پرچم بلند کر دیا۔

۹۳ بریگیڈ کے بعض اجزا (مثلاً میجر امی جی شاہ اور ان کی چھوٹی توپیں) ابھی مادھوپور کے پاس ہی تھیں، انہوں نے جب دیکھا کہ ۱۳ بلوچ کا سُراغ نہیں مل رہا، تو وہ بھی جنوب کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے راستے میں کالی ہٹی کے قریب چھاتہ بردار فوج اُترتے دیکھی تو ان میں سے بعض واپس پلٹ گئے اور بعض سڑک چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔

جب بریگیڈیر قادر اور اُن کے ساتھی اس مقام پر پہنچے جہاں لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو بارودی سرنگ پھٹنے کا حادثہ پیش آیا تھا تو اکّا دُکّا فائر کرنے کی آوازیں آئیں۔ غالباً یہ مکتی باہنی کے ارکان تھے، مگر بریگیڈیر قادر انہیں دشمن کی بھاری جمعیت سمجھے۔ انہوں نے بارودی سرنگوں اور مسلح دشمن سے ٹکر لینے کے بجائے سڑک سے کنارہ کشی کر کے کھیتوں کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی ساری نفری کو تین ٹولیوں میں بانٹ کر تین افسروں کے حوالے کر دیا کہ لو بھئی تم جانو اور تمہارا کام، خود آٹھ افسروں اور اٹھارہ سپاہیوں کو لے کر کھیتوں میں چلے گئے۔

بریگیڈیر قادر اور اُن کے ۲۶ ساتھی تین دن اور چار راتیں کھیتوں میں دھکے کھاتے رہے۔ کبھی وہ کسی جھیل کی طرف جا نکلتے اور کبھی دلدل میں جا پھنستے، جہاں جونکیں ان کی ٹانگوں سے چمٹ جاتیں یا جنگلی گھاس کے ریشے اُن کے پاؤں پکڑ لیتے۔ جب یہ پانی اور دلدل سے بچ کر خشکی کی راہ لیتے، تو دیہات میں پھیلی ہوئی مکتی باہنی سے واسطہ پڑ جاتا ـــ اس صبر آزما سفر میں اُن کے پاس زادِ راہ نہیں تھا کہ اُن کا ساتھ دیتا ـــ اگر کسی کی جیب میں چند روپے تھے بھی، تو کوئی بنگالی انہیں قیمتاً بھی خوراک مہیّا کرنے کو تیار نہ تھا۔ اُنہیں اس آزمائش میں صرف ایک خدا ترس آدمی ملا جس نے انہیں اپنے گھڑے سے پانی پینے دیا، ورنہ وہ سبز پتّے کھا کر اور جوہڑوں سے گندہ پانی پی کر گزارا کرتے رہے۔ سفر کے تیسرے دن وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑے سستا رہے تھے کہ ایک افسر درخت کی ایک تازہ ٹہنی توڑ کر لایا اور اسے بریگیڈیر قادر کے حضور پیش کرتے ہوئے کہنے لگا: "سر، اس کے پتّے آہستہ آہستہ چبائیے، اس سے پیاس بُجھتی ہے۔ میں نے ابھی آزما کر دیکھا ہے، لیجیے نا!"

۱۴ دسمبر کو یہ لوگ تنگیل روڈ پر کلیاکیر کے شمال میں جا نکلے۔ گزشتہ تین چار دنوں میں اس سڑک پر دشمن کی باقاعدہ آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اُس کی فوج دھڑا دھڑ ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بریگیڈیر قادر اور اُن کے ساتھیوں نے دشمن کی نقل و حرکت میں خلل ڈالنے کے بجائے سڑک سے ذرا پرے ایک جھنڈ میں پناہ لی اور ایک میجر کو روانہ کیا کہ جا کر دیکھو کہیں اپنے سپاہیوں کا بھی کوئی سُراغ ہے کہ نہیں؟

وہ واپس آیا، تو اُس کے ساتھ سکھوں کی ایک مسلح پارٹی تھی جس نے آکر ان تھکے ہارے مسافت کے ماروں کو حراست میں لے لیا۔ ساری جنگ میں اس لحاظ سے یہ سب سے اہم واقعہ تھا کہ ایک بریگیڈ پر دشمن کے ہاتھ آگیا تھا۔

۹۳ بریگیڈ کے جو بکھرے ہوئے اجزا جنوب کی طرف آرہے تھے، انہیں کوئی خبر نہ تھی کہ کلیا کیر کہاں واقع ہے، انھوں نے اس سے پہلے اس کی ریکی کرنا تو درکنار اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ وہ چلتے چلاتے ۱۴ دسمبر کو ڈھاکہ پہنچ گئے، جہاں میں نے انہیں وارد ہوتے دیکھا۔ بُرا حال تھا بیچاروں کا! حجامت بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوئی، وردی کیچڑ اور خون کے دھبّوں سے اٹی ہوئی، بعض سپاہیوں کے پاس ہتھیار نہ تھے اور بعض کے بُوٹ غائب تھے —— فاقہ زدہ چہرے، بےخواب آنکھیں! اس سے قبل کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں کوئی کردار ادا کرسکتے، انہیں فوری آرام کی ضرورت تھی —— آیئے اب دیکھیں کہ خود ڈھاکہ نے جنگ کے دِن کس طرح گزارے۔

باب ۲۲

جنرل نیازی کی ہچکیاں

ڈھاکہ کی طبیعت پر سب سے زیادہ اثر دو چیزوں کا تھا ــ ایک یہ کہ مشرقی پاکستان کے مختلف سیکٹروں میں جنگ کے رنگ کیا ہیں اور دوسری یہ کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر صورتِ حال کیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا لڑائی کے دوسرے دن جب یہ اُڑتی سی خبر ڈھاکہ پہنچی تھی کہ امرتسر فتح ہو چکا ہے اور فیروز پور چند گھنٹوں کی بات ہے تو جنرل نیازی اپنے زیرِ زمین کمرے میں بیٹھے چہک اُٹھے تھے اور خوشی میں پہلوانوں کی طرح ڈنٹر پیلنے لگے تھے، مگر ۷ دسمبر تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مغربی پاکستان محاذ پر ہماری فوج سرحدی چوکیوں سے گزر کر رُک گئی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ۷ دسمبر تک کئی سیکٹروں میں ہمیں شکست ہو چکی تھی۔ ۹ ڈویژن کے علاقے میں دونوں دفاعی قلعے ــ جیسور اور جھنیدہ ــ دشمن کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ۱۶ ڈویژن میں جی او سی کے بال بال بچ نکلنے کے بعد پتہ چلا تھا کہ ڈویژن کی اہم سپلائی لائن (c of c) رنگ پور / بوگرہ روڈ کٹ چکی ہے۔ ۱۴ ڈویژن میں جنرل قاضی اور ان کے بریگیڈیئر سعد اللہ سرحدی علاقے خالی کر کے دریائے میگھنا کے کنارے پہنچ چکے تھے اور پیچھے جنوب مشرق میں جنرل رحیم کے ڈویژن (۳۹ ہنگامی ڈویژن) کے پیٹ میں فینی اور کومیلا کے درمیان چھرا گھونپا جا چکا تھا۔

اسی شام (۷ دسمبر) جنرل نیازی کو گورنر اے۔ ایم۔ مالک نے گورنر ہاؤس بُلایا تاکہ وہ ان سے جنگ کی اصل صورتِ حال معلوم کر سکیں۔ اس مُلاقات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ گورنر کو متضاد خبریں مل رہی تھیں۔ ایک طرف ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر سے جنم لینے والی خبریں بتا رہی تھیں کہ ہر محاذ پر ہماری فوجیں بہادری سے لڑتے ہُوئے دُشمن کے دانت کھٹے کر رہی ہیں، دوسری طرف مختلف ضلعوں اور سب ڈویژنوں (تحصیلوں) سے سول انتظامیہ کے افسر واویلا کر رہے تھے کہ بھارتی فوجیں بڑھ رہی ہیں، ہمارے دفاعی انتظامات مسمار ہو رہے ہیں، ذاتی املاک اور جانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ خبریں سُن کر جنرل فرمان نے گورنر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جنرل نیازی کو گورنر ہاؤس میں بُلا کر صحیح صورتِ حال معلوم کریں کیونکہ اگر وہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر گئے تو وہاں جنرل نیازی اپنے اسٹاف آفیسروں کے سامنے حقیقتِ حال کا اعتراف کرنے سے ہچکچائیں گے۔

جنرل نیازی ۷ دسمبر کی شام کو گورنر ہاؤس پہنچے تو عجب تذبذب میں تھے۔ ایک طرف ان کا جرنیلی چہرہ تھا جس پر وہ بہادری کا نقاب اوڑھے ہُوئے تھے۔ دوسری طرف اصل جنگی صورتِ حال تھی جو ان کی نالائقی اور ناکامی کا مُنہ بولتا ثبوت تھی۔ کیا وہ ایک سویلین گورنر کے سامنے جنگ کے چوتھے دن ہی اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیں یا حسبِ معمول مزید کچھ عرصے تک اپنا بھرم قائم رکھیں۔ یہ مُلاقات گورنر ہاؤس کے ایک آراستہ اور پُرسکون کمرے میں ہوئی ـــ اس میں گورنر اور جنرل کے علاوہ دو اور سینیئر افسر بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ شروع میں خاموشی طاری رہی۔ سب جنرل نیازی کا مُنہ دیکھتے رہے۔ پھر گورنر مالک نے آہستہ آہستہ گفتگو کا

آغاز کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ زندگی دھوپ چھاؤں ہے کبھی اچھے دن آ جاتے ہیں اور کبھی بُرے جرنیلوں کو بھی کئی نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی فتح کی روشنی سے اُن کا چہرہ دمکنے لگتا ہے اور کبھی شکست کے سایے اُن کی شہرت کو گہنا دیتے ہیں۔ گورنر مالک نے ابھی آخری جملہ کہا ہی تھا کہ جنرل نیازی کا چوڑا چکلا جسم یکایک کپکپانے لگا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگے۔ گورنر نے اپنا بزرگانہ اور مشفقانہ ہاتھ بڑھا کر جنرل نیازی کے کندھے پر رکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا: "جنرل صاحب گھبرائیے مت! ایک کمانڈر کی زندگی میں کٹھن دن آ ہی جاتے ہیں آپ ہمت نہ ہاریں اللہ عظیم ہے۔"

جس وقت جنرل نیازی بلک رہے تھے گورنر ہاؤس کا ایک بنگالی بیرا چائے کا خوان اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے فوراً ایک افسر نے جھاڑ پلا کر واپس کر دیا۔ اس نے باہر آکر اپنے ساتھیوں کو بتایا: "اندر صاحب لوگ رو رہے ہیں۔" یہ بات گورنر کے پنجابی ملٹری سیکرٹری نے سُنی تو اس نے ڈانٹ کر انہیں چُپ کرا دیا۔

یُوں گورنر مالک کو جنگی صورتِ حال کا ایسا اندازہ ہُوا جو مؤثر سے مؤثر الفاظ میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے جنرل نیازی کی اشک شوئی کے بعد کہا: "میرا خیال ہے مجھے اس خراب صورتِ حال سے صدر کو مطلع کر دینا چاہیے تاکہ وہ جنگ بندی کا اہتمام کر سکیں۔" جنرل نیازی کا سر ابھی تک چھاتی کی طرف لٹکا ہُوا تھا۔ انہوں نے سر اُوپر اُٹھائے بغیر ہولے سے کہا: "مَیں تعمیل کر دوں گا۔" چنانچہ گورنر نے صورتِ حال پر مبنی ایک تار صدر یحییٰ خاں کو روانہ کر دیا۔

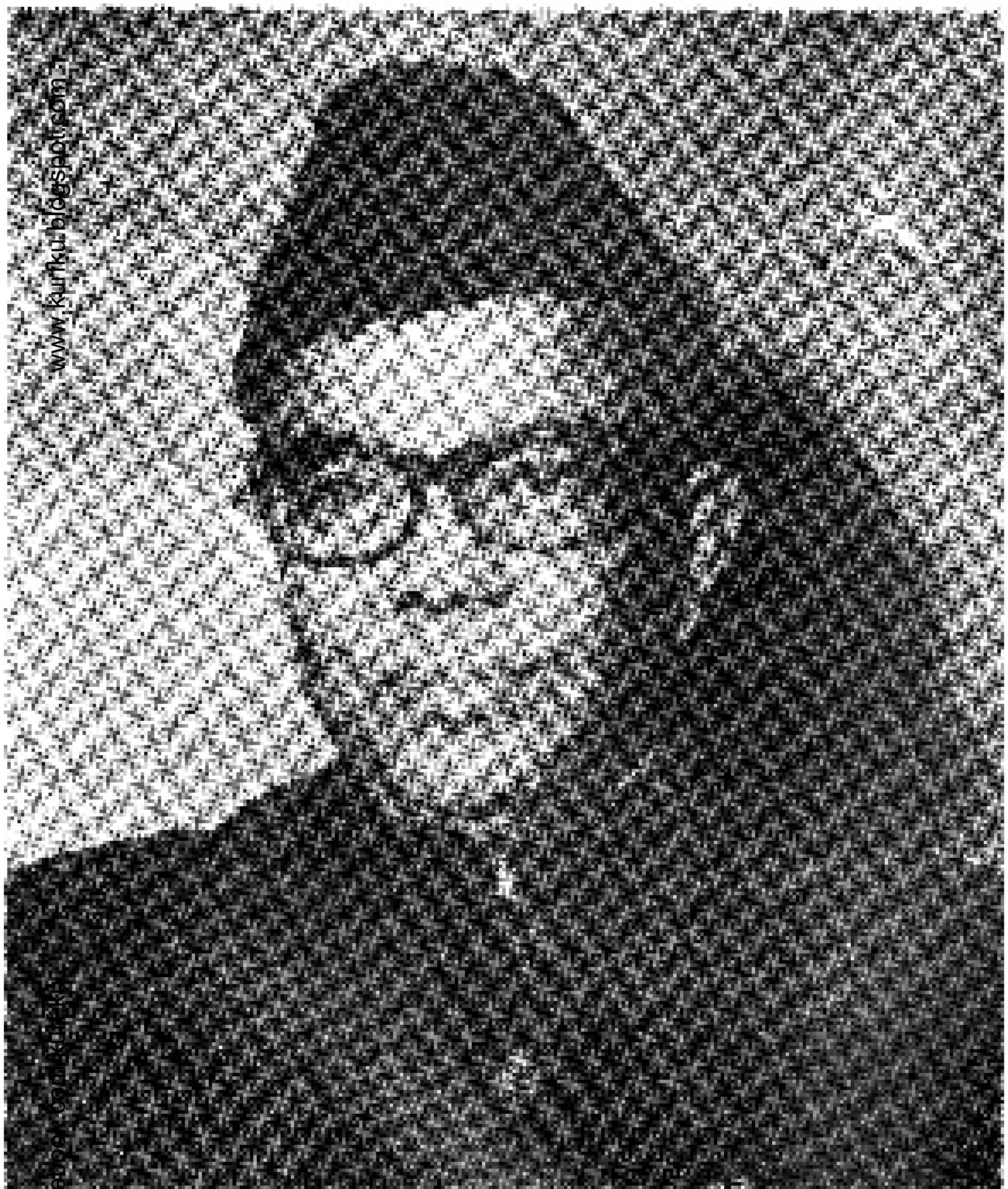
جنرل نیازی واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آئے تو دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں بیٹھ رہے۔ اگلی تین راتیں اور تین دن انہوں نے اسی ذہنی کیفیّت میں گزارے۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ مَیں حسبِ معمول ۸ اور ۹ دسمبر کی رات کو ان کے کمرے میں گیا۔ انہوں نے کہنیاں اپنی میز پر گاڑ رکھی تھیں اور سر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھا ہُوا تھا۔ باہر سے آنے والے کو چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا' اس لیے مَیں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت واقعی رو رہے تھے۔ البتہ ان کی ذہنی کیفیّت کا اندازہ اِس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس موقع پر مجھ سے کہا۔ انہوں نے فرمایا: "سالک! شُکر کرو کہ تم آج جرنیل نہیں ہو۔" اس سے بیشک ان کے گہرے کرب کا احساس ہوتا تھا۔ وہ مجھے بے بس لگے۔ مَیں وہاں سے چلا آیا لیکن ساری رات ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے' مجھے ان پر بہت ترس آیا۔

۷ دسمبر سے ۹ دسمبر تک تین دن جنرل نیازی پر بھاری گزرے۔ اس عرصے میں ان کے تقریباً سبھی ڈویژن اپنی "سالمیت" اور تنظیمی یگانگت کھو بیٹھے تھے۔ بہت سے علاقوں میں ان کی فوجیں ان دفاعی لائنوں سے بہت پیچھے ہٹ چکی تھیں جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ان سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں انگریزی میں LINE OF NO PENETRATION کہا جاتا تھا۔ مزید مایوسی کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان محاذ پر بھی پیش قدمی کے امکانات ختم ہو گئے تھے جہاں غیر معمولی فتوحات حاصل کرنے کی توقع تھی کیونکہ "مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہونا تھا۔"

قدرتی طور پر اس عرصے میں جنرل نیازی کی شوخی اور لطیفہ گوئی ہرن ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے اور عموماً تخلیے کو ترجیح دیتے' لیکن جب بھی نظر آتے بُجھے بُجھے سے لگتے۔ ان کی طبیعت میں شوخی کے بجائے چڑچڑا پن آ چکا تھا۔ ان کی آنکھیں ان کی بے خوابی کی غمازی کرتی تھیں۔ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ان کے چہرے کے سبھی خدوخال میں جھلک رہا تھا۔



میجر جنرل راؤ فرمان علی
گورنر مشرقی پاکستان کے مشیر



ڈاکٹر اے ایم مالک
گورنر، مشرقی پاکستان

اسی اثنا میں آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے غیر ملکی نشری ادارے ہماری پسپائی کی خبریں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔ اس پر مزید المیہ یہ تھا کہ ہمارے بنگالی بھائی ریڈیو پاکستان کے بجائے ان غیر ملکی اداروں کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ انہی دنوں بی بی سی نے اعلان کیا کہ جنرل نیازی اپنی فوج کو چھوڑ کر مغربی پاکستان بھاگ گئے ہیں۔ اس "نشریے" سے جنرل نیازی بہت جز بز ہوئے اور ۱۰ دسمبر کو اچانک ڈھاکہ انٹر کانٹی نینٹل میں جا دھمکے۔ ہوٹل کی لابی میں جو شخص بھی ان کے سامنے آیا انہوں نے جھلّا کر کہا "بی بی سی والا کدھر ہے؟ میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود ہوں اور میں اپنے سپاہیوں کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔" وہ ہوا میں یہ اعلان کر کے ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر آ گئے۔

جنرل نیازی جسمانی طور پر ڈھاکہ میں موجود تو تھے مگر ان کی موجودگی سے جنگی صورتِ حال پر کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑ رہا تھا اور نہ ڈھاکہ میں رہنے والوں (خاص کر غیر ملکی شہریوں) کو اعتماد تھا کہ جب تک جنرل نیازی موجود ہیں اُن کی جانیں محفوظ ہیں۔ پنجابیوں، پٹھانوں اور بہاریوں کے لیے تو کوئی راہِ فرار تھی نہیں وہ بے چارے تو اپنے اپنے گھروں میں دبکے "وقتِ آخر" کا انتظار کرتے رہے لیکن غیر ملکیوں نے اس ڈوبتے جہاز سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں نکالنے کے لیے ۸ دسمبر کو اقوامِ متحدہ نے طیاروں کا بندوبست کیا لیکن ڈھاکہ ایئر پورٹ کا "رن وے" ناقابلِ استعمال ہونے کی وجہ سے وہ نہ جا سکے۔ آئندہ چند روز میں وہ پرواز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بے یقینی اور عدمِ تحفظ کا احساس صرف سویلین آبادی تک محدود نہ تھا، اس کا اثر دفاعی حلقوں میں بھی ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دو فوجی افسر جن کے کندھوں پر آدھا آدھا پاؤ پیتل چمک رہا تھا، یکے بعد دیگرے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تمہیں جنرل نیازی کا قرب حاصل ہے تم اسے کیوں نہیں کہتے کہ حقیقت پسندی سے کام لے ورنہ ہم سب کتوں کی موت مر جائیں گے۔" میں نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کر لی کہ پبلک ریلیشنز آفیسر کا یہ کام نہیں کہ وہ جنگی معاملوں میں کمانڈر کے فیصلوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔

میں نے جنرل نیازی سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی؛ البتہ ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو جب جنرل فرمان علی مجھے ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے باہر مل گئے، تو میں نے تذکرۃً ان افسروں کے احساسات ان تک پہنچائے۔ انہوں نے جواباً کہا "ہاں گورنر بھی اس بارے میں فکر مند ہیں مگر جنرل نیازی کا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ بہرکیف ہم اس سلسلے میں کچھ کریں گے۔" اگلے دن گورنر نے صدرِ پاکستان کو ایک تار دیا جس میں صورتِ حال کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا "میں ایک مرتبہ پھر آپ پر زور دوں گا کہ آپ جنگ بندی اور سیاسی حل پر غور کریں۔" جنرل یحییٰ خاں نے ۷ دسمبر والے تار کی طرح اس تار کو بھی نظر انداز کر دیا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں جنگی صورتِ حال کے مالک و مختار تو جنرل نیازی تھے جو متواتر اپنی اور اپنی سپاہ کی اعلیٰ دفاعی صلاحیتوں کی رپورٹیں بھیج رہے تھے، ڈاکٹر مالک گورنر سہی مگر جنگی حالات کے بارے میں ان کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے؟

ایسٹرن کمانڈ نے پہلی مرتبہ ۹ دسمبر کو صورتِ حال کی نزاکت کا اقرار کیا اور جی ایچ کیو کے نام ایک پیغام (سگنل) میں کہا:

"فضا میں دشمن کی برتری کے باعث بکھری ہوئی فوج کی صف بندی اور تنظیم نو ممکن نہیں۔ مقامی لوگوں کا رویہ انتہائی مخاصمانہ ہے۔ وہ دشمن کو ہر ممکن مدد دے رہے ہیں۔ رات کے وقت مکتی باہنی کی چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے نقل و حرکت مشکل ہے۔ وہ بھارتی فوج کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے ہمارے عقب میں لے آتے ہیں۔ ہوائی اڈہ زبردست نقصان کے باعث ناقابلِ استعمال ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ تین دنوں میں ہمارے جہاز پرواز نہیں کر سکے اور آئندہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

(۲) دشمن کی فضائی کارروائیوں سے ہمارے بھاری ہتھیاروں اور جنگی سامان کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے جوان تاحال بڑی جرأت سے لڑ رہے ہیں مگر ان پر تھکان اور دباؤ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ گزشتہ ۲۰ دن سے سو نہیں سکے کیونکہ دشمن کے جہاز توپیں اور ٹینک مسلسل گولہ باری کر رہے ہیں۔

(۳) صورتِ حال انتہائی نازک ہے مگر ہم اپنی استطاعت کے مطابق لڑتے رہیں گے۔

(۴) آپ سے درخواست ہے کہ اس علاقے میں دشمن کے تمام ٹھکانوں پر فضائی حملوں کا اہتمام کریں اور اگر ممکن ہو تو ڈھاکہ کے دفاع کے لیے جہازوں کے ذریعے کمک روانہ کریں۔

جنرل نیازی کے مذکورہ تار (سگنل) نے گورنر مالک کے اندیشے کی تصدیق کر دی۔ اب جنرل یحییٰ کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ صورتِ حال کو سنبھالا دینے کے لیے ضروری کارروائی کریں، لیکن انہوں نے صرف یہ کیا کہ موقع کی مناسبت سے ضروری اقدامات کرنے کا اختیار گورنر مالک کو سونپ دیا۔ یہ احکام انہوں نے ایک تار کے ذریعے گورنر مالک کو دیے اور اس کی نقل جنرل نیازی کو بھجوا دی۔ اس تار میں کہا گیا:

از : صدرِ پاکستان

برائے : گورنر مشرقی پاکستان

اطلاع : کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

آپ کا پیغام مل گیا اور اس کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے۔ آپ نے جو تجویز مجھے بھیجی ہے میری طرف سے آپ کو اس پر عمل کرنے کی پوری اجازت ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو اقدامات ممکن ہیں وہ میں کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا لیکن دونوں صوبوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں مشرقی پاکستان کے بارے میں فیصلہ آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے، مجھے منظور ہو گا۔ میں جنرل نیازی کو بھی ہدایت کر رہا ہوں کہ وہ آپ کے فیصلے کے مطابق کارروائی کریں۔

اس تار کے بعد ایک اور تار جنرل عبدالحمید کی طرف سے جنرل نیازی کے نام پہنچا۔ انہوں نے مذکورہ صدارتی تار کے حوالے کے بعد جنرل نیازی کو ہدایت کی کہ وہ جنگ سے متعلق صحیح صورتِ حال سے گورنر مالک کو باخبر رکھیں تاکہ وہ درست فیصلہ کر سکیں۔ اسی تار میں جنرل حمید نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سازوسامان بروقت تلف کر دیں تاکہ یہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ جنرل حمید کے تار کا متن یہ تھا:

از : چیف آف اسٹاف آرمی

برائے : کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

بحوالہ : صدارتی تار بنام گورنر جس کی نقل آپ کو دی گئی ہے۔

صدر نے مشرقی پاکستان کے متعلق فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا ہے جو اس بارے میں آپ سے مشورہ کریں گے کیونکہ کوئی بھی تار صحیح صورتِ حال کی پوری پوری عکاسی نہیں کر سکتا، اس لیے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں آپ پر یہ بات چھوڑ دوں کہ آپ موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے کوئی درست فیصلہ کر لیں، البتہ ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ دشمن جس کو سازوسامان کی برتری اور مکتی باہنی کی حمایت حاصل ہے جلد ہی مکمل طور پر مشرقی پاکستان پر حاوی ہو جائے گا۔ درمیانی

عرصے میں بھی شہری آبادی اور فوج کا بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ ان حالات میں آپ کو دیکھنا ہوگا کہ آپ کب تک جنگ جاری رکھ سکتے ہیں اور کس قیمت پر؟ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرکے آپ گورنر کو اپنا عندیہ بتادیں تاکہ وہ صدر کی طرف سے سونپے گئے اختیار کے مطابق کوئی فیصلہ کرسکیں ـــ اور اگر آپ انتہائی اقدام پر مجبور ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ جنگی سازو سامان تلف کردیں تاکہ یہ دشمن کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ مجھے باخبر رکھیے گا ـــ خدا حافظ!

اگرچہ فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا گیا تھا، مگر مسئلے کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا تھا جسے وہ منتخب کرلیتے، کیونکہ اگر جنرل نیازی جنگ جاری رکھ سکتے، تو مذکورہ تاروں کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ بھی چھوڑ بیٹھے تھے تو گورنر ان کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتے تھے، لہٰذا گورنر مالک نے ایک ایسا سیاسی تصفیہ تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے مطابق مشرقی پاکستان میں اقتدار اس کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرکے بھارتی اور پاکستانی فوجوں کے انخلا کا انتظام کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈھاکہ میں موجود اقوامِ متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر پال مارک ہنری سے رابطہ قائم کیا اور جنرل فرمان علی اور چیف سیکرٹری مظفر حسن کی موجودگی میں ایک مراسلہ اس کے سپرد کردیا، اس کی اطلاع صدر یحییٰ خاں کو بھی کردی۔ صدر یحییٰ کے نام گورنر کے تاریخی تار کا متن یہ تھا:

از: گورنر

برائے: صدرِ پاکستان

چونکہ آخری فیصلے کی ذمہ داری آپ نے مجھ پر ڈال دی تھی، اس لیے میں آپ کی اجازت سے حسبِ ذیل دستاویز اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر پال مارک ہنری کے حوالے کر رہا ہوں (۱) پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں جنگ چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ انہیں مجبوراً دفاعی اقدامات کرنے پڑے۔ حکومتِ پاکستان درحقیقت شروع سے ہی مشرقی پاکستان کے مسئلے کو سیاسی طریقے سے حل کرنا چاہتی تھی جس کے لیے مذاکرات جاری تھے۔ (۲) مسلح افواج بیشک کٹھن حالات سے دوچار ہیں، مگر وہ اب بھی پوری دلیری سے جنگ جاری رکھ سکتی ہیں، مگر مزید خون خرابے اور بے جا جانی نقصان کو روکنے کے لیے میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں تاکہ موجودہ کشمکش کو سیاسی طریقے سے ختم کیا جاسکے۔ (الف) میں صدرِ پاکستان کی طرف سے دیے گئے اختیار کے تحت مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو ڈھاکہ میں پُرامن طریقے سے حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ (ب) میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی عزتِ نفس اس بات کا تقاضا کرے گی کہ بھارتی افواج بھی ان کی سرزمین سے نکل جائیں (ج) لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پُرامن انتقالِ اقتدار کے لیے پانچ چیزوں کا اہتمام کریں (اوّل) فوری جنگ بندی (دوئم) پاکستانی افواج کی آبرومندانہ مغربی پاکستان کو واپسی (سوئم) ان غیر بنگالیوں کا پُرامن انخلا جو مغربی پاکستان جانا چاہتے ہیں (چہارم) ان تمام لوگوں کا تحفظ جو ۱۹۴۷ء سے مشرقی پاکستان میں مقیم ہیں (پنجم) اس بات کی ضمانت کہ مشرقی پاکستان کے کسی فرد کے خلاف (فوج سے تعاون کے جرم میں) انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ پیشکش کرتے وقت میں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ان تجاویز کا مقصد صرف پُرامن طور پر اقتدار کی منتقلی ہے، مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ تجاویز ناقابلِ قبول ہونے کی صورت میں ہماری افواج آخری سپاہی تک لڑتی رہیں گی (مراسلہ ختم ہوا)۔ (۳) جنرل نیازی سے مشورہ کرلیا گیا ہے اور وہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔

مذکورہ بالا مراسلہ اقوامِ متحدہ کو پہنچتے ہی افشا ہوگیا۔ کئی غیر ملکی نشری اداروں نے اس کی موٹی موٹی باتیں نشر کردیں۔ اقوامِ متحدہ میں اُس وقت پاکستان کی نمائندگی نامزد نائب وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض اطلاعات کے مطابق نیویارک سے راولپنڈی پیغام بھیجا کہ مذکورہ مراسلے سے ان کی پوزیشن کمزور ہوگئی ہے ورنہ وہ چین اور امریکہ کو مدد کرنے پر آمادہ کر رہے تھے، چنانچہ ۱۳ر دسمبر کو راولپنڈی میں حکومتِ پاکستان کے ایک ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں جنگ بندی کی تجویز کی تردید کردی۔ ترجمان نے زور دے کر کہا: "میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص ایسی کوئی دستاویز یا بیان مجھے دکھائے جس میں ہتھیار ڈالنے کا ہلکا سا اشارہ بھی کیا گیا ہو[1]" اس تردید سے ڈھاکہ کو بھی مُطلع کیا گیا بلکہ تنبیہہ کی گئی کہ آپ کو جو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اُسے استعمال کرتے وقت متحدہ پاکستان کی سالمیت کا تو خیال رکھئے، آپ تو تجاویز دیتے ہُوئے حدود سے آگے نکل گئے۔

عام طور پر اقوامِ متحدہ کو دیے گئے مذکورہ مراسلے کی ذمہ داری جنرل فرمان علی پر ڈال جاتی ہے۔ مَیں نے ان سے پُوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تار میرا نہیں گورنر مالک کا تھا اور ان تجاویز کا مقصد پاکستان کی سالمیت کو زک پہنچانا نہیں صرف جنگ بندی کے بہانے وقت حاصل کرنا تھا تاکہ ہمارے کمانڈروں کو ازسرِ نو صف بندی کی مہلت مل جائے۔ اگر ہندوستان ہمارے اس اقدام کو جنگ بندی کی خلاف ورزی سمجھتا اور دوبارہ جنگ شروع کر دیتا تو ہم اِس وقفے میں اس کے لیے تیار ہو چکے ہوتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک اقتدار مشرقی پاکستان کے نمائندوں کے حوالے کرنے کا تعلق ہے ہمارے پیشِ نظر وہ نمائندے تھے جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں منتخب ہُوئے تھے اور وہ ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔

ان تجاویز کی غرض و غایت سے قطع نظر یہ امر واقعہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کے ترجمان کی طرف سے ان کی پُرزور تردید کے بعد جنگ بندی کا چرچا ختم ہوگیا ــــ کم از کم وقتی طور پر۔ غالباً یحییٰ خاں اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ مزید مہلت ملنے سے بھٹو کوئی سفارتی معرکہ انجام دے لیں گے۔

مزید مہلت کا مطلب یہ تھا کہ کسی طرح جنرل نیازی بھی اڑے رہیں اور قبل از وقت ہمت نہ ہار بیٹھیں، چنانچہ ان کے مورال کو سہارا دینے کے لیے راولپنڈی نے یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ ڈھاکہ کو غیر سرکاری طور پر یہ اطلاع دی کہ بین الاقوامی سطح پر وسیع پیمانے پر عملی امداد حاصل کی جا رہی ہے۔ "ہمارے زرد دوست" شمال سے اور "سفید دوست" جنوب سے مداخلت کرنے والے ہیں۔ "زرد دوستوں" سے مُراد چینی تھے جن کی سرحد شمالی جانب قریب تھی اور "سفید دوستوں" سے اشارہ امریکہ کی طرف تھا جس کا بحری بیڑہ بحرِ ہند کے مشرقی کنارے پر تھا۔ اس "خوشخبری" کو مشرقی پاکستان کے مختلف سیکٹروں میں پھیلایا گیا تاکہ ہمارے ڈگمگاتے ہُوئے سپاہی سنبھل جائیں۔ بریگیڈیئر قادر کا ۹۳ بریگیڈ جب میمن سنگھ سے پسپا ہو کر ڈھاکہ کی طرف آ رہا تھا تو اسے بھی تنگیل کے قریب بھارتی چھاتہ برداروں کو دیکھ کر یہی خیال ہُوا تھا کہ شاید واقعی ہمارے دوست ہماری مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ انہی دنوں مَیں نے ایسٹرن کمانڈ کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کے باہر ایک سپاہی کو دو بینڈ کے سستے سے ٹرانسسٹر سے کان لگائے دیکھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہُوئی اور ٹوپی پچکی ہُوئی تھی۔ مَیں نے یونہی اس سے پوچھا: "بھئی کیا خبریں ہیں؟"

وہ یاس میں ڈُوبے لہجے میں بولا: "سر! چینی یا امریکی امداد کی کوئی خبر نہیں۔"

---

[1] پاکستان ٹائمز، راولپنڈی۔ مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء

راولپنڈی کی طرف سے دی گئی اس طفل تسلی کا وقتی طور پر یہ اثر ہوا کہ کیا افسر اور کیا جوان سب کی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھنے لگیں کہ کبھی مدد کی طرف نگاہ رکھتے کہ دیکھیے کب مدد پہنچتی ہے۔ مگر کوئی نہ پہنچا۔ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر بھی اس مدد کے لیے بے چین تھا۔ اس نے راولپنڈی کو کئی ٹیلیفون کھڑکائے کہ بتاؤ تو سہی کب زرد اور سفید دوست آ رہے ہیں۔ وہاں سے صرف یہی جواب ملا کہ "جلد" ۔۔۔ جب مزید ۴۸ گھنٹے گزر گئے اور دوستوں کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو ایک بار پھر راولپنڈی فون کیا گیا کہ بتاؤ بھی کہ وہ کب آ رہے ہیں؟ جواب ملا "بس جلد ہی"۔ اس پر پاس کھڑے ایک افسر نے جل کر کہا "ان سے پوچھو کہ ان کا "جلد" کتنی جلدی آنے والا ہے"۔

اس "خوشخبری" کی تصدیق کے لیے ڈھاکہ میں مقیم چین اور امریکہ کے نمائندوں کو الگ الگ بلا کر پوچھا گیا کہ تم ہی بتاؤ کب مدد پہنچنے والی ہے۔ دونوں نے کسی ایسی کارروائی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ جھنجھلا کر بریگیڈیئر باقر صدیقی نے ایک بار پھر راولپنڈی فون کیا اور پوچھا "ہمیں صاف صاف بتا دو کہ ہم کب تک دوستوں کا انتظار کرتے رہیں؟" جواب ملا: "بس صرف ۳۶ گھنٹے اور" ۔۔۔ یعنی ۱۲ دسمبر کی شام تک۔

اس عرصے میں جنگ کی صورت حال اور خراب ہو گئی تھی۔ ۹ ڈویژن میں ۱۰۷ بریگیڈ کھلنا کے قریب پہنچ چکا تھا اور ۵۷ بریگیڈ ہارڈنگ برج کے ذریعے دریائے گنگا پار کر کے ۱۶ ڈویژن کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں بریگیڈیئر انصاری والا بریگیڈ اوپر اور بریگیڈیئر تجمل والا بریگیڈ نیچے رہ گیا تھا۔ دشمن رنگ پور بوگرہ روڈ پر آتے ہوئے بوگرہ کے شمال میں آ چکا تھا۔ مشرقی سرحد پر ۱۴ ڈویژن دریائے میگھنا عبور کر کے بھراب بازار میں "قلعہ بند" ہو چکا تھا۔ نیچے ۳۹ ہنگامی ڈویژن (میجر جنرل رحیم) چاند پور سے ڈھاکہ آتے ہوئے تلپٹ ہو چکا تھا اور میجر جنرل جمشید کا ہنگامی ڈویژن (۳۶) جمال پور اور میمن سنگھ سے واپس آتا ہوا تتر بتر ہو چکا تھا۔ جہاں جہاں دشمن ہماری دفاعی لائن میں شگاف کر چکا تھا وہاں سے اس کے فوجی دستے اندر داخل ہو رہے تھے۔

اگر دشمن کی آمد کے غوغا سے ہٹ کر اصلی جنگی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دشمن ابھی تک ڈھاکہ کے گرد تین بڑے دریاؤں (جمنا، میگھنا اور برہم پتر) کو پار نہیں کر پایا تھا۔ صرف ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اس کی ایک کمپنی بھراب بازار کے جنوب میں (رائے پور اور نرسنگدی) اتری تھی اور ایک چھاتہ بردار پلٹن ہوائی جہازوں کی مدد سے ٹنگیل کے پاس وارد ہوئی تھی۔ اس کی باقی ساری فوج، ٹینک اور توپیں ابھی پیچھے تھیں۔ جو نفری دریاؤں کے اس پار اتر چکی تھی وہ ڈھاکہ کو فتح کرنے کے لیے سراسر ناکافی تھی۔ ڈھاکہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دشمن کو ابھی اپنے ڈویژن اور بھاری ہتھیار (ٹینک اور توپیں وغیرہ) آگے لانا تھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ دریاؤں پر عارضی پل نہ باندھ لیتا ۔۔۔ اور اگر آپ مشرقی پاکستان کے ان مہیب دریاؤں کا خیال کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان پر پل باندھنا آسان کام نہ تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دشمن کو موجودہ گھاٹوں یا نئے پلوں کے ذریعے دریا پار کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور لگتا ۔۔۔ اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں ڈھاکہ پر دستک دیتا۔ پھر ڈھاکہ پر منحصر تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کتنی مضبوط ہے۔ جہاں تک راشن اور ایمونیشن کا تعلق ہے اس کی کوئی کمی نہ تھی۔ کم از کم ایک ماہ تک لڑائی بآسانی لڑی جا سکتی تھی۔

اس کے باوجود ایسٹرن کمانڈ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی کپکپی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے پاس ڈھاکہ کے دفاع کے لیے پکی فوج (ریگولر آرمی) کی ایک پلٹن بھی موجود نہ تھی۔ اس کام کے لیے جو ۵۳ بریگیڈ رکھا گیا تھا وہ وسط نومبر میں فینی منتقل کر کے میجر جنرل رحیم کے سپرد کیا جا چکا تھا ۔۔۔ اب جنرل نیازی کو لالے پڑے تو ان کے چیف آف اسٹاف بریگیڈیئر باقر صدیقی نے مختلف سیکٹر کمانڈروں سے کہنا شروع کیا کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں ہاتھ بٹائیں۔ انہوں نے کومیلا میں بریگیڈیئر عاطف سے کہا وہ ڈھاکہ کے مشرقی جانب دریائے میگھنا کے مغربی کنارے پر آ کر پوزیشن سنبھال لیں۔ عاطف نے اپنے "دفاعی قلعے" میں پڑے رہنا زیادہ مفید سمجھا جسے انہوں نے بڑی محنت سے

تیار کیا گیا تھا۔ پھر ۱۴ ڈویژن کے جی او سی (میجر جنرل قاضی) سے کہا گیا کہ وہ بھیراب بازار کو چھوڑیں اور ڈھاکہ واپس آجائیں مگر انہوں نے "کشتیوں کی کمی" کے باعث تعمیلِ ارشاد سے معذرت کرلی۔ میجر جنرل نذر حسین شاہ سے درخواست کی گئی کہ ۹ ڈویژن کا ۵۷ بریگیڈ (بریگیڈیئر منظور) جو ان کے علاقے میں پہنچ چکا ہے اسے ڈھاکہ روانہ کردیں۔ انہوں نے بریگیڈ کے بجائے اس کی ایک بٹالین روانہ کردی، مگر وہ دریائے جمنا پار نہ کرسکی۔

بے بسی کے اس عالم میں میجر جنرل جمشید کو مجبور کیا گیا کہ وہ بریگیڈیئر قادر والے بریگیڈ (۹۳) کو میمن سنگھ اور جمال پور سے واپس بلا کر ڈھاکہ کے شمال میں کلیا کیر کے قریب لگادیں تاکہ ڈھاکہ کا ایک پہلو تو محفوظ ہے۔ بریگیڈیئر قادر نے بھی ان احکامات کو منسوخ کرانے کے لیے کئی بار جنرل جمشید سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اس پسپائی میں ہی اس بریگیڈ کا شیرازہ بکھر گیا جس کا احوال پچھلے باب میں آچکا ہے۔

اگرچہ جنگ کے تیور روز بروز بدل رہے تھے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مگر جنرل نیازی اب بھی اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ واقعی شمال سے "زرد دوست" اور جنوب سے "سفید دوست" مدد کو پہنچنے والے ہیں۔ وہ امید کی اسی لَو میں ۱۱ دسمبر کو سی ایم ایچ ڈھاکہ گئے جہاں ان کے سامنے نصف درجن نرسیں پیش کی گئیں جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے جنرل صاحب سے درخواست کی کہ ہمیں مکتی باہنی کے درندوں سے بچانے کی تدبیر کی جائے کیونکہ گزشتہ مارچ اپریل میں جو عورتیں اُن کے ہتھے چڑھ گئی تھیں اُن سے عبرتناک سلوک کیا گیا تھا۔ جنرل نیازی نے انہیں تسلی دی "گھبراؤ نہیں کمک آنے والی ہے کل شام تک انتظار کرو۔ اگر حالات خراب ہوگئے اور صورتِ حال بے قابو ہونے لگی تو ہم آپ کو مکتی باہنی کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے خود ہلاک کردیں گے۔"

ہسپتال سے نکل کر وہ ہوائی اڈے پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ہماری طیارہ شکن توپوں کی پوزیشنوں کا معاینہ کیا اور جوانوں کو ہر وقت چوکنا رہنے کی ہدایت کی۔ وہ واپس چھاؤنی آنے لگے تو ہوائی اڈے کے باہر انہیں غیر ملکی مردوں اور عورتوں کا ایک غول نظر آیا۔ انہوں نے اسے اپنے "فرار" کی افواہوں کی تردید کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ وہ جھٹ جیپ سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس غول میں بہت سے اخبار نویس بھی تھے جنہوں نے انہیں گھیر لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ چند سوال و جواب یہ تھے:

سوال: بھارت کا دعویٰ ہے کہ اس کی فوج ڈھاکہ کے دروازے پر پہنچ چکی ہے آپ بتائیے کہ وہ کتنی دور ہے؟

جواب: خود ہی جا کر دیکھ لو۔

سوال: آپ کے عزائم کیا ہیں؟

جواب: میں آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑوں گا۔

سوال: کیا بھارتی فوج کو ڈھاکہ سے دور رکھنے کے لیے آپ کے پاس کافی تعداد میں فوج موجود ہے؟

جواب: ڈھاکہ پہنچنے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ انہیں پہلے یہاں سے (اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے) اپنے ٹینک گزارنے ہوں گے۔

سوالات کی بوچھاڑ جاری تھی اور جنرل نیازی جھلاہٹ میں کسی کا جواب دیتے اور کسی کو ٹال دیتے۔ پھر یکایک وہ اس بوچھاڑ سے نکل کر واپس اپنے زیرِ زمین ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔

۱۰ دسمبر سے ۱۳ دسمبر تک کا درمیانی عرصہ جنرل نیازی کے لیے "پُرامید وقفے" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس عرصے میں وہ مضطرب تو تھے مگر بالکل ہی شکستہ نہ تھے (جو ۶ دسمبر سے ۹ دسمبر تک حالت تھی)۔ اگرچہ اب بھی ان کی شگفتہ مزاجی مفقود تھی، مگر ان کی سسکیاں اور آہ وزاری تھم چکی تھی۔ وہ اپنے اندرونی خلفشار کو اپنے چہرے پر منعکس ہونے سے روکنے میں کافی حد تک کامیاب لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیرونی امداد کی "طفل تسلی" نے انہیں عارضی طور پر سہارا دے دیا تھا۔

طبیعت کے اس اتار چڑھاؤ سے قطع نظر جنگ اپنے انداز پر حسبِ معمول جاری رہی۔ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر اب یُوں معلوم ہوتا تھا کہ صرف ڈھاکہ کی جنگ باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جنرل نیازی نے جنرل جمشید کو ذمہ داری سونپ دی۔ "آپریشن رُوم" کی مغربی دیوار پر جہاں جنگ کے آغاز میں مغربی پاکستان کا جنگی نقشہ لٹکا ہُوا تھا، وہاں اب ڈھاکہ شہر اور چھاؤنی کا نقشہ لگا دیا گیا۔ جنرل جمشید ڈھاکہ کے دفاع کے لیے اسی "آپریشن رُوم" میں کانفرنس منعقد کرنے لگے جہاں ۳ دسمبر کو بھرپور جنگ چھڑنے پر جنرل نیازی نے ریشمی اسکارف پہن کر چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کیا تھا۔

میجر جنرل جمشید کے نائب بریگیڈیئر بشیر تھے۔ وہ ان فیصلوں کے مطابق نقشے پر ڈھاکہ کے اردگرد گول گول دائرے لگاتے جاتے تھے جو مجوزہ دفاعی مورچوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ سُرخ پنسل سے لگائے گئے یہ دائرے یُوں لگتے تھے جیسے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہیں اور جونہی انہیں کسی نے چھیڑا یہ فوراً اسے ڈس لیں گے۔

اس کاغذی کارروائی کے مطابق ڈھاکہ کی دو دفاعی لائنیں تھیں۔ بیرونی دفاعی لائن شمال مغرب میں مانک گنج، شمال میں کلیاکیر، شمال مشرق میں نرائن گنج اور مشرق میں منشی گنج پر محیط تھی۔ توقع یہ تھی کہ میمن سنگھ سے ۹۳ بریگیڈ، بھراب بازار سے ۲۷ بریگیڈ، کومیلا سے ۱۱۷ بریگیڈ اور چاندپور سے ۳۹ ہنگامی ڈویژن پسپا ہو کر علی الترتیب کلیاکیر، نرسنگدی، داؤد کنڈی اور منشی گنج میں آجائیں گے۔

اندرونی دفاعی لائن میرپور کے پُل، ٹونگی، ڈیمرا اور نرائن گنج کے ساتھ ساتھ قائم کی گئی تھی۔ خیال تھا کہ اگر دشمن بیرونی دفاعی لائن توڑ کر اندر آگیا، تو اس دفاعی لائن پر مغرب میں کرنل فضل حمید (کھلنا فیم)، شمال میں بریگیڈیئر قاسم اور مشرق میں بریگیڈیئر منصور اسے روک لیں گے۔ خود ڈھاکہ شہر کی نگرانی بریگیڈیئر بشیر کے سپرد تھی۔

دفاعی لائنیں تو قائم کر دی گئیں، مگر ان کی حفاظت کے لیے سپاہی کہاں سے آئیں گے؟ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے ڈھاکہ کے دفاع کے لیے باقاعدہ ایک پلٹن بھی نہیں تھی؛ لہٰذا ایک کانفرنس بُلائی گئی تاکہ تمام افسر اپنی عسکری اور نیم عسکری نفری کی نشاندہی کریں کہ وہ کتنی ہے اور اس کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ اس کانفرنس میں باقاعدہ فوج کے زیادہ تر خدمت گار شعبے آرڈی ننس، سگنل، سپلائی، انجینئرز اور ای ایم ای وغیرہ نے شرکت کی اور اس کی کُل ۱۲ کمپنیوں کے برابر نفری (تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد) کی نشاندہی کی گئی۔ اس طرح سول آرمڈ فورسز کے ۱۵۰۰ سپاہی، پولیس کے ۱۸۰۰ سپاہی اور "البدر" کے ۸۰۰ رضاکار دستیاب ہوئے۔ یُوں کُل نفری پانچ ساڑھے پانچ ہزار بن گئی۔

ان میں سے اکثر کے پاس تھری ناٹ تھری کی پُرانی رائفلیں تھیں۔ ان کی دفاعی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے اِدھر اُدھر سے مزید ہتھیاروں کا کھوج لگایا گیا جس کے نتیجے میں ۳ انچ دہانے کی تین مارٹریں، چار ٹینک شکن توپیں (آر۔ آر) چھ پونڈ وزنی گولہ پھینکنے والی دو توپیں اور چار ہلکی مشین گنیں مل گئیں۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں استعمال ہونے والے ٹینک اس کے علاوہ تھے۔

اس نفری کو مذکورہ ہتھیاروں سمیت ڈھاکہ کے اردگرد متعین کر دیا گیا۔ اس میں اچھی نفری اور "بھاری ہتھیار" شمال جانب رکھے گئے

کیونکہ چھاتہ بردار بھارتی فوج کی خ[illegible]یں خطرہ تھا کہ سب سے پہلے یہی دستے ڈھاکہ پر حملہ آور ہوں گے۔

کاغذ پر یہ دفاعی انتظامات معقول لگتے تھے، مگر عملاً زمین پر حالت بالکل مختلف تھی۔ سپاہیوں کے حوصلے پست تھے اور ہتھیار زیادہ تر فرسودہ اور بیکار ـــــ کسی کی نال خراب تھی اور کسی کا نشانہ باندھنے والا حصہ غائب تھا، کہیں ہتھیار پہنچے تھے مگر ایمونیشن غائب تھا اور کہیں ایمونیشن تھا لیکن [illegible]ر نہ تھے۔ ہنگامی طور پر اکٹھی کی گئی یہ نفری اور اس پر مبنی دفاعی انتظامات خاصے کمزور لگتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بُت ایک ہی ٹھوکر لگنے سے منہدم ہو جائیں گے۔

میں نے اس "حقیقت پسندی" کا اظہار کیا تو بریگیڈیئر قاسم جو چھاؤنی کی شمالی سرحد کے نگہبان تھے، مجھے اپنے "سیکٹر" کے دفاعی انتظامات دکھانے لے گئے۔ وہ جیپ چلا رہے تھے اور میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ راستے میں وہ ایک جگہ رُکے اور جیپ پر بیٹھے بیٹھے کٹی ہوئی سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہاں ہماری بارودی سرنگیں ہیں۔ تھوڑی دُور آگے جا کر وہ ایک نشیب کے کنارے کھڑے ہو گئے اور انگلی کے اشارے سے فرمانے لگے کہ وہاں ہماری ٹینک شکن توپیں ہیں ـــــ اور ان سے اور آگے ہمارے ٹینک ہیں۔ ایک جگہ ہم جیپ سے اُتر کر "گن پوزیشن" دیکھنے گئے تو وہاں ایک ٹینک شکن توپ دھری تھی، مگر اس کے قریب کوئی آدمی نہ تھا۔ آواز دینے پر ایک سپاہی نمودار ہُوا۔ اس نے بتایا کہ اس توپ کا ایمونیشن غلط آ گیا تھا، کپتان صاحب صحیح قسم کا ایمونیشن لینے ڈھاکہ گئے ہیں۔ یہ ۱۳ دسمبر کا واقعہ ہے۔ دورے کے آخر میں ہم ٹونگی سے ذرا اِدھر کرمیٹولا ایئرپورٹ کے قریب رُکے جہاں بریگیڈیئر قاسم نے ایک میجر سے پوچھا:

"کہو، تم کیسے محسوس کرتے ہو؟"

"میں تو ٹھیک محسوس کر رہا ہوں، مگر جوان سمجھتے ہیں کہ ایک مارٹر اور دو مشین گنوں سے وہ دُشمن کی یلغار نہیں روک سکیں گے۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو، انہیں حوصلہ دلاؤ۔ انہیں بتاؤ کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں جیتی جاتیں۔"

میجر خاموش رہا۔

ادھر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں خیال آرائی ہونے لگی کہ ڈھاکہ شہر کے گلی کوچوں میں کس طرح لڑائی لڑی جائے۔ ایک صاحب نے کہا: "ہمیں ڈھاکہ کو سٹالن گراڈ بنا دینا چاہیے۔" دوسرے بولے: "پاگل ہو گئے ہو؟ سٹالن گراڈ اور ڈھاکہ کا کیا مقابلہ؟ یہاں مقامی آبادی ہمارے خلاف ہے۔ ایک طرف بھارت ہماری سرزنش کرے گا اور دوسری طرف مکتی باہنی ہمارا تعاقب کرے گی۔ ہم آوارہ کتوں کی طرح پھڑک پھڑک کر تباہ ہو جائیں گے۔"

گلی گلی لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

باب ۲۳

....اور ڈھاکہ ڈوب گیا

میجر جنرل رحیم جو چاند پور سے آتے ہوئے نرائن گنج کے پاس زخمی ہو گئے تھے، سی ایم ایچ ڈھاکہ میں ابتدائی علاج کے بعد جنرل فرمان کے گھر آرام فرما رہے تھے۔ اس روز دسمبر کی ۱۲ تاریخ تھی۔ بھرپور جنگ شروع ہوئے نو دن ہو گئے تھے۔ جنرل فرمان اگرچہ جنرل رحیم کی خبر گیری کرنے ان کے کمرے میں گئے تھے، مگر حالات کے پیش نظر موضوع لامحالہ جنگ کی طرف منتقل ہو گیا۔ جنرل رحیم نے حتمی طور پر کہا کہ اب جنگ بندی کے بغیر چارہ نہیں۔ جنرل فرمان ان کے منہ سے یہ کلمات سن کر حیران ہوئے، کیونکہ جنرل رحیم ہمیشہ بھارت سے طویل جنگ کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کو مزہ چکھا کر رہیں گے۔ جنرل فرمان نے کہا "بس ڈانے تک گئے ـــ اتنی جلدی!" رحیم نے اپنی رائے پھر دہرائی اور کہا اس بارے میں بلا تاخیر قدم اٹھانا چاہیے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جنرل نیازی اور جنرل جمشید اس زخمی جرنیل کی عیادت کے لیے تشریف لے آئے۔ جنرل رحیم نے جنرل نیازی سے بھی کہا کہ جنگ بندی کے لیے تاخیر ہو رہی ہے، مگر جنرل نیازی خاموش رہے (اس وقت تک ابھی بیرونی امداد کا شوشہ ختم نہیں ہوا تھا) جنرل فرمان انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جنرل نیازی، جنرل فرمان کے پاس آئے اور کہنے لگے، "تو پھر راولپنڈی تار بھیج دو نا!" اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل نیازی نے حسب معمول جنرل رحیم کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ جنگ بندی والی تجویز صدر پاکستان کو گورنر ہاؤس سے بھیجی جائے، جبکہ جنرل فرمان کا خیال تھا کہ اس موضوع پر سگنل ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے جانا چاہیے۔ جنرل نیازی نے اصرار کرتے ہوئے کہا: "راؤ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ سگنل یہاں سے جائے یا وہاں سے، میں دراصل ایک ضروری کام کے لیے کہیں جا رہا ہوں، سگنل تم یہیں سے بھجوا دینا۔" اس سے پیشتر کہ جنرل فرمان ہاں یا نہ کرتے، چیف سیکرٹری مظفر حسن تشریف لے آئے۔ انہوں نے جنرل نیازی کا جملہ سنتے ہی کہا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! سگنل یہیں (گورنر ہاؤس) سے جا سکتا ہے۔" یوں یہ معاملہ رفع ہو گیا۔

جنرل فرمان جنگ بندی کی تجویز کی مخالفت نہیں کر رہے تھے۔ دراصل ان کا بنیادی اختلاف اس بات پر تھا کہ اس کا محرک کون بنے۔ وہ خود اس سلسلے میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے پہلے سگنل پر راولپنڈی میں ناخوشگوار ردِ عمل ہوا تھا۔

جنرل نیازی "ضروری کام" کا بہانہ کر کے چلے گئے اور جنگ بندی سے متعلق تاریخی تار کا ڈرافٹ چیف سیکرٹری مظفر حسن نے تیار کیا۔ جنرل فرمان یہ مسودہ لے کر گورنر کے پاس گئے، جنہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ اسی شام (۱۲ دسمبر) یہ تار یحییٰ خاں کو روانہ کر دیا گیا۔ اس تار میں انسانی جانوں کا بیجا ضیاع روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی درخواست کی گئی۔

گورنر اور ان کے رفقا اس تار کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ اگلی رات اور اگلا دن گزر گیا، لیکن راولپنڈی سے کوئی نامہ و پیام

نہ آیا۔ شاید صدرِ پاکستان اپنی گوناگوں مصروفیات سے اس کاغذ کے پُرزے کے لیے وقت نہ نکال سکے، حتیٰ کہ ۱۴ دسمبر آگیا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس منعقد ہورہی تھی۔ سوا گیارہ بجے کے قریب اچانک بھارت کے مِگ ۲۱ طیارے گورنر ہاؤس پر نمودار ہوئے اور گولہ باری کر کے گزر گئے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے "مرکزی ایوان" کی چھت اُڑ گئی۔ بجری اور اینٹوں کا ملبہ نیچے آرہا۔ ہال میں پڑا ہوا شیشے کا ایک ڈبہ (CASE) چُور چُور ہوگیا اور اس میں تیرنے والی سُرخ رنگ کی زیبائشی مچھلیاں گرم گرم ملبے پر تڑپنے لگیں۔ گورنر مالک لپک کر پناہ گاہ کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے جلدی جلدی اپنا استعفیٰ لکھا اور جیب میں ڈال لیا۔

گورنر، ان کی کابینہ کے وزرا اور اعلیٰ سرکاری ملازمین (جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے) ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل منتقل ہوگئے جسے انٹرنیشنل ریڈ کراس نے "غیر جانبدار علاقہ" بنا رکھا تھا۔ ان "پناہ گزینوں" میں صوبے کے چیف سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، صوبائی سیکرٹری، ڈھاکہ کے کمشنر اور چند دوسرے افسر شامل تھے۔ "غیر جانبدار علاقے" میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تحریری طور پر ریڈ کراس کو یقین دلایا کہ ہمارا متحارب ملکوں میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (اس کے بغیر وہ اس پناہ گاہ میں نہیں آسکتے تھے)۔

۱۴ دسمبر حکومتِ مشرقی پاکستان کا آخری دن تھا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس کا ملبہ کیا بکھرا خود حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔

بنگلہ دیش کی پیدائش ایک ایسے بچّے کی ولادت تھی جسے ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا ہو۔ بھارت یہ آپریشن کر رہا تھا۔ اب اس میں صرف یہ مرحلہ تھا کہ کب مرجھائے ہوئے جنرل نیازی اور کملائے ہوئے پاکستانی دستوں سے ہتھیار ڈلوائے جائیں۔ اِدھر جنرل نیازی بھی اب غیر مُلکی امداد سے نااُمید ہوچکے تھے۔ انہوں نے اب حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے صدرِ مملکت کو ــــ جو کمانڈر انچیف بھی تھے ــــ سچی سچی رپورٹ بھیج کر ہدایات کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ۱۳ دسمبر اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو میرے سامنے جنرل حمید (چیف آف اسٹاف آرمی) کو ٹیلیفون پر کہا "سر میں نے صدر کو کچھ تجاویز بھیجی ہیں مہربانی کر کے ان پر جلدی کارروائی کروا دیں"۔ انہوں نے کہا "اچھا"۔

اگلے دن جنرل یحییٰ خاں نے گورنر اور جنرل نیازی کو جنگ بندی اور لوگوں کے جانی تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کا حکم دے دیا ــــ جنرل نیازی کے نام جنرل یحییٰ نے لکھا:

"گورنر کا پیغام مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے نہایت کٹھن حالات میں نہایت دلیرانہ جنگ لڑی ہے۔ قوم کو آپ پر فخر ہے۔ دُنیا آپ کی تعریف کر رہی ہے۔ جہاں تک انسان کے بس میں ہے میں نے مسئلے کا قابلِ قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب آپ ایسے مرحلے میں ہیں جہاں نہ مزید مزاحمت ممکن ہے اور نہ اس مزاحمت سے کوئی سُود مند مقصد حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ اس سے مزید جان و مال کا نقصان ہوگا۔ آپ کو ان حالات میں مسلح افواج، مغربی پاکستان کے رہنے والوں اور دوسرے وفادار لوگوں کی سلامتی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اس اثنا میں اقوامِ متحدہ سے درخواست کی ہے وہ ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جنگ بند کرنے کو کہے اور اس سے ہماری مسلح افواج کے علاوہ ان تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت مانگے جو شر پسندوں کی معاندانہ سرگرمیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔"

مذکورہ بالا تار راولپنڈی سے ۱۴ دسمبر کو ساڑھے تین بجے سہ پہر نکلا اور مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق ساڑھے پانچ بجے شام ڈھاکہ پہنچا۔ صدر کے اس تار کا منشا کیا تھا؟ کیا یہ جنرل نیازی کے لیے ہتھیار ڈالنے کا حکم تھا یا اس تار کے باوجود وہ اگر چاہتے تو مزاحمت

جاری رکھ سکتے تھے؟ میں اپنی طرف سے اس کی تشریح کرنے کے بجائے قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس سے خود نتیجہ اخذ کریں۔

جنرل نیازی نے اسی شام جنگ بندی کے لیے اقدامات کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے پہلے روسی اور چینی سفارتی نمائندوں کے ذریعے بھارتی کمانڈر انچیف سے رابطہ قائم کرنے کا سوچا، مگر بالآخر ڈھاکہ میں مقیم امریکی قونصل جنرل مسٹر سپیوک (SPIVACK) سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جنرل فرمان سے کہا کہ تم گورنمنٹ ہاؤس میں ہونے کی وجہ سے سفارتی نمائندوں سے ملتے رہتے ہو، میرے ساتھ چلو۔ جنرل فرمان تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے ہمراہ ہو لیے۔ جب یہ دونوں اس کے پاس پہنچے، تو جنرل فرمان انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اور جنرل نیازی اندر مسٹر سپیوک کو رام کرنے لگے۔ جھٹ پٹ دوستی پیدا کرنے کے لیے جنرل نیازی جو ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے، ان کی بازگشت باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔ جب جنرل نیازی کو یقین ہو گیا کہ وہ امریکی قونصل جنرل سے دوستی پکی کر چکے ہیں، تو انہوں نے مطلب کی بات کہی جس کا جواب اس نے نہایت سرد کاروباری لہجے میں یہ دیا: "میں آپ کی طرف سے جنگ بندی کے لیے بھارت سے مذاکرات نہیں کر سکتا۔ اگر آپ چاہیں، تو آپ کی طرف سے پیغام بھجوا سکتا ہوں۔"

اب جنرل فرمان کو بلایا گیا کہ وہ بھارتی فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل (بعد ازاں فیلڈ مارشل) مانک شا کے نام ایک پیغام لکھیں۔ ایک لیڈی سیکرٹری کو بلوا کر جنرل فرمان نے ایک صفحے کا "نوٹ" لکھوا دیا جس میں بعض تحفظات کی شرط کے ساتھ جنگ بندی کی پیش کش کی گئی تھی۔ شرائط یہ تھیں (الف) مسلح افواج کا تحفظ (ب) ملتی باہنی کی انتقامی سرگرمیوں سے وفادار شہریوں کا تحفظ اور (ج) بیماروں اور زخمیوں کا تحفظ۔

مسودہ تیار ہو گیا، تو مسٹر سپیوک نے کہا کہ یہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا۔ آپ جا سکتے ہیں۔ جنرل نیازی اپنے اے ڈی سی کیپٹن نیازی کو وہاں چھوڑ کر جنرل فرمان کے ساتھ واپس آ گئے۔ کیپٹن نیازی رات دس بجے تک وہاں بیٹھے رہے مگر کچھ نہ ہوا۔ انہوں نے پوچھنا چاہا، تو حکم ہوا کہ تم چلے جاؤ، رات کو سونے سے پہلے فون کر کے پوچھ لینا۔

درحقیقت مسٹر سپیوک نے پیغام جنرل مانک شا کو بھیجنے کے بجائے اپنی حکومت کو واشنگٹن روانہ کر دیا تھا جہاں امریکی حکومت کسی قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے یحییٰ خاں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ یحییٰ خاں اس رات اتنے مصروف تھے کہ امریکیوں کو ہاتھ نہ آ سکے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ۳ دسمبر ہی سے مشرقی پاکستان میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ انہوں نے دفتر آنا بھی ترک کر دیا تھا۔ عموماً ان کا ملٹری سیکرٹری نقشے پر جنگ کی تازہ ترین صورتِ حال لگا کر ان کے پاس لے جاتا، جس پر وہ کبھی کبھی نگاہِ غلط انداز ڈال لیتے تھے۔ سنا ہے ایک دفعہ انہوں نے مشکل جنگی حالت دیکھ کر اتنا کہا تھا: "میں مشرقی پاکستان کے لیے کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

جنرل مانک شا کا جواب ۱۵ دسمبر کو ملا۔ انہوں نے جنگ بندی کی پیش کش قبول کر لی تھی اور مطلوبہ تحفظات کی بھی ضمانت دے دی تھی، بشرطیکہ "پاکستانی فوج ہتھیار ڈال دے ــــــ" اس کے ساتھ ہی اس نے ریڈیائی لہروں کی نشاندہی بھی کر دی جن پر کلکتہ میں بھارتی ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

مانک شا کا پیغام راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے شام تک (۱۵ دسمبر) جواب آ گیا جس میں من جملہ دیگر باتوں کے یہ کہا گیا تھا:

"میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان شرائط پر جنگ بندی قبول کر لیں، کیونکہ یہ آپ کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں، البتہ یہ یاد رکھیں کہ اس سمجھوتے کی حیثیت دو مقامی کمانڈروں کے باہمی بندوبست کی سی ہو گی۔ اگر یہ سمجھوتہ ان کوششوں سے متصادم ہوا جو ہم بین الاقوامی سطح پر کر رہے ہیں، تو اس کو کالعدم سمجھا جائے گا۔"

جنرل نیازی اور جنرل مانک شا کے درمیان یہ فیصلہ ہُوا کہ جنگ بندی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے عارضی طور پر ۱۵ دسمبر کی شام کو پانچ بجے سے لے کر اگلے روز ۹ بجے صبح تک "سیز فائر" کیا جائے ـــ بعد میں اس مُدت کو ۱۶ دسمبر ۳ بجے سہ پہر تک بڑھا دیا گیا۔

جنرل حمید نے جنرل نیازی کو جنگ بندی کا جو "مشورہ" دیا تھا' موصوف نے اسے "منظوری" سمجھ لیا اور اپنے چیف آف سٹاف بریگیڈیر باقر صدیقی کو حکم دے دیا کہ وہ تمام ماتحت جرنیلوں اور بریگیڈیروں کو جنگ بندی کی ہدایات دے دیں۔ تمام سیکٹر کمانڈروں کو ایک صفحے کا جو مراسلہ بھیجا اس میں ان کی شجاعت اور پامردی کی تعریف کرنے کے بعد کہا گیا کہ وہ لڑائی اب بند کر دیں اور اس سلسلے میں اپنے مدِمقابل بھارتی کمانڈر سے رابطہ قائم کریں۔ اس ہدایت نامے میں سرنڈر (SURRENDER) کا لفظ کہیں نہیں تھا' صرف آخر میں ایک جُملہ یہ تھا "بدقسمتی سے اس اہتمام میں ہتھیار ڈال دینا بھی شامل ہے"۔

مذکورہ سگنل ۱۵ اور ۱۶ دسمبر کے درمیان نصف شب کے لگ بھگ جاری ہُوا۔ اسے بھیجنے کے بعد آرمی ایوی ایشن کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل لیاقت بُخاری کو بُلا کر حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ہیلی کاپٹر راتوں رات اکیاب (برما) لے جانے کی تیاری کریں۔ ان ہیلی کاپٹروں کو نصف درجن نرسوں (جو ۱۱ دسمبر کو جنرل نیازی سے سی ایم ایچ ڈھاکہ میں ملی تھیں) کے علاوہ ان ۲۸ فوجی کنبوں کو بھی لے جانا تھا جو اب تک ڈھاکہ میں پڑے تھے۔ کرنل بُخاری نے یہ احکامات بڑے تحمل سے سُنے اور فوراً بجا آوری کا وعدہ کیا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ان کو مَیں نے آج بھی اتنا ہی حوصلہ مند پایا جتنا انہیں مارچ ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں یا سیلاب کے دوران امدادی کاموں میں دیکھا تھا۔

یہ ہیلی کاپٹر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر اور مختلف سیکٹروں کے درمیان دورانِ جنگ رابطے کا واحد ذریعہ تھے۔ انہوں نے نہایت نازک حالات میں مختلف علاقوں میں گولہ بارود' ہتھیار اور فوجی دستے پہنچائے تھے۔ ان کی داستانِ شجاعت رقم کرنے کے لیے ایک الگ دفتر چاہیے۔

دو ہیلی کاپٹر سحری سے پہلے پہلے نکل گئے' مگر تیسرا کسی فنّی خرابی کی وجہ سے اُڑ نہ سکا۔ وہ اگلے روز دن چڑھے گیا۔ ان ہیلی کاپٹروں میں فوجی کنبوں کے علاوہ جنرل رحیم بھی اہم سرکاری دستاویزات سمیت چلے گئے۔ مگر وہ بدقسمت نرسیں وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ ان کو لانے کی ذمّہ داری جن افسروں کو سونپی گئی تھی' ان کا کہنا ہے کہ آخر وقت بھی وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنبھالنے لگیں' کسی کو اپنا نیا جُوتا نہیں مل رہا تھا اور کسی کو جراب ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس طرح کے "لالچ" میں انہیں دیر ہو گئی اور ہیلی کاپٹر زیادہ دیر انتظار نہ کر سکے۔ اس کے برعکس یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ ان افسروں کو خود جلدی تھی کہ وہ نرسوں کو لاتے لاتے ہیلی کاپٹروں سے کہیں رہ نہ جائیں (وہ واقعی ان ہیلی کاپٹروں میں برما چلے گئے)۔

جو لوگ ان ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ڈھاکہ سے نکل گئے' وہ برما میں چند روز قیام کرنے کے بعد بخیر و عافیت کراچی پہنچ گئے۔

ادھر ڈھاکہ میں تاریخی ساعت لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ دُشمن ٹنگیل سے ہوتا ہُوا ٹونگی کے قریب آ پہنچا جہاں ہمارے ٹینکوں نے اس پر فائر کر کے اسے روک دیا۔ اس فائر سے دُشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا ٹونگی ڈھاکہ روڈ پر بڑھتے ہُوئے چھاؤنی میں جا داخل ہونا مناسب نہیں۔ اس نے مکتی باہنی کی مدد سے ایک اور راستہ تلاش کر لیا جو مغربی جانب ہوتا ہُوا مانک گنج کے پاس سے ڈھاکہ شہر کو آتا تھا۔ اس طرف گھلنا فیم والے کرنل فضل حمید اور ان کی نیم عسکری نفری لگی ہُوئی تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ دُشمن کا رُخ ان کی طرف ہے تو وہ بدک کر

واپس ڈھاکہ آ گئے۔ ان کے ہٹنے سے دشمن کا راستہ صاف ہو گیا اور وہ شہر کی طرف بڑھنے لگا۔

بریگیڈیئر بشیر کو جو ڈھاکہ شہر کے محافظ تھے اس کی اطلاع ۱۵ دسمبر کی شام کو ملی۔ انہوں نے سول آرمڈ فورسز کی مٹھی بھر نفری جمع کر کے میجر سلامت کی سرکردگی میں شہر سے باہر میرپور پل پر بھیج دی جو رات ہی کو اپنی پوزیشن پر پہنچ گئی۔ دشمن اب بھی مکتی باہنی کی سابقہ اطلاع پر تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ میرپور پل خالی پڑا ہے لہٰذا وہ بے دھڑک آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک میجر سلامت کی نفری نے اس پر فائر کر دیا جس سے دشمن چند جانیں قربان کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دو جیپیں ہمارے ہاتھ آئیں۔

آگے آگے آتے ہوئے جو بھارتی دستہ چوٹ کھا کر پسپا ہو گیا تھا وہ اس چھاتہ بردار بٹالین کا حصہ تھا جو چند روز پہلے تنگیل کے قریب اتاری گئی تھی۔ اس کے پیچھے میجر جنرل ناگرا آ رہا تھا جو اب بھارت کے COMMUNICATION ZONE ۱۰۱ کی کمان کر رہا تھا۔ وہ میرپور پل کے پاس آ کر رک گیا۔ وہاں سے اس نے لیفٹیننٹ جنرل نیازی کو ایک مختصر خط لکھا جس میں درج تھا:

"پیارے عبداللہ!

"میں میرپور پل پر ہوں اپنا نمائندہ بھیج دو۔"

جنرل نیازی کو یہ رقعہ کوئی ۹ بجے صبح (۱۶ دسمبر) ملا جبکہ میجر جنرل جمشید، میجر جنرل فرمان اور ریئر ایڈمرل شریف ان کے پاس تھے۔ جنرل فرمان اب بھی اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ہم نے جنگ بندی کے مذاکرات کے لیے کلکتہ پیغام بھیجا ہوا ہے وہاں سے ان کا کوئی نمائندہ آ کر ہم سے بات کرے گا۔ جنرل نیازی نے جب انہیں جنرل ناگرا کی چٹ دکھائی تو انہوں نے کہا "کیا وہ بھارت کی یک رکنی مذاکراتی ٹیم ہے؟" جنرل نیازی نے کوئی جواب نہ دیا ـــ دراصل اب ان موشگافیوں کا وقت نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈھاکہ کی دہلیز پر آ بیٹھا ہے تو اسے خوش آمدید کہنا ہے یا مدافعت کرنا ہے؟ جواب کا انحصار اس بات پر تھا کہ مدافعت کی سکت باقی ہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ جنرل فرمان نے پوچھا "کیا کچھ ریزرو فوج باقی ہے؟" جنرل نیازی خاموش رہے۔ ریئر ایڈمرل شریف نے اس انگریزی سوال کا پنجابی میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا "کج پلے ہے؟" جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے محافظ جنرل جمشید کی طرف دیکھا جنہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر جنرل فرمان اور ایڈمرل شریف یک زبان ہو کر بولے "اگر یہ کیفیت ہے تو جاؤ اور جو وہ کہتا ہے کرو۔"

جنرل نیازی نے میجر جنرل ناگرا کے استقبال کے لیے میجر جنرل جمشید کو بھیج دیا۔ وہ سیدھے میرپور پل پر پہنچے۔ انہوں نے سب سے پہلے میجر سلامت سے کہا وہ "سیز فائر" کے آداب کا خیال رکھے لہٰذا میجر سلامت اور ان کے سپاہیوں نے لبلبی سے اپنی انگلیاں ہٹا لیں اور میجر جنرل ناگرا ایک گولی فائر کیے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا ـــ اس کے ساتھ مٹھی بھر بھارتی فوج اور ڈھیر ساری فاتحانہ نخوت تھی۔ عملاً یہ ڈھاکہ کا اختتام تھا۔ اگرچہ اسے دفن کرنے کی رسوم ابھی باقی تھیں ـــ ڈھاکہ یوں چپ چاپ سو گیا جیسے اچانک حرکت قلب بند ہو گئی ہو ـــ وہاں کوئی ہاؤ ہو نہ ہوئی کوئی مارکٹائی نہ ہوئی۔ سنگاپور، پیرس یا برلن کے سقوط کی کوئی کہانی نہ دہرائی گئی ـــ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاکہ غلامی میں ڈوب گیا۔

اسی اثنا میں ایسٹرن کمانڈ کے "ٹیک ہیڈکوارٹر" کو سمیٹ لیا گیا۔ دیواروں پر سے جنگی نقشے اتار لیے گئے۔ وہاں پڑے ہوئے ٹیلیفونوں کی روح قبض کر لی گئی۔ بھارتی فاتحوں کا استقبال کرنے کے لیے ایسٹرن کمانڈ کے پرانے ہیڈکوارٹر کو جھاڑا پونچھا گیا کیونکہ بریگیڈیئر باقر صدیقی کے بقول "وہاں ہمارا فرنیچر عمدہ تھا" ملحقہ آفیسرز میس میں مہمانوں کے لیے لنچ کا اہتمام کیا گیا ـــ ان سب انتظامات کے

دوران بریگیڈیئر صدیقی تھے جو انتظامی امور میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سہ پہر کو بریگیڈیئر باقر صدیقی اپنے بھارتی ہم منصب (یعنی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف) میجر جنرل جیکب کو لینے ایئرپورٹ تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں جنرل نیازی اپنے "مہمان" میجر جنرل ناگرا کی تواضع لطیفوں سے کرتے رہے۔ میں ان لطیفوں کو دہرا کر اس المناک کہانی کو غلیظ نہیں کرنا چاہتا۔

میجر جنرل جیکب اپنے ساتھ ایک دستاویز لائے جسے سقوط کی دستاویز (INSTRUMENT OF SURRENDER) کہا جاتا ہے۔ جنرل نیازی اسے "جنگ بندی کا مسودہ" کہنا پسند کرتے تھے۔

جیکب نے یہ کاغذات باقر صدیقی کو دیے جنہوں نے جنرل فرمان کے سامنے رکھ دیے۔ جنرل فرمان نے کہا: "یہ "ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان" کیا چیز ہے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میجر جنرل جیکب نے کہا: "یہ دستاویز ایسے ہی تیار شدہ دہلی سے آئی ہے" (یعنی مجھے اس میں ردوبدل کا اختیار نہیں) انڈین ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل کھیرا پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے لقمہ دیا: "یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ صرف انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں"۔ جنرل فرمان نے یہ کاغذات جنرل نیازی کے سامنے سرکا دیے اور کہا: "یہ کمانڈر پر منحصر ہے کہ وہ اسے منظور یا نامنظور کرے"۔ جنرل نیازی خاموش رہے۔ اس خاموشی کو مکمل رضا سمجھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ جنرل نیازی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو لینے ڈھاکہ ایئرپورٹ گئے۔ بھارتی کمانڈر اپنی فتح کی خوشی میں اپنی شریک حیات کو بھی ساتھ لایا تھا۔ جونہی یہ میاں بیوی ہیلی کاپٹر سے اُترے، بنگالی مردوں اور عورتوں نے اس "نجات دہندہ" اور اس کی بیوی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو پھولوں کے ہار پہنائے، انہیں گلے لگایا، بوسے دیے اور تشکر بھرے جذبات سے انہیں خوش آمدید کہا۔ جنرل نیازی نے بڑھ کر فوجی انداز میں سیلوٹ کیا، پھر ہاتھ ملایا ـــ یہ نہایت دلدوز منظر تھا ـ فاتح اور مفتوح بنگالیوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک کے لیے انتہائی نفرت اور انتقام کے جذبات تھے اور دوسرے کے لیے احسانمندی اور تشکر کے۔ ان جذبات کو پڑھنے کے لیے کسی چشم بینا کی ضرورت نہ تھی۔ بنگالیوں کا انگ انگ یہی صدا دے رہا تھا۔

جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ وہاں سے سیدھے رمنا ریس گراؤنڈ (جسے سہروردی گراؤنڈ بھی کہتے ہیں) گئے جہاں سرعام جنرل نیازی سے ہتھیار ڈلوانے کی تقریب منعقد ہونی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ۷ مارچ کو مجیب الرحمن نے "بنگلہ دیش کا یک طرفہ اعلان آزادی" کرنا تھا، مگر آخری وقت وہ ایسا نہ کر پائے تھے۔ آج یہاں دوسری طرح کا اعلان آزادی ہونے والا تھا جس کا نظارہ کرنے کے لیے لاکھوں بنگالی موجود تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جنرل نیازی کی تذلیل کا منظر دیکھنے کے لیے سارا شہر اُمڈ آیا ہے۔

مجمع کو بھارتی سپاہیوں نے روک رکھا تھا۔ تقریب کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی تھی جہاں ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوطِ مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ریوالور نکال کر اروڑہ کو پیش کر دیا ـــ اور یوں سقوطِ ڈھاکہ پر آخری مہر ثبت کر دی۔ اس موقع پر جنرل اروڑہ نے پاکستانی سپاہیوں کی ایک گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا جو اس بات کی علامت تھا کہ اب وہی "گارڈ" ہیں اور وہی "آنر" کے مستحق!

اس تقریب کے بعد ہم قانونی طور پر جنگی قیدی بن کر جنرل اروڑہ کے زیرِ کمان آ گئے۔ مگر ڈھاکہ میں ابھی بھارتی فوج اتنی ناکافی

تھی کہ قیدیوں کو مکتی باہنی کی انتقامی کارروائیوں سے بچا نہیں سکتی تھی؛ چنانچہ بھارت نے اجازت دے دی کہ پاکستانی قیدی تاحکمِ ثانی اپنے چھوٹے ہتھیار ذاتی تحفظ کے لیے اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہتھیار ۱۹ دسمبر تک ہمارے پاس رہے۔ معقول تعداد میں بھارتی سپاہیوں کے پہنچنے کے بعد ڈھاکہ گیریژن کے جوانوں سے ہتھیار لیے گئے۔ افسروں سے ہتھیار ڈلوانے کے لیے ڈھاکہ چھاؤنی کے "گاف کورس" میں ۱۹ دسمبر کو ۱۱ بجے صبح ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں جنرل فرمان، ریئر ایڈمرل شریف اور جنرل جمشید سمیت سب افسروں نے ہتھیار ڈالے۔ میں بھی اس جرمِ ندامت میں شامل تھا۔

ڈھاکہ سے باہر باقی مقامات پر کمانڈروں نے اپنے مدِمقابل سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۶ سے ۲۰ دسمبر کے درمیان ہتھیار ڈالے۔

آل انڈیا ریڈیو نے ۱۴ دسمبر ہی سے ہماری شکست کی خبریں نشر کرنی شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور دوسرے مقامات پر غیر بنگالیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر چھاؤنیوں کا رُخ کر لیا تھا۔ انہوں نے اب بھی اپنے مُقدّر کو پاکستانی فوج کے مُقدّر سے وابستہ کرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے ہزارہا لوگوں کو مکتی باہنی نے راستے ہی میں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ میں نے اس سلسلے میں مکتی باہنی کے مظالم کے ایسے ایسے واقعات سُنے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات اتنے کثیر اور گمبھیر ہیں کہ ان کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

ہندوستانیوں کے پاس ان بے چاروں کی نگہداشت کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ ان کی نگاہ مالِ غنیمت پر تھی جسے وہ دھڑا دھڑ ٹرکوں، بسوں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے بھارت لے جا رہے تھے۔ اس میں ہمارا جنگی ساز و سامان، خوراک کے ذخائر، صنعتی مصنوعات، مشینری حتیٰ کہ گھریلو استعمال کی چیزیں مثلاً فرج، قالین اور ٹیلی وژن سیٹ وغیرہ شامل تھے۔ نومولود بنگلہ دیش کا اتنا خون چوسا گیا کہ جب وہ آزادی کا سانس لینے کے قابل ہوا، تو وہ محض ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا ۔۔۔ اس کا احساس بنگالیوں کو ایک سال بعد ہوا۔

جب بھارت کو "مالِ غنیمت" سے فرصت ملی تو اس نے جنگی قیدیوں کو ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۷۱ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ جنگی قیدیوں میں اہم شخصیتیں (وی آئی پی) جنرل نیازی، جنرل فرمان، جنرل جمشید، ریئر ایڈمرل شریف اور ائیر کموڈور انعام الحق تھے جنہیں ایک باربردار طیارے کے ذریعے ۲۰ دسمبر کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

ڈھاکہ ائیرپورٹ کو میں نے آخری بار ۲۰ دسمبر کی سہ پہر کو دیکھا۔ اب یہ اس ائیرپورٹ سے قطعاً مختلف تھی جس پر میں نے جنوری ۱۹۷۰ء کو پہلی بار قدم رکھا تھا۔ ایک واضح تبدیلی یہ تھی کہ اب یہاں خاکی وردی کے بجائے سبز وردی نظر آ رہی تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ ان دو سالوں میں بنگالیوں نے صرف آقا بدلے ہیں۔ بنگالی مرد اور لڑکے اب بھی ہوائی اڈے کی بیرونی دیوار پر بیٹھے تھے جنہیں بھارتی سپاہی کتوں کی طرح دُھتکار رہے تھے۔ میں جب پہلی مرتبہ یہاں پہنچا تھا، تو سُورج چمک رہا تھا۔ اب ایک ایسی رات پڑنے کو تھی جس کی سحر ۔۔۔ کم از کم ۔۔۔ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈھاکہ ڈُوب چُکا ہے ۔۔۔ آخری بار!

بھارتی طیارہ ہمیں کلکتہ لے آیا جہاں ہمیں ایک تاریخی عمارت فورٹ ولیم میں رکھا گیا ۔۔۔ یہاں ہم اکٹھے تھے اور ایک دوسرے سے مل لیتے تھے۔ فرصت کے ان ایّام میں میں نے جنرل نیازی سے انٹرویو کیا تاکہ سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق ان کے تاثرات حاصل کر سکوں۔ اُن دنوں ابھی زخم تازہ تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جنرل نیازی نے اپنا "دفاع" پیش کرنے کے لیے

ابھی حقائق کو توڑنا مروڑنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے آزادانہ گفتگو کرتے رہے۔ ان کے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو سارے المیئے سے بری الذمہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار جنرل یحییٰ خاں ہے۔

اس تاریخی انٹرویو کے موٹے موٹے سوال وجواب یہ تھے :

سوال : کیا آپ نے جنرل یحییٰ یا جنرل حمید کو کبھی صاف صاف بتایا تھا کہ آپ کو جو وسائل دیئے گئے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ناکافی ہیں ؟

جواب : کیا وہ سویلین ہیں ؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے تین انفنٹری ڈویژن ناکافی ہیں ؟

سوال : مگر یہ الزام تو ہمیشہ آپ ہی پر رہے گا کہ آپ مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کر سکے۔ اگر کم وسائل کے پیشِ نظر آپ کے خیال میں دفاعی قلعوں والی اسٹریٹیجی بہترین حکمتِ عملی تھی، تو کیا وجہ ہے کہ آپ نے ڈھاکہ کو دفاعی قلعہ نہ بنایا جہاں فوج کی ایک کمپنی بھی نہ تھی ؟

جواب : یہ سب راولپنڈی والوں کا قصور ہے۔ انہوں نے مجھے نومبر کے وسط میں آٹھ بٹالینیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، مگر صرف پانچ بھیجیں۔ میں باقی تین کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو انہیں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے استعمال کروں گا۔

سوال : لیکن ۳؍ دسمبر کو جب آپ پر واضح ہو گیا کہ اب مزید نفری آنی ناممکن ہے تو آپ نے کیوں نہ اپنے وسائل میں سے کچھ جمعیت ڈھاکہ کے لیے مخصوص کر لی ؟

جواب : دراصل اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کسی محاذ سے ایک کمپنی بھی نکالنا مشکل تھا۔

سوال : جو تھوڑے بہت وسائل آپ کے پاس ڈھاکہ میں موجود تھے، اگر آپ ان کو بھی صحیح طور پر استعمال کرتے، تو جنگ کچھ دن اور جاری رہ سکتی تھی۔

جواب : مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا ؟ ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، گلیوں میں لاشوں کے انبار لگ جاتے، نالیاں اُٹ جاتیں، شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی۔ لاشوں کے گلنے سڑنے سے طاعون اور دوسری بیماریاں پھوٹ پڑتیں — اس کے باوجود انجام وہی ہوتا ! میں نوے ہزار بیواؤں اور لاکھوں یتیموں کا سامنا کرنے کے بجائے نوے ہزار قیدی واپس لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سوال : اگرچہ انجام وہی ہوتا، مگر تاریخ مختلف ہوتی۔ اس سے پاکستان کی عسکری تاریخ میں ایک سنہرا باب لکھا جاتا۔ آئندہ دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

جنرل نیازی خاموش رہے !

پس منظر، ترتیبِ واقعات

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

برِصغیر ہندوستان تقسیم ہوا۔ دو خود مختار ریاستیں (ہندو) انڈیا اور (مسلم) پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آئیں۔ نیا مُلک پاکستان مسلم اکثریت کے دو علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس کا ایک حصّہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اور دوسرا شمال مشرق میں واقع تھا۔ شمال مغربی علاقے کو مشرقی بنگال کہتے تھے، جبکہ شمال مغربی حصّے میں سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صُوبہ اور صُوبہ پنجاب کا کچھ حصّہ شامل تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں اپنی اکثریت کی وجہ سے ہندو یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی تسلّط سے آزاد ہونے کے بعد ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے وہی حقدار ہیں۔ اس لیے پاکستان کا قیام انہیں ناپسند تھا۔ اس کے ایک ممتاز لیڈر گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کو "مقدّس گائے کو دو نیم کرنے کا عمل" قرار دیا تھا اور ہندو مہاسبھا کا کہنا تھا کہ "ہندوستان ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس کو جب تک دوبارہ اکھنڈ نہیں کیا جائے گا، یہاں امن و امان قائم نہیں ہوسکتا۔"

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء

ہندوستان نے ریاست جموں و کشمیر پر جبری تسلّط قائم کرنے کے لیے مسلم اکثریت کی اس ریاست پر فوج کشی کر دی۔ کشمیریوں نے قبائلیوں کی اعانت سے حملہ آوروں کی مزاحمت کی۔ پاکستان کی فوج بھی جو اس وقت ابھی تنظیم کے ابتدائی مراحل میں تھی، مئی ۱۹۴۸ء میں اس جنگ میں شامل ہوگئی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوامِ متحدہ (سکیورٹی کونسل) کی طرف سے "جنگ بندی" کا نفاذ اس شرط پر عمل میں آیا کہ کشمیریوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصوابِ رائے کرایا جائے گا۔ یہ وعدہ کبھی پُورا نہ ہوا اور مسئلہ کشمیر آج تک ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی راہ میں حائل چلا آرہا ہے۔ مشرقی پاکستان جو کشمیر سے ۱۶۰۰ کلومیٹر دُور واقع تھا، پاکستان کے مغربی بازو کی سی جذباتی شدّت کے ساتھ مسئلہ کشمیر سے کبھی وابستہ نہ ہوسکا۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح نے جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے، مشرقی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے ڈھاکہ میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اُردو ہوگی۔ بنگالی نوجوانوں نے اس کو اپنی حق تلفی سمجھا اور اس بیان کے خلاف شدید احتجاج کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بنگلہ زبان دب جائے گی جو مُلک کی ۵۴ فیصد آبادی کی مادری زبان تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو اس وقت یونیورسٹی میں طالب علم تھے، مظاہرہ کرنے والے ان نوجوانوں میں شامل تھے۔ مجیب سمیت کئی طلبا کو گرفتار کرلیا گیا، مگر آئندہ کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ زبان کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والے طلبہ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

قائدِاعظمؒ کا انتقال ہوگیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی وزیرِاعلیٰ خواجہ ناظم الدّین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ مسٹر لیاقت علی خان، جو

قائد اعظم کے دست راست تھے اس سو گوار ملک کی وزارت عظمیٰ پر بدستور قائم رہے۔

مارچ۔اپریل ۱۹۴۹ء

ممتاز بنگالی لیڈر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے نرائن گنج (ڈھاکہ) میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس کے تین اسسٹنٹ جنرل سیکرٹریوں میں سے ایک مجیب الرحمٰن تھے۔ اس جماعت کو پُرجوش بنگالی نوجوانوں کے علاوہ ان پرانے سیاستدانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی جن کو آزادی کے بعد اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں پیر مانکی شریف نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی اس نام کی ایک اور جماعت قائم کرلی۔ فروری ۱۹۵۰ء میں دونوں "عوامی لیگوں" کو مدغم کر دیا گیا اور نئی متحدہ جماعت کی قیادت بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کے سپرد ہوئی۔ نئی جماعت کو "آل پاکستان عوامی مسلم لیگ" کا نام دیا گیا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء

مسٹر لیاقت علی خان راولپنڈی میں ایک جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے قتل کر دیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بن گئے اور مسٹر غلام محمد جو پیشے کے لحاظ سے سرکاری ملازم تھے، جوڑ توڑ کر کے گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہوگئے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء

آئین کے بنیادی رہنما اصول مرتب کرنے کی غرض سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے اپنی سفارشات کا اعلان کر دیا۔ ایک سفارش یہ تھی کہ اردو پاکستان کی واحد سرکاری زبان ہوگی۔ اس پر مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر چل پڑی۔

۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

بنگالیوں نے مذکورہ سفارش کو اکثریتی صوبے پر لسانی اور ثقافتی یلغار کی تازہ ترین کوشش قرار دیتے ہوئے ڈھاکہ میں احتجاجی جلسے منعقد کیے۔ عوامی مسلم لیگ کے صوبائی صدر مولانا بھاشانی نے بھی ان جلسوں سے خطاب کیا۔ ۲۱ فروری کو جب صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس منعقد ہونا تھا، عام ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۱ فروری ۱۹۵۲ء

وزیر اعلیٰ نورالامین نے اگرچہ جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی مگر ۲۱ فروری کو احتجاجی جلسے منعقد ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ طلبہ اور پولیس میں تصادم ہوا، تین طالب علم اور کئی اور لوگ ہلاک ہوئے۔ ان کی قربانی کی یادگار کے طور پر "شہید مینار" تعمیر کیے گئے۔ بعد میں یہ مینار بنگالیوں کی احتجاجی سرگرمیوں کی علامت بن گئے اور گورنر اور سفارتی نمائندے ہدیۂ ارادت پیش کرنے کے لیے ان یادگاروں پر جانے لگے۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء

گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو پارلیمنٹ سے اعتماد (یا عدم اعتماد) کا ووٹ لیے بغیر موقوف کر دیا۔ اس سے بنگالی اور زیادہ ناراض ہوگئے۔ انہوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو اس وقت واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر تھے بعجلت طلب کر کے وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھا دیا۔ مسٹر بوگرہ کو مشرقی پاکستان میں کوئی سیاسی اثر و رسوخ حاصل نہ تھا، لہٰذا وہ اپنے پنجابی سرپرست غلام محمد کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔

اپریل ۱۹۵۲ء

عوامی لیگ نے اپنی اصل لادینی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے "مسلم" کا لفظ اپنے نام سے خارج کر دیا اور اپنا نام صرف عوامی لیگ رکھ لیا۔ اس سے پرانے مسلم لیگی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے استعفے دے دیا۔ ان کی جگہ سرمایہ دار ہندو عوامی لیگ میں داخل ہو کر اس کی حکمت عملی میں دخیل ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۵۲ء

شیر بنگال مولوی فضل حق نے جنہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پیش کی تھی ڈھاکہ میں اپنی علیحدہ جماعت قائم کر لی جو کرشک سرامک (مزدور کسان) پارٹی کہلائی۔ عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹیوں کی تاسیس اور ترقی جہاں حکمران جماعت مسلم لیگ سے بڑھتی ہوئی بیزاری کی علامت تھی وہاں صوبائی سیاست میں لادینی نظریے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی بھی کرتی تھی۔

۸ تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۴ء

مشرقی پاکستان میں مجلس قانون ساز کے انتخابات عمل میں آئے۔ یہ آزادی ملنے کے بعد پہلے انتخابات تھے۔ عوامی لیگ، کرشک سرامک اور مشرقی بنگال کی دوسری پارٹیوں نے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) قائم کر لیا۔ "محاذ" کے ۲۱ نکاتی منشور میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ بنگلہ زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اور اہم نکتہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تھا۔ اس انتخابی معرکے میں حکمران مسلم لیگ صرف نو نشستیں جیت سکی۔ وزیر اعلیٰ نورالامین "محاذ" کے نامزد کردہ ایک طالب علم کے مقابلے میں ہار گئے۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء

"متحدہ محاذ" کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ تین دن بعد نئی حکومت نے حلف اٹھا لیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس کابینہ میں ایک وزیر تھے۔

۳۰ مئی ۱۹۵۴ء

گورنر جنرل نے "متحدہ محاذ" کی حکومت کو برطرف کر دیا کیونکہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے چند روز قبل کلکتہ "ایرپورٹ" پر مبینہ طور پر ایک باغیانہ بیان دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نظر بند کر لیے گئے۔ صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ "متحدہ محاذ" کا شیرازہ بکھر گیا۔ سرکردہ لیڈروں نے اپنی اغراض کے تحت "عوامی لیگ" اور "کرشک سرامک" پر الگ الگ ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء

گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ محمد علی بوگرہ نے پارلیمنٹ کے بغیر نئی حکومت قائم کی تو اس میں فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو وزیر دفاع کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء

۸۰ ارکان پر مشتمل ایک نئی مجلس دستور ساز کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے ارکان صوبوں کی مجالس قانون ساز سے لیے گئے "عوامی لیگ" اور کرشک سرامک نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے اور یوں قومی سیاست میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا۔

جون ۱۹۵۵ء

مشرقی پاکستان سے گورنر راج ختم کر دیا گیا۔ "کرشک سرامک پارٹی" نے جو اب مرکز میں مسلم لیگ سے تعاون کر رہی تھی ڈھاکہ میں حکومت قائم کر لی۔ عوامی لیگ حزب مخالف میں جا بیٹھی۔

۶ اگست ۱۹۵۵ء

مسٹر غلام محمد ـــ وہ "علیل سازشی" ـــ بالآخر پاکستان کی سیاست سے نکل گیا۔ سات ستمبر کو اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کے منصب کا حلف اٹھایا۔ اسکندر مرزا ایک غیر سیاسی شخصیت تھے مگر نہایت چلتے پرزے۔ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان چودھری محمد علی کے سپرد کر دیا جن کو مسلم لیگ نے نامزد کیا تھا، حالانکہ عوامی لیگ کے قائد کی حیثیت سے مسٹر ایچ ایس سہروردی سمجھتے تھے کہ وزارت سازی کا حق انہیں پہنچتا ہے۔ بنگالیوں نے اس واقعے کو بھی بنگالیوں کے سیاسی اقتدار سے محروم رکھنے کا ایک اقدام سمجھا۔

۷ ستمبر ۱۹۵۵ء

عوامی لیگ کے مسٹر عطاء الرحمن نے مشرقی بنگال کی مجلس قانون ساز میں کہا: "مسلم لیگ کا حکمران ٹولہ مشرقی بنگال اس کی ثقافت، اس کی زبان، اس کے لٹریچر غرضیکہ اس کی ہر چیز کی طرف اہانت اور تحقیر کا رویہ رکھتا ہے۔ جناب والا! میں عرض کروں گا کہ ہمیں برابر کا شریک گرداننا تو درکنار مسلم لیگ کے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم محکوم قوم سے اور وہ فاتح اور حکمران قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مغربی بازو میں واقع تمام صوبوں یعنی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ کو مدغم کر کے "ون یونٹ" بنا دیا گیا اور اسے "مغربی پاکستان" کا نام دیا گیا۔ ون یونٹ بل جو دو ہفتے پہلے منظور کیا گیا اس بات کی ضمانت دیتا تھا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان برابری کی سطح پر باہمی تعلقات استوار کیے جائیں گے مگر بنگالیوں نے یہ سمجھا کہ یہ بنگالیوں کو جو ایک اکثریتی صوبے سے تعلق رکھتے ہیں اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی ایک اور چال ہے۔

۲۹ فروری ۱۹۵۶ء

چودھری محمد علی کی ان تھک کوششوں سے دستور ساز اسمبلی نے ملک کا پہلا آئین منظور کر لیا اور تین ہفتے بعد یعنی ۲۳ مارچ کو اسے نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین میں پیریٹی (PARITY) کے اصول پر پارلیمنٹ میں دونوں صوبوں کو برابر برابر نمائندگی کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان اب ایک "جمہوریہ" بنا اور اس کا گورنر جنرل صدر کہلانے لگا۔ اردو کے علاوہ بنگلہ کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔

۳۰ اگست ۱۹۵۶ء

مشرقی پاکستان میں "کے ایس پی" کی حکومت کو جو گزشتہ چودہ مہینوں سے اسمبلی کا سامنا کیے بغیر برسرِ اقتدار چلی آ رہی تھی مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی جگہ عوامی لیگ نے ایک ہندو لیڈر جی کے داس اور ان کی پارٹی کی اعانت سے حکومت قائم کر لی۔ مسٹر عطاء الرحمان اس کے وزیر اعلیٰ بنے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرکز میں چودھری محمد علی کی جگہ جنہوں نے ۸ ستمبر کو استعفیٰ دے دیا تھا مسٹر حسین شہید سہروردی نے حکومت سنبھال لی۔ ان کو "ری پبلکن پارٹی" کی حمایت حاصل تھی جو اسکندر مرزا کے ایماء پر قائم کی گئی تھی۔

۳۰ جون ۱۹۵۷ء

عوامی لیگ کے صوبائی صدر مولانا بھاشانی نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر سہروردی کے خلاف ان کا الزام یہ تھا کہ وہ

مغربی پاکستان سے رنجیدگی سلوک کرتے ہیں اور انہوں نے نہر سویز کے مسئلہ میں جماعتی منشور کے خلاف "سامراجیوں" کی حمایت کی۔

۲۶ر جولائی ۱۹۵۷ء

مولانا بھاشانی نے جو چین کی طرف واضح ذہنی جھکاؤ رکھتے تھے "نیشنل عوامی پارٹی" کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت قائم کر لی۔ یہ جماعت "لادینی سیاست" (SECULAR) میں اعتقاد رکھتی تھی مگر "عوامی لیگ" کے برعکس اس کو زیادہ تر حمایت بائیں بازو کے عناصر سے حاصل تھی۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

"ری پبلکن پارٹی" کی حمایت سے محروم ہونے پر مسٹر حسین شہید سہروردی مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ مسٹر آئی آئی چندریگر وزیراعظم بنے مگر ان کو بھی دو ماہ کے اندر اندر مستعفی ہونا پڑا اور دسمبر میں ملک فیروز خان نون وزارت عظمیٰ پر متمکن ہو گئے۔

۱۸ر جون ۱۹۵۸ء

عوامی لیگ کی مخلوط حکومت مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں شکست کھا گئی۔ مسٹر عطاء الرحمان مستعفی ہو گئے۔ دو دن بعد کے۔ ایس۔ پی نے وزارت بنائی جو بمشکل تین روز چل سکی۔ صوبے میں ایک مرتبہ پھر "گورنر راج" نافذ کر دیا گیا۔

۲۶ر اگست ۱۹۵۸ء

"گورنر راج" ختم کر دیا گیا۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں پھر حکومت قائم کر لی۔

۲۱ر ستمبر ۱۹۵۸ء

مشرقی پاکستان کی اسمبلی کے اجلاس میں "اسپیکر" کی جانبداری کے مسئلے پر ہنگامہ ہو گیا۔ کئی ارکان شدید زخمی ہوئے۔ ڈپٹی اسپیکر مسٹر شاہد علی جان سے مارے گئے۔

۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل محمد ایوب خان کی حمایت سے صدر اسکندر مرزا نے آئین معطل کر دیا، اسمبلی توڑ دی اور ملک میں "مارشل لاء" نافذ کر دیا۔ جنرل ایوب خان کو "چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" مقرر کیا گیا۔ اس "انقلاب" نے بنگالیوں کی سیاسی حق طلبی کی "امنگ" پر "مہر" لگا دی۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو برطرف کر کے لندن بھیج دیا اور خود "فیلڈ مارشل" کا رینک اختیار کر کے تمام اختیارات سنبھال لیے۔ مشرقی پاکستان پر وہ اپنی مرضی کے گورنروں کے ذریعے حکومت کرنے لگے۔ مسلح افواج میں چونکہ بنگالیوں کی نمائندگی بہت کم تھی اس لیے وہ محسوس کرنے لگے کہ فوجی انقلاب آنے سے وہ ہمیشہ کے لیے سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس احساس سے ان کے اندر محرومی، یاس اور نفرت کے جذبات سلگنے لگے۔ مارشل لاء کی سختی نے انہیں کچلنے کی کوشش کی تو اس سے صوبائیت کے جذبے کو اور ہوا ملنے لگی۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

ایوب خان نے "بنیادی جمہوریتوں" کا نظام نافذ کر دیا۔ یہ نظم و نسق کی اعانت کے لیے مقامی اداروں پر مشتمل ایک نیا نظام تھا۔ ملک کے صدر اور اسمبلی کے ارکان کو منتخب کرنے کا اختیار بھی بہت جلد انہی بنیادی اداروں کے اسّی ہزار ارکان کو تفویض کر دیا گیا۔ بنگالیوں

نے سمجھا کہ اس باریک پردے میں دراصل ایک فردِ واحد کی حکومت کو مستقل کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگوں کی بھاری اکثریت نے بھی اسے ناپسند کیا۔

۱۵ فروری ۱۹۶۰ء

ایوب خان نے "بنیادی جمہوریتوں" کے اسّی ہزار ارکان سے اعتماد کا ووٹ طلب کیا تو ان میں سے پچھتّر ہزار دو سو تراسی ارکان نے صدارت کے منصب کے لیے ان کی توثیق کر دی اور دو روز بعد فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کے پہلے "منتخب" صدر کی حیثیت سے اپنے منصب کا حلف اُٹھا لیا۔

اپریل ۱۹۶۰ء

لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا مگر اس پر وہ خود ایوب خان کی حمایت سے محروم ہو گئے اور ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۸ جون ۱۹۶۲ء

ایوب خان نے اپنی طرف سے ایک آئین مُلک میں نافذ کر دیا جس میں صدارتی طرزِ حکومت کو بھی اپنایا گیا۔ صدر کے لیے انتخاب کی بنیاد "بنیادی جمہوریت" کے ارکان تھے۔ اس دستور میں بھی ۱۹۵۶ء والے آئین کی طرح دونوں صوبوں کے درمیان برابری (PARITY) کا اصول رکھا گیا۔ یہ آئین مجموعی طور پر قبولِ عام حاصل نہ کر سکا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء

بنگال کے رہنے والے مسٹر منعم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا جو ایوب خان کے زوال (۱۹۶۹ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ ایوب خان سے ان کی انتہائی وفاداری کی وجہ سے وہ بنگالیوں میں غیر مقبول ہو گئے۔ کٹر بنگالی انہیں "پنجابیوں کا ایجنٹ" کہتے تھے۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے ان کے ہاتھ سے اسناد لینے سے انکار کر دیا تھا۔

۲۹ مئی ۱۹۶۳ء

نیشنل اسمبلی کے ایک بنگالی رکن نے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کی قیمت پر ترقی دی جا رہی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں کم درآمدات اور زیادہ برآمدات کی صورت میں مشرقی پاکستان کو اس کے گاڑھے پسینے کے ایک سو کروڑ روپیہ سے محروم کیا گیا اور جنابِ والا! اس کو صرف کر کے مغربی پاکستان کو ترقی دی گئی اور اس کی زرعی اراضی میں کئی لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ بڑے لوگ بڑی اونچی باتیں کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر رہنے دو۔ ہم اپنا گزارہ خود کر سکتے ہیں۔ اب سولہواں سال جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے۔۔۔۔ ہم سے کہا جاتا ہے۔ چھوڑ کر نکل جاؤ ہمارے پاس تمہارے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

۲ جنوری ۱۹۶۴ء

صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ قائداعظمؒ کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا مقابلہ کیا۔ حزبِ مخالف کی تمام جماعتوں نے ان کی حمایت کی۔ بنگالیوں نے بھی ان کی حمایت میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ان کے خیال میں ایک ڈکٹیٹر کو ہٹا کر سیاسی حقوق بحال کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اگرچہ اس "الیکشن" میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار ارکان کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لیے مگر ڈھاکہ میں جو مشرقی پاکستان کی سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا وہ مس جناح سے ہار گئے۔

نے سمجھا کہ اس باریک پردے میں دراصل ایک فردِ واحد کی حکومت کو مستقل کرنے کا اہتمام کیا جارہا ہے مغربی پاکستان کے لوگوں کی بھاری اکثریت نے بھی اسے ناپسند کیا۔

۱۵ فروری ۱۹۶۰ء

ایوب خان نے "بنیادی جمہوریتوں" کے اسّی ہزار ارکان سے اعتماد کا ووٹ طلب کیا" تو ان میں سے پچھتّر ہزار دو سو تراسی ارکان نے صدارت کے منصب کے لیے ان کی توثیق کردی اور دو روز بعد فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کے پہلے "منتخب" صدر کی حیثیت سے اپنے منصب کا حلف اٹھالیا۔

اپریل ۱۹۶۰ء

لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا مگر اس پر وہ خود ایوب خان کی حمایت سے محروم ہوگئے اور ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۸ جون ۱۹۶۲ء

ایوب خان نے اپنی طرف سے ایک آئین ملک میں نافذ کردیا جس میں صدارتی طرزِ حکومت کو بھی اپنایا گیا۔ صدر کے لیے انتخاب کی بنیاد "بنیادی جمہوریت" کے ارکان تھے۔ اس دستور میں بھی ۱۹۵۶ء والے آئین کی طرح دونوں صوبوں کے درمیان برابری (PARITY) کا اصول رکھا گیا۔ یہ آئین مجموعی طور پر قبولِ عام حاصل نہ کرسکا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء

بنگال کے رہنے والے مسٹر منعم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا جو ایوب خان کے زوال (۱۹۶۹ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ ایوب خان سے ان کی انتہائی وفاداری کی وجہ سے وہ بنگالیوں میں غیر مقبول ہوگئے۔ کٹر بنگالی انہیں "پنجابیوں کا ایجنٹ" کہتے تھے یونیورسٹی کے طلبہ نے ان کے ہاتھ سے اسناد لینے سے انکار کردیا تھا۔

۲۹ مئی ۱۹۶۳ء

نیشنل اسمبلی کے ایک بنگالی رکن نے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کی قیمت پر ترقی دی جارہی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں کم درآمدات اور زیادہ برآمدات کی صورت میں مشرقی پاکستان کو اس کے گاڑھے پسینے کے ایک سو کروڑ روپیہ سے محروم کیا گیا اور جناب والا! اس کو صرف کرکے مغربی پاکستان کو ترقی دی گئی اور اس کی زرعی اراضی میں کئی لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ بڑے لوگ بڑی اونچی باتیں کرتے ہیں کہ۔ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر رہنے دو۔ ہم اپنا گزارہ خود کرسکتے ہیں۔ اب سولہواں سال جارہا ہے، مغربی پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں دیوالیہ کردیا گیا ہے.... ہم سے کہا جاتا ہے۔ چھوکرو نکل جاؤ ہمارے پاس تمہارے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

۲ جنوری ۱۹۶۴ء

صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ قائد اعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا مقابلہ کیا۔ حزبِ مخالف کی تمام جماعتوں نے ان کی حمایت کی بنگالیوں نے بھی ان کی حمایت میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ان کے خیال میں ایک ڈکٹیٹر کو ہٹا کر سیاسی حقوق بحال کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اگرچہ اس "الیکشن" میں ایوب خان نے "بنیادی جمہوریتوں" کے اسّی ہزار ارکان کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرلیے مگر ڈھاکہ میں جو مشرقی پاکستان کی سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا وہ مس جناح سے ہار گئے۔

۶، ستمبر ۱۹۶۵ء

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک مرتبہ پھر مسئلہ کشمیر پر جنگ چھڑ گئی۔ یہ معاملہ جہاں مغربی پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا وہاں مشرقی پاکستان میں اس کو عموماً دُور دراز کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ بھارتی فضائیہ کے جیٹ طیارے جب کبھی ڈھاکہ پر منڈلانے آجاتے تو بنگالیوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا، کیونکہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے معقول تعداد میں فوج، ایر فورس اور نیوی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہی ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔

۱۱، جنوری ۱۹۶۶ء

ایوّب خان نے "اعلانِ تاشقند" پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے میں دونوں ملکوں کی افواج کی مقبوضہ علاقوں سے واپسی بھی شامل تھی۔ مغربی پاکستان کے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ جنگ میں ہماری جیت ہوئی ہے، اس پر سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے اس معاہدے کو قومی وقار کی سودا بازی پر محمول کیا۔ اس سے ایوّب خان کی ساکھ کو شدید دھچکا لگا۔

۶، فروری ۱۹۶۶ء

شیخ مجیب الرّحمٰن نے لاہور میں اپنے مشہور چھ نکات کا اعلان کیا۔ چھ نکات میں بنیادی طور پر ایک ایسے سیاسی بندوبست کی وکالت کی گئی تھی جس میں مرکزی حکومت محصولات کے اختیارات کے بغیر امورِ خارجہ اور امورِ دفاع کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ مجیب نے اپنے پروگرام کو "صوبائی خودمختاری" کے حوالے سے پیش کیا، جبکہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اسے علیحدگی کی تحریک سمجھا۔

۲۶، اپریل ۱۹۶۷ء

فیلڈ مارشل ایوّب خان کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹّو نے استعفٰی دے دیا۔ اگلے دسمبر میں انہوں نے "پاکستان پیپلز پارٹی" کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی قائم کرلی۔

۲۰، جنوری ۱۹۶۸ء

"اگرتلہ سازش" کا انکشاف کیا گیا۔ اس سازش میں شیخ مجیب الرّحمٰن کے علاوہ ۲۲ دوسرے بنگالیوں کو بھی اس الزام میں ماخوذ کیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ملی بھگت سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ایک "آزاد بنگال" کے قیام کی کوشش کر رہے تھے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں جب ڈھاکہ میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو بنگالیوں کا ردِّ عمل قطعاً مختلف تھا۔ مدعی، مجیب کو غدار کے رنگ میں پیش کر رہے تھے، مگر بنگال اسے ہیرو کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اس مقدمے کے طفیل مجیب کی مقبولیت کو (صوبے میں) چار چاند لگ گئے۔ ایسی مقبولیت وہ شاید ہی کسی اور ذریعے سے حاصل کر سکتے۔

۱۰تاہم ۲، اکتوبر ۱۹۶۸ء

ایوّب خان شدید علیل ہو گئے۔ سیاسی طور پر وہ "معاہدۂ تاشقند" سے کمزور ہو چکے تھے، اب علالت نے ان کو جسمانی طور پر بھی کھوکھلا کر دیا۔ جانشینی کے عوامل بھی (سیاسی اور فوجی دونوں حلقوں میں) فعّال ہونے لگے۔

۲۷، اکتوبر ۱۹۶۸ء

۱۹۵۸ء کے انقلاب کی دسویں سالگرہ کی تقریبات جو سال بھر سے منائی جا رہی تھیں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔ جس بھدّے انداز سے حکومت کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور جس عامیانہ طریقے سے اقتصادی ترقّی کی تشہیر کی گئی، اس سے لوگوں میں اپنی اقتصادی مشکلات کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ایوّب خان کے خلاف سویا ہوا جذبہ جاگ پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق یہ تاثر عام تھا کہ ان کے اہلِ خاندان نے ان کے دورِ اقتدار میں ناجائز ذرائع سے بے شمار دولت جمع کر لی تھی۔

۷ر نومبر ۱۹۶۸ء

راولپنڈی میں ایک طالب علم پولیس کی گولی سے ہلاک ہوگیا۔ اس سانحے نے فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف مظاہروں کے سلسلے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ طلبہ کو اپنے مطالبات کی کاربراری کے لیے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں ایک قائد مل گیا جو تحریک کو بالآخر اس نکتے تک لے گیا کہ ایوب خان کے لیے اقتدار بحال رکھنا مشکل ہوگیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ایوب خان کے خلاف محاذ آرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ آمر کے زوال سے ان کی سیاسی منزل کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔

۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء

"اگرتلہ سازش کیس" کے ایک ملزم سارجنٹ ظہور الحق کو جب وہ ڈھاکہ چھاؤنی میں فوج کے زیر حراست تھا گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بنگالیوں نے اس واقعہ کو اپنے ایک "ہیرو" کے عمداً قتل کا رنگ دیا اور حکومت نے اسے بھاگنے کی ناکام کوشش کا نتیجہ ٹھہرایا۔ اس واقعے سے نہ صرف ایوب خان بلکہ مغربی پاکستان کے خلاف بھی غم و غصے کا طوفان اُمڈ آیا۔

۱۰ تا ۱۵ر مارچ ۱۹۶۹ء

فیلڈ مارشل ایوب خان نے لیڈروں سے مذاکرات کے لیے راولپنڈی میں ایک "گول میز کانفرنس" بلائی۔ مقصود یہ تھا کہ مخالف جماعتوں کے بڑے بڑے مطالبات مان لینے سے گلی کوچوں میں بپھرے ہوئے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مغربی پاکستان کے بعض رہنماؤں نے اس بات پر اصرار کیا کہ مجیب کو رہا کیا جائے تاکہ وہ جیل سے نکل کر ان مذاکرات میں شریک ہوسکے۔ اس سیاسی دباؤ کے پیش نظر "اگرتلہ سازش" کا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ مجیب نے ۱۰ مارچ کو ڈھاکہ میں لوگوں کے ایک عظیم ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دونوں صوبوں میں مساوات (PARITY) کا اصول اب مشرقی پاکستان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ اب مشرقی پاکستان کو آبادی (۵۶ فیصد) کے لحاظ سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ مجیب الرحمان ڈھاکہ میں یہ اعلان کر کے راولپنڈی آئے اور کانفرنس میں شریک ہوئے، مگر یہ تجربہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔

۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء

فیلڈ مارشل ایوب خان نے حکومت کی باگ ڈور فوج کے سربراہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔ یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر گلی کوچوں کا ہیجان ختم ہوگیا۔ سکون لوٹ آیا۔

۲۶ر مارچ ۱۹۶۹ء

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے قوم کے نام اپنے پہلے نشری خطاب میں جمہوریت بحال کرنے اور اقتدار لوگوں کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۸ر نومبر ۱۹۶۹ء

جنرل یحییٰ خان نے "ایک آدمی ایک ووٹ" کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ یہ اقدام مجیب کے حق میں تھا مگر اس پر مغربی پاکستان کے لوگ ناخوش تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اس صورت میں بنگالیوں کو غلبہ حاصل ہوجائے گا۔ جنرل یحییٰ خان نے "ون یونٹ" کو بھی توڑ کر پرانے چاروں صوبوں کو بحال کر دیا۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء

پہلے عام انتخابات کی تیاری کے لیے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ انتخابات سال کے آخری حصے میں منعقد ہونا تھے۔

چھ نکات

چھ نکاتی فارمولے کا متن اور ترمیمات بمطابق منشور "عوامی لیگ"

پہلا نکتہ

اصل

دستور میں قرارداد لاہور کی بنیاد پر پارلیمانی طرز حکومت کے مطابق پاکستان کا ایک ایسا وفاق قائم کیا جائے جس میں بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست منتخب شدہ مجلس قانون ساز کو بالادستی حاصل ہو۔

ترمیم شدہ

طرز حکومت وفاقی اور پارلیمانی ہوگا۔ وفاق کی مجلس قانون ساز اور وفاق میں شامل "یونٹوں" کی مجلس قانون ساز کو عام بالغ حق رائے دہی کے اصول پر براہ راست منتخب کیا جائے گا۔ وفاقی مجلس قانون ساز میں نمائندگی کا تناسب زبان کی بنیاد پر ہوگا۔

دُوسرا نکتہ

اصل

وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کا انتظام کرے گی، باقی تمام شعبے وفاق میں شامل ریاستوں کے تحت ہوں گے۔

ترمیم شدہ

وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کی ذمّہ دار ہوگی۔ اس کے علاوہ درج ذیل (نکتہ سوئم) کی شرائط کے ساتھ کرنسی بھی اس کے سپرد ہوگی۔

تیسرا نکتہ

اصل

(۱) دونوں بازوؤں میں کرنسی کا الگ الگ نظام رائج کیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں بازوؤں میں اس کے آزادانہ تبادلے کا اہتمام ہوگا۔

یا

(۲) پورے ملک کے لیے کرنسی کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے مگر اس صورت میں ایسے آئینی تحفظات کا بندوبست کیا جائے جن کے تحت مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کو روکا جا سکے۔ ہر صوبہ علیحدہ علیحدہ بینک سرمایہ محفوظ رکھ سکے اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ بجٹ اور الگ مالیاتی نظام اختیار کیا جائے۔

ترمیم شدہ

دو علیحدہ علیحدہ "کرنسیاں" رائج کی جائیں گی جن کا ہر بازو اور ہر "ریجن" میں آزادانہ تبادلہ ممکن ہوگا یا متبادل صورت میں "کرنسی" کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے لیکن اس کے لیے پھر "وفاقی محفوظات" کا ایک ایسا دستور العمل نافذ کیا جائے جس کے تحت "علاقائی فیڈرل ریزرو بینک" (REGIONAL FEDERAL RESERVE BANKS) قائم کیے جاسکیں جو ایک "ریجن" سے دوسرے "ریجن" میں وسائل اور سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کی روک تھام کے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں۔

چوتھا نکتہ

اصل

محصولات کے نفاذ اور وصول کا اختیار "وفاقی یونٹوں" کے پاس ہوگا اور "وفاقی مرکز" کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ اخراجات کے لیے "وفاق" کو ریاست کے محصولات کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ "وفاق کے مجموعی فنڈ" کی رقم ریاست کے مختلف محصولات میں سے ایک خاص شرح کے مطابق وضع کرکے مہیا کی جائے گی۔

ترمیم شدہ

مالیاتی حکمت عملی وفاقی یونٹوں کے تحت ہوگی۔ "وفاق" کو دفاع اور امور خارجہ کے اخراجات کے لیے حصول سرمایہ کے ضروری وسائل مہیا کیے جائیں گے۔ "وفاقی حکومت" ان وسائل کے تصرف و استعمال کے طریقہ کار اور تناسب وغیرہ کے ضمن میں ان ضوابط کو ملحوظ رکھے گی جن کی صراحت آئین میں کر دی جائے گی۔

پانچواں نکتہ

اصل

(۱) دونوں بازوؤں کے لیے زرمبادلہ کا حساب رکھنے کے لیے علیحدہ علیحدہ کھاتے رکھے جائیں گے۔

(۲) مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی۔

(۳) وفاق کی زرمبادلہ کی ضروریات "دونوں بازو" پوری کریں گے۔ مساوی طور پر یا کسی طے شدہ تناسب کے مطابق۔

(۴) مقامی مصنوعات کو ایک بازو سے دوسرے بازو میں لانے پر کوئی محصول نہیں لگایا جائے گا۔

(۵) آئین کی رو سے یونٹوں کی حکومتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ وہ بیرونی ممالک سے اپنے تجارتی روابط اور ان میں اپنے تجارتی مشن قائم کرسکیں اور ان سے معاہدے کرسکیں۔

ترمیم شدہ

آئین میں ہر "وفاقی یونٹ" کو اپنے زرمبادلہ کی آمدنی کا علیحدہ حساب کتاب رکھنے اور اس کو اپنے تصرف میں رکھنے کا اختیار دیا جائے گا۔ وفاق کے زرمبادلہ کی ضروریات "وفاقی یونٹوں" کی حکومتیں اس تناسب اور اس طریق کار کے مطابق مہیا کریں گی جس کی صراحت آئین میں موجود ہوگی۔ علاقائی حکومتوں کو تجارت اور امداد کے لیے بیرونی ممالک سے مذاکرات کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس میں ان کو بہرحال ملک کی خارجہ پالیسی کے دائرے میں رہنا ہوگا جس کا تعین کرنا وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

چھٹا نکتہ

اصل

مشرقی پاکستان کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم کا قیام (ملیشیا)

ترمیم شدہ

وفاقی یونٹوں کی حکومتوں کو قومی سلامتی میں موثر کردار ادا کرنے کی غرض سے "ملیشیا" یا نیم عسکری طرز کی تنظیمات قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔

آپریشن سرچ لائٹ

منصوبہ بندی کی اساس

(۱) عوامی لیگ کی سرگرمیوں اور ردِّ عمل کو بغاوت سمجھا جائے اور ان کے مددگار عناصر کو نیز اُن لوگوں کو جو مارشل لاء کی خلاف ورزی کریں "مخالف عناصر" تصوّر کیا جائے۔

(۲) فوج میں مشرقی پاکستان کے عناصر کے اندر عوامی لیگ کی وسیع حمایت پائی جاتی ہے لہٰذا کارروائی انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اچانک اور خفیہ طریقے سے کی جائے اور دہشت انگیزی کے عناصر کو ملحوظ رکھا جائے۔

کامیابی کی بنیادی شرائط

(۳) تمام صوبے میں بیک وقت کارروائی کی جائے۔

(۴) سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں نیز اساتذہ اور ثقافتی تنظیموں کے انتہاپسند عناصر کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرفتار کیا جائے۔ ابتدائی مرحلے میں چوٹی کے سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں کو لازماً پکڑ لیا جائے۔

(۵) ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کی مکمل کامیابی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کو اپنے قابو میں لے کر اس کی پوری پوری تلاشی لینا ہوگی۔

(۶) چھاؤنیوں کی حفاظت کا پُورا پُورا بندوبست کیا جائے۔ جو لوگ چھاؤنیوں پر حملہ کرنے کی جرات کریں اُن پر گولیوں کی شدید بارش کی جائے۔

(۷) تمام اندرونی اور بین الاقوامی ذرائع مواصلات کاٹ دیے جائیں۔ بیرونی قونصل خانوں کے ٹیلیفون ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر سروسیں اور ٹرانسمیٹر وغیرہ کے رابطے منقطع کر دیے جائیں۔

(۸) بارود کے ذخیروں اور اسلحہ گھروں پر مغربی پاکستان کے فوجیوں کا پہرہ لگا کر مشرقی پاکستان کی نفری کو غیر موثر بنا دیا جائے۔ "پاکستان ایر فورس" اور "ایسٹ پاکستان رائفلز" کے بارے میں بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔

مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۷۷ء

ناگہانیت اور فریب

(۹) **بالائی سطح پر**

صدر سے درخواست کی جائے کہ وہ مذاکرات کو جاری رکھیں اور بے شک مجیب کو دھوکا دینے کے لیے ہی یہ تاثر دیں کہ مسٹر بھٹو مانیں یا نہ مانیں وہ ۲۵ مارچ کو عوامی لیگ کے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔

(۱۰) **تدبیراتی سطح**

(الف) اخفا کی اہمیت کے پیشِ نظر ابتدائی مرحلے میں اس منصوبے کے ضمن میں مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کے لیے فوج کی وہی نفری استعمال کی جائے جو پہلے سے شہر میں موجود ہے۔

(i) مجیب کے گھر میں داخل ہو کر گھر میں موجود سب افراد کو گرفتار کیا جائے۔ یاد رہے مکان پر کڑا پہرہ رہتا ہے اور سخت دفاعی انتظامات کیے گئے ہیں۔

(ii) یونیورسٹی کے اہم ہوسٹلوں کا محاصرہ — مثلاً اقبال ہال (ڈھاکہ یونیورسٹی) اور لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)۔

(iii) ٹیلی فون ایکسچینج بند۔

(iv) جن گھروں میں اسلحہ وغیرہ کے ذخیروں کی اطلاعات ملی ہیں ان کے بیرونی رابطے منقطع۔

(ب) چھاؤنی میں فوج کی نقل و حرکت ٹیلیفون رابطے ختم ہونے کے بعد شروع کی جائے گی، پہلے نہیں۔

(پ) رات کے دس بجے کے بعد کسی شخص کو چھاؤنی کے باہر نہ جانے دیا جائے۔

(ث) کسی نہ کسی بہانے شہر کے مندرجہ ذیل مقامات کے نواح میں فوج کی نفری میں اضافہ کیا جائے:

ایوانِ صدر، گورنر ہاؤس، ایم این اے ہوسٹل، ریڈیو اسٹیشن، ٹیلیویژن اسٹیشن اور ٹیلیفون ایکسچینج۔

(ج) مجیب کے گھر پر کارروائی کرنے کے سلسلے میں سویلین گاڑیاں استعمال کی جائیں۔

ترتیب اقدامات

آغازِ کار: ایک بجے شب۔

(الف) فوجی نقل و حرکت کے اوقات:

(۱) کمانڈو کی ایک پلاٹون — مجیب کے گھر — ایک بجے شب۔

(۲) ٹیلیفون کے "مرکزِ مواصلات" کا انقطاع — رات بارہ بج کر ۵۵ منٹ پر۔

(۳) یونیورسٹی کا محاصرہ کرنے والی نفری — رات ایک بج کر ۵ منٹ پر۔

(۴) پولیس تھانہ راجر باغ کے ہیڈکوارٹر اور دوسرے تھانوں کی طرف روانگی — رات کے تقریباً ایک بج کر ۵ منٹ پر۔

(۵) رات کے ایک بج کر ۵ منٹ پر مندرجہ ذیل مقامات کا محاصرہ کر لیا جائے گا:

مسماۃ انوارا بیگم کا گھر۔ مکان نمبر ۱۴۰، سڑک نمبر ۲۹

(۶) کرفیو کا نفاذ ـــ رات کے ایک بجکر ۵ منٹ سے "سائرن" اور "لاؤڈ اسپیکر" کے ذریعے ۔ ابتدائی میعاد ۴۸ گھنٹے ۔ ابتدائی مرحلے میں "راہ داری" کے لیے پروانے (پاس) جاری نہیں کیے جائیں گے ۔ البتہ زچگی اور عارضۂ قلب کے سنگین حملے کے واقعات پر مناسب غور کیا جائے گا۔ متعلقین کی درخواست پر مریضوں کی نقل و حرکت کا انتظام فوج کرے گی۔ یہ اعلان بھی کر دیا جائے کہ تا حکم ثانی کوئی اخبار شائع نہیں ہوگا۔

(۷) جن فوجی دستوں کو مخصوص مشن تفویض کیے گئے ہیں وہ ایک بجکر ۵ منٹ پر اپنے اپنے سیکٹر کی طرف نکل پڑیں گے۔ (نفری کو چوکس کرنے کا لائحہ عمل بنا لیا جائے) ہوسٹلوں پر قبضہ کر کے ان کی تلاشی لی جائے۔

(۸) یونیورسٹی کے علاقہ کی طرف روانگی ـــ صبح کے پانچ بجے۔

(۹) زمینی اور آبی رکاوٹیں رات کے دو بجے قائم کر دی جائیں گی۔

(پ) __دن کے وقت اقدامات__

(۱) دھان منڈی کے علاقہ کے مشتبہ مکانات کی خانہ بہ خانہ تلاشی پرانے شہر کے اندر ہندوؤں کے گھروں کی بھی تلاشی (ضروری معلومات انٹیلی جنس کا شعبہ جمع کرے گا)

(۲) تمام چھاپے خانے بند کر دیے جائیں گے۔ یونیورسٹی کالجوں ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے محکموں فزیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ اور ٹیکنیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ ـــ ان تمام مقامات کی سائیکلو سٹائل مشینیں ضبط کر لی جائیں گی۔

(۳) کرفیو کی بندش سخت کر دی جائے گی۔

(۴) دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

(۱۲) فرائض اور وسائل

تفصیلات بریگیڈیر کمانڈر طے کرے گا (جن کا ذکر آگے آئے گا) لیکن مندرجہ ذیل اقدامات لازماً کیے جائیں گے :

(الف) (مشرقی) بنگالی یونٹوں (جن میں سگنل اور دوسرے انتظامی یونٹ بھی شامل ہوں گے) کے اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ اسلحہ صرف مغربی پاکستان کی نفری کو دیا جائے گا۔

وضاحت

ہم مشرقی پاکستان کے سپاہیوں کو کوئی ایسا فرض نہیں سونپنا چاہتے تھے جس پر عمل کرنا اُن کو ناگوار گزرتا۔

(ب) پولیس کے تھانوں سے اسلحہ لے لیا جائے گا۔

(پ) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ڈائریکٹر جنرل اسلحہ خانوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔

(ت) "انصار" کی رائفلیں جمع کر لی جائیں گی۔

(۱۳) مطلوبہ معلومات

(الف) مندرجہ ذیل افراد کا اتہ پتہ :

شیخ مجیب، نذرالاسلام، تاج الدین، عثمانی، سراج الاسلام، منان، عطاء الرحمٰن، پروفیسر مظفر، علی احمد، بیگم موتیا چوہدری، بیرسٹر ولد
فیض الحق، طفیل، این اے صدیقی، رؤف، مکھن (اور دوسرے طالب علم لیڈر)

(ب) تمام تھانوں اور "رائفلز" کا محلِ وقوع۔

(پ) شہر کے ایسے تمام مقامات کا محلِ وقوع جہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا ہو یا جن کو عسکری لحاظ سے مستحکم کیا گیا ہو۔

(ج) تربیتی کیمپوں اور تربیتی علاقوں کا محلِ وقوع۔

(چ) ان ثقافتی مراکز کا محلِ وقوع جن کو فوجی تربیت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

(ح) ان سابق فوجی افسروں کے نام جو باغیانہ سرگرمیوں کی اعانت کر رہے ہوں۔

(۱۴) **قیادت اور نظامت**

(الف) علاقہ ڈھاکہ

کمانڈر : میجر جنرل فرمان
سٹاف : ایسٹرن کمانڈر کا سٹاف یا مارشل لاء ہیڈکوارٹر کا سٹاف۔
جمعیت : ڈھاکہ میں موجود نفری

(ب) بقیہ صوبہ

کمانڈر : میجر جنرل خادم حسین راجہ
سٹاف : ہیڈکوارٹر ۱۴ ڈویژن
جمعیت : ڈھاکہ کے سوا باقی نفری

(۱۵) **چھاؤنی کا تحفّظ**

پہلا مرحلہ۔ تمام اسلحہ (پاکستان ائیر فورس سمیت) جمع کر لیا جائے۔

(۱۶) **مواصلات**

(الف) حفاظت (ب) ترتیب و تنظیم

تقسیمِ وسائل و تقسیمِ کار

میجر جنرل فرمان مارشل لاء ہیڈکوارٹر زون "بی" کے کمانڈ کنٹرول میں ہوں گے۔

"ٹروپس":

۵۷ بریگیڈ (ڈھاکہ میں متعین نفری)، ۱۸ پنجاب، ۳۲ پنجاب، جنرل سٹاف آفیسر گریڈ I (انٹیلی جنس)، لیفٹیننٹ کرنل تاج کو

کمانڈنگ افسر بنایا جائے۔) ۲۲ بلوچ ۔۱۳ فرنٹیئر فورس۔ ۳۱ فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ)۔ ۱۳ لائٹ ایک ایک رجمنٹ (توپ خانے کا طیارہ مار عنصر)۔ نمبر ۳ کمانڈوز کی ایک کمپنی (کومیلا سے)

فرائض

(۱) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہیڈ کوارٹر، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری اور دسویں بٹالین (۲۵۰۰) اور راجر باغ میں پولیس ریزرو (۲۰۰۰) سے ہتھیار لے کر ان کو غیر موثر بنانا۔

(۲) ٹیلیفون ایکسچینج اور ٹرانسمیٹر، ریڈیو ٹیلیویژن، سٹیٹ بنک کا تحفظ۔

(۳) عوامی لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری — مفصل فہرست اور پتے۔

(۴) یونیورسٹی کے ہاسٹل — اقبال ہال، جگن ناتھ ہال، لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)

(۵) شہر کی ناکہ بندی۔ سڑک، ریل اور دریا۔ دریاؤں میں گشت۔

(۶) آرڈی ننس فیکٹری غازی پور اور ایمونیشن ڈپو راجندرہ پور کی حفاظت۔

صوبائی دار الحکومت (ڈھاکہ) کے علاوہ باقی سارا علاقہ میجر جنرل کے ایچ راجہ اور ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۴ ڈویژن کے تحت ہوگا

جیسور

نفری:

ہیڈ کوارٹر ۱۰۷ بریگیڈ یعنی ۲۵ بلوچ ۔ ۲۷ بلوچ ۔ ۲۴ فیلڈ رجمنٹ کے اجزاء اور ۵۵ فیلڈ رجمنٹ۔

فرائض

(۱) ایسٹ بنگال اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے "سیکٹر ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو پولیس" اور "انصار" کو غیر مسلح کرنا۔

(۲) جیسور شہر کا تحفظ۔ عوامی لیگ کے لیڈروں اور طالب علم رہنماؤں کی گرفتاری۔

(۳) ٹیلیفون ایکسچینج اور اس کے نظم کا تحفظ۔

(۴) چھاؤنی کے گرد اگرد حفاظتی حاشیہ۔ جیسور قصبہ اور جیسور کھلنا روڈ۔ جیسور کا ہوائی اڈہ۔

(۵) کشتیہ کے ٹیلیفون ایکسچینج کو ناکارہ کرنا۔

(۶) اگر ضرورت ہو تو کھلنا کو کمک دینا۔

کھلنا

نفری

۲۲ فرنٹیئر فورس

فرائض

(۱) قصبے کی حفاظت۔

(۲) ٹیلیفون ایکسچینج اور ریڈیو اسٹیشن کی حفاظت۔

(۳) "ایسٹ پاکستان رائفلز کے "ونگ ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو کمپنیوں" اور "ریزرو پولیس" کو غیر مسلح کرنا۔

(۴) عوامی لیگ کے طالب علم لیڈروں اور اشتراکی لیڈروں کی گرفتاری۔

رنگ پور۔ سید پور

نفری

ہیڈکوارٹر ۲۳ بریگیڈ ۔ ۲۹ کیولری (رسالہ)۔ ۲۶ فرنٹیر فورس۔ ۲۳ فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ)

فرائض

۱۔ رنگ پور اور سید پور کی حفاظت۔
۲۔ سید پور میں ۳ ایسٹ بنگال کو غیر مسلح کرنا۔
۳۔ اگر ممکن ہو تو دیناج پور میں سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ریزرو کمپنی کو غیر مسلح کرنا۔ بصورت دیگر سرحدی چوکیوں کو مستحکم بنا کر "ریزرو کمپنی" کو غیر موثر کرنا۔
۴۔ رنگ پور کا ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلیفون ایکسچینج کی حفاظت۔
۵۔ رنگ پور میں عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
۶۔ بوگرہ ایمونیشن کے ذخیرے کی حفاظت۔

راج شاہی

نفری

۲۵ پنجاب

فرائض

(۱) کمانڈنگ آفیسر شفقت بلوچ کو روانہ کردو۔
(۲) راجشاہی میں ٹیلیفون ایکسچینج اور ریڈیو اسٹیشن کی حفاظت۔
(۳) "ریزرو پولیس" اور "ایسٹ پاکستان رائفلز" کے سیکٹر ہیڈکوارٹر کو غیر مسلح کرنا۔
(۴) راج شاہی یونیورسٹی اور بالخصوص میڈیکل کالج کا خیال رکھنا۔
(۵) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔

کومیلا

نفری

۵۳ فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ) ڈیڑھ مارٹر بیٹری (توپ خانہ) کومیلا میں موجود نفری ۔ تیسری کمانڈو بٹالین (ایک کمپنی کم)

فرائض

(۱) ایسٹ پاکستان رائفلز کے "ونگ ہیڈکوارٹر" ۴ ایسٹ بنگال اور ضلعے کی ریزرو پولیس کو غیر مسلح کرنا۔
(۲) شہر کی حفاظت اور رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
(۳) ٹیلیفون کا مواصلاتی مرکز محفوظ رکھنا۔

سلہٹ

نفری

۳۱ پنجاب (ایک کمپنی کم)

فرائض

(۱) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی فون ایکسچینج کی حفاظت ۔

(۲) دریائے سُرما پر "کینو پل" کی نگرانی ۔

(۳) فضائی مستقر ۔

(۴) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری ۔ سکندر سے رابطہ پیدا کرنا ۔

چٹاگانگ

نفری

۲۰ بلوچ (ہراول دستے کے سوا) اور ۳۱ پنجاب کی ایک کمپنی (سلہٹ سے) بریگیڈیئر اقبال شفیع ۔ کومیلا سے بذریعہ سڑک ایک دستہ لے کر رات ایک بجے تک چٹاگانگ پہنچ جائیں ۔

متحرک دستہ

بریگیڈیئر اقبال شفیع ۔ ٹیک ہیڈکوارٹر اور مواصلاتی اجزا کے ساتھ ۔ نمبر ۲۴ فرنٹیئر فورس ۔ ۱۲۰ ملی میٹر مارٹر کا ایک ٹروپ ۔ (چار توپیں) انجینئروں کی ایک فیلڈ کمپنی ۔ ہراول کمپنی ۔ فوجی کارروائی کے مقررہ وقت پر "فینی" میں ۔

فرائض

(۱) ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر ۔ نمبر ۸ ایسٹ بنگال ۔ ایسٹ پاکستان رائفلز سیکٹر ہیڈکوارٹر اور "ریزرو پولیس" کو غیر مسلح کرنا ۔

(۲) پولیس کے مرکزی اسلحہ خانے پر قبضہ (بیس ہزار)

(۳) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلیفون ایکسچینج کی حفاظت ۔

(۴) پاکستانیوں سے رابطہ (کموڈور ممتاز)

(۵) شگری اور جنجوعہ (کمانڈنگ آفیسر ۸ ایسٹ بنگال) سے رابطہ ۔ اقبال شفیع کے پہنچنے تک وہ آپ سے احکام لیں گے ۔

(۶) لیکن اگر شگری اور جنجوعہ کو اپنی نفری پر اعتماد ہو تو بنگالی عناصر سے بیشک ہتھیار نہ لیں ۔ اس صورت میں شہر اور چھاؤنی کی سڑک پر دفاعی پوزیشن میں ایک کمپنی رکھ کر رکاوٹ ڈالنا کافی ہوگا ۔ تاکہ اگر بعد میں "ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر" اور ۸ ایسٹ بنگال کی وفاداری میں خلل آئے تو ان کا سدِ باب کیا جا سکے ۔

(۷) بریگیڈیئر مجمدار کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں ۔ ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر کے چیف انسٹرکٹر چودھری کو کارروائی کی رات کو ہی گرفتار کر لیا جائے ۔

(۸) مذکورہ بالا کارروائی مکمل کرنے کے بعد عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے ۔

دستاویز سقوط

پاکستان ایسٹرن کمان نے مشرقی محاذ پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا منظور کر لیا ہے۔ اس سپراندازی کا اطلاق بنگلہ دیش میں موجود پاکستان کی تمام مسلح افواج پر ہوگا جن میں پاکستان کی بری، فضائی اور بحری افواج، نیم عسکری تنظیمات اور سول آرمڈ فورسز شامل ہیں۔ افواج کی جو نفری جس مقام پر موجود ہے اسی مقام پر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کی زیر کمان باقاعدہ انڈین آرمی کے قریب ترین دستوں کے سامنے ہتھیار ڈالے گی۔

اس دستاویز پر دستخط ثبت ہونے کے فوراً بعد پاکستان کی ایسٹرن کمان لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے احکام کے تحت آ جائے گی۔ "دستاویز سقوط" کی دفعات کے معانی یا توجیہات میں کوئی شبہ پیدا ہونے کی صورت میں لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ یہ ضمانت دیتے ہیں کہ جو سپاہی ہتھیار ڈالیں گے ان سے عزت و احترام کا وہی سلوک کیا جائے گا جس کے وہ جنیوا کنونشن کی دفعات کی رو سے مستحق ہیں، نیز پاکستان کی جو فوجی اور نیم فوجی نفری ہتھیار ڈالے گی ان کی سلامتی اور بہبود کی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کی ماتحت فوج غیر ملکی باشندوں، نسلی اقلیتوں اور مغربی پاکستان کے باشندوں کی حفاظت کریں گی۔

(دستخط)
امیر عبداللہ خان نیازی
لیفٹیننٹ جنرل
مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون بی
اور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ (پاکستان)
۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء

(دستخط)
جگجیت سنگھ اروڑہ
لیفٹیننٹ جنرل
جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف افواج ہندوستان
و بنگلہ دیش مشرقی محاذ میں
۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء